

قتلِ مُرْتَد

مصنّفه

حضرت مولوی شیرعلی صاحب

قتل مرتد اور اسلام

تصنیف ————— حضرت مولانا شیرعلی صاحب

طبع اول ————— دسمبر 1925ء

شائع کردہ ————— تالیف و اشاعت قادیان

طبع دوم ————— نومبر 2010ء

لا تَكْفُرْ بِاللَّذِينَ
لَا تَكْفُرْ بِاللَّذِينَ

قتلِ مُرَدِّ

اور

اِسْلَامِ

مُصَنَّفَه

حضرت لوی شیر علی صاحبی - اے ناظر تالیف و تصنیف

سلسلہ قادیان

مجلد ۱۱

کتاب تالیف و اشاعت قادیان

وزیر ہند پریش اسٹیشن ماہنامہ بھائی بہادر سنگھ مینچر و پرنٹر صاحب

۱۹۲۵ء میں شائع کیا

پبلیشر احمد محمد مخدوم

عرض حال

اس کتاب کے متعلق اس قدر بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی امام جماعت احمدیہ کی ہدایت اور نگرانی کے ماتحت تیار کی گئی ہے۔

دوسرا امر قابل ذکر یہ ہے کہ اس کتاب میں جس قدر منقولی بحث ہے اس کا اکثر حصہ ان نوٹوں سے لیا گیا ہے جو حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی، مولوی جلال الدین صاحب نمس اور مولوی غلام احمد صاحب بدولوی نے تیار کئے۔ اول الذکر نے مضمون کے اس حصہ کے متعلق نوٹ مرتب کئے جن کا تعلق قرآن شریف سے ہے مگر ساتھ ہی حدیث اور فقہ کے متعلق بھی بعض بہت مفید نوٹ تیار کئے اور مؤخر الذکر نے زیادہ حدیث اور تاریخ کی رو سے اس مضمون کی تحقیق کی۔ دوران مضمون میں جہاں جہاں مجھے مزید تحقیق کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں میں نے مولوی فضل الدین صاحب وکیل سے جو سلسلہ کے ایک محقق عالم ہیں بہت امداد حاصل کی ہے۔ اس مضمون کا ایک حصہ معقولی بحث پر بھی مشتمل ہے وہ سب کا سب اور نیز منقولی بحث کے بعض ایسے حصے جو اصولی رنگ رکھتے ہیں حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم۔ اے کے افاضات کا نتیجہ ہیں کیونکہ ان حصوں کے متعلق میں نے انہی سے اشارات حاصل کئے ہیں۔ پس حق یہ ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جس قدر تحقیق اور جو جو خیالات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں وہ دیگر علماء و بزرگان سلسلہ کی محنت اور دماغ کا نتیجہ ہیں۔ میرا

کام صرف یہ ہے کہ میں نے اس تحقیق اور ان خیالات کو اپنے الفاظ میں ترتیب دے کر ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو مقبول فرماوے اور اس میں برکت ڈالے اور اس کے ذریعہ قتل مرتد کے غلط عقیدہ کا جو اسلام کی طرف منسوب کیا گیا پورے طور پر قلع قمع ہو اور دنیا پر حق منکشف ہو جائے۔

رَبَّنَا ارْنَا الْحَقَّ حَقًّا وَاِرْنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا۔ آمین

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهِ وَخَلْفَائِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اَنْتَ حَمِيْدٌ مُّجِيْدٌ.

خاکسار

شیر علی عفی اللہ عنہ

قادیان دارالامان والایمان

22 دسمبر 1925ء



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

هو ان خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ اصر

کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرٌ مِنْ رَبِّكُمْ ۚ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۚ
وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِخَفِيظٍ ﴿١٠٥﴾ (الانعام: 105)

یقیناً تمہارے رب کی طرف سے دلائل آچکے ہیں۔ پس جس نے انہیں جان لیا اُس کے اپنے فائدہ کے لئے ہوگا اور جس نے کج راہی اختیار کی اس کا یہ فعل اسی پر پڑے گا اور میں تمہارا محافظ نہیں ہوں۔

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں جس نے دنیا پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ قرآن مجید جیسی کامل کتاب بھیجی ہے جسے دوسری الہامی کتابوں پر ہزار ہا دیگر فضیلتوں کے علاوہ ایک فضیلت یہ حاصل ہے کہ اس میں دین کو کامل کر دیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ
نِعْمَتِي ۗ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (المائدة: 4)

آج میں نے تمہارے فائدہ کے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنے احسان کو پورا کر دیا ہے اور تمہارے لئے دین کے طور پر اسلام کو پسند کیا ہے۔

اس کے بعد میں اس نبی اُمی فداہ ابی و اُمی ﷺ کے حضور صلوة و سلام کا تحفہ پیش کرتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے رحمۃً للعلمین کر کے بھیجا اور جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَبَارِحَمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ قَفًّا
غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نَفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (ال عمران: 160)

اور تو اس عظیم الشان رحمت کی وجہ سے ہی جو اللہ کی طرف سے تجھے دی گئی ہے ان کے لئے نرم واقع ہوا ہے اور اگر تو بد اخلاق اور سخت دل ہوتا تو یہ لوگ تیرے گرد سے تتر بتر ہو جاتے۔

جس نے اپنے نورانی وجود میں قرآن کریم کی کامل اور پاکیزہ تعلیم کا ایک مکمل اور مبارک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جس کی سیرت کا پورا پورا نقشہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذہن رسا نے مندرجہ ذیل مختصر الفاظ میں کھینچا ہے کہ کان خلقہ
القرآن (درمنثور جلد 6 صفحہ 250)

قرآن شریف آپ کا خلق ہے۔

اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ خاتم النبیین ﷺ کے اس خلیفہ پر صلوات و سلام نازل فرمائے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے قدیم وعدوں کے مطابق چودھویں صدی کے سر پر اس لئے بھیجا کہ وہ اسلام کے چہرہ کو اس گردوغبار سے پاک کر دے جس نے فیج اعوج کے زمانہ میں اس پر جمع ہو کر اسے دنیا کی نظر میں بدنما کر دیا تھا اور اس کا چمکتا ہوا چہرہ اس کی صحیح اور اصلی شکل میں دنیا پر ظاہر کر دے۔

اتما بعد! ناظرین کرام کو علم ہے کہ گذشتہ اگست 1924ء کے آخری دن میں ریاست کابل کی سرزمین پر ایک بہت بڑا ظلم کیا گیا۔ ایک نفس زکیہ کا ناحق خون کیا گیا۔ صرف اس لئے کہ وہ اس بات پر ایمان لایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مسیح

اور مہدی کے آنے کی خوشخبری دی تھی وہ مسیح موعود اور مہدی معبود دنیا میں ظاہر ہو گیا اور خدا کے وعدے اور مقرر کردہ نشان پورے ہوئے۔ اُس ہولناک واقعہ نے پرانے زمانہ کا نقشہ ہماری نظروں میں تازہ کر دیا اور مومنین اور دشمنانِ حق کا جو تذکرہ ہم قرآن شریف میں پڑھتے تھے اس کی تصدیق کی۔ کیونکہ جب ایک طرف اس شہید مرحوم نے وہی اخلاص، وہی ایمان اور وہی ثبات دکھایا جو انبیاء کے عہد کے سچے مومن ہمیشہ دکھلاتے آئے ہیں تو دوسری طرف کابل کی گورنمنٹ نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو قدیم سے الٰہی سلسلوں کے دشمن حق کے پرستاروں کے ساتھ کرتے چلے آئے ہیں۔ اگر حضرت نعمت اللہ خاں کی مثال نے حضرت خیبؓ کی یاد کو ہمارے دلوں میں تازہ کیا تو کابل کے قاتلوں نے ان عمائد قریش کا نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا جنہوں نے بے کس اور بے بس مسلمانوں کو نہایت بے رحمی سے شہید کیا۔ لیکن ہمیں کابل میں اپنے بھائیوں کے خون بہائے جانے کا اتنا رنج نہیں جتنا اس بات کا رنج ہے کہ کابل کے قاتلوں نے اپنی اس وحشیانہ حرکت کو اسلام کی طرف منسوب کیا ہے اور ہندوستان کے مُلاؤں نے ریاست کابل کے فیصلہ کی تائید کر کے اور مولوی ظفر علی خان صاحب نے دربارِ کابل کی حمایت میں مضمون لکھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی عزت اور نیک نامی پر ایک ناپاک حملہ کیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس حملہ کا پورے طور پر جواب دیا جائے تا جو نقصان ان ”بزرگوں“ نے اسلام کو پہنچایا ہے اس کا تدارک ہو سکے اور اسلام اور نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ناپاک الزامات سے بریت ثابت کی جائے۔ سو اس غرض کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں اس مضمون پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس مضمون کے لکھنے میں اپنی خاص تائید سے مجھ کمترین کی مدد فرمائے۔

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٦﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٧﴾ وَاحْلِلْ عُقْدَةَ
مِنْ لِسَانِي ﴿٢٨﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٩﴾ (طہ : 26 تا 29)

اے میرے رب میرا سینہ کھول دے اور جو فرض مجھ پر ڈالا گیا ہے اس کو پورا کرنا میرے لئے آسان کر دے اور اگر میری زبان میں کوئی گہرہ ہو تو اُسے بھی کھول دے تاکہ لوگ میری بات آسانی سے سمجھنے لگیں۔

میری اس مضمون کے لکھنے سے یہ غرض نہیں کہ میں یہ ثابت کروں کہ علماء کا بل نے احمدیوں کو مرتد قرار دینے میں غلطی کی ہے اور یہ کہ ارتداد کے لئے جو سزا بیان کی جاتی ہے وہ احمدیوں پر چسپاں نہیں ہو سکتی کیونکہ احمدی مرتد نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے حقیقی اور سچے مسلمان احمدی ہی ہیں۔ بلکہ اس مضمون کے لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم سے دنیا پر روز روشن کی طرح یہ بات ثابت کر دوں کہ اسلام محض ارتداد کے لئے اس دنیا میں کوئی سزا بھی تجویز نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے صرف وہی سزا ہے جو آخرت میں کفار کے لئے مقرر ہے۔

پس اصل سوال یہ نہیں کہ احمدی مسلمان ہیں اس لئے ان کو مرتد قرار دے کر قتل کرنا ایک ظلم ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ مرتد کو محض ارتداد کے لئے قتل کرنا ایک ظلم ہے۔ اسلام ایسی تعلیم نہیں دیتا اور یہ اسلام پر ایک بہتان ہے۔

احمدیوں کا سوال تو بالکل آسان ہے۔ ان سے جو سلوک کیا جاتا ہے وہ اس سنت اللہ کے مطابق ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے کیونکہ قرآن شریف شہادت دیتا ہے کہ راستبازوں کی جماعت سے ان کے دشمن ہمیشہ ایسا ہی سلوک کرتے چلے آئے ہیں اور دشمنان سلسلہ احمدیہ نے احمدیوں کو سنگسار کر کے اور آئندہ کے لئے ان کی نسبت ایسی ہی دھمکیوں کا اعلان کر کے بے شک اس امر کا ثبوت دے دیا ہے کہ جماعت احمدیہ ایک راستبازوں کی جماعت ہے اور ان کے دشمن اپنے افعال اور اقوال اور رویہ سے اپنے تئیں راستبازوں کے دشمنوں کے زمرہ میں شامل کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنے فعل سے اس بات کا بھی ثبوت دیا ہے کہ واقعی قرآن شریف خدا تعالیٰ کا سچا کلام ہے کیونکہ اس کی باتیں

ہمیشہ سچی ثابت ہوتی ہیں اور جن سُنن الہیہ کا اس میں ذکر ہے وہ ہمیشہ پوری ہوتی رہتی ہیں۔
 الغرض میرا مدعا اس مضمون کے لکھنے سے صرف یہی ہے کہ میں اصولی طور پر ارتداد
 کی سزا کے سوال پر بحث کروں کہ آیا یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ ایک اسلامی حکم اور شرعی حد ہے
 کہ اس شخص کو جو اسلام کو ترک کرے صرف اسلام ترک کرنے کے جرم میں قتل کر دیا جائے
 کہاں تک درست ہے؟ اس بارہ میں میں سب سے پہلے انشاء اللہ تعالیٰ قرآن شریف کی
 تعلیم کو پیش کروں گا اس کے بعد احادیث اور اقوال فقہاء پر علی الترتیب نظر کروں گا۔

وماتو فیقی الا باللہ العلی العظیم۔



قرآن شریف اور قتل مرتد

مسلمانوں میں سے جن علماء نے قتل مرتد کا فتویٰ دیا ہے وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جن کی یہ رائے ہے کہ مرتد کے قتل کی وجہ ارتداد نہیں اور اس گروہ میں محققین مذہب حنفیہ شامل ہیں۔ دوسرا وہ گروہ ہے جن کا یہ خیال ہے کہ صرف ارتداد اور تنہا ارتداد ہی وہ جرم ہے جس کے لئے بے دریغ قتل کا حکم دیا گیا ہے۔ چونکہ اس وقت جن لوگوں نے اس بحث کو اٹھایا ہے اور قتل مرتد کے وجوب پر زور دیا ہے ان کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ اسلام محض ارتداد کے لئے قتل کی سزا مقرر کرتا ہے اس لئے میں اس گروہ کے خیالات کی کسی قدر یہاں تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ تا ناظرین کو معلوم ہو کہ یہ تعلیم جو اسلام اور نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہے کیسی بھیانک اور مکروہ تعلیم ہے جو ایک دم کے لئے بھی اسلام جیسے پاکیزہ مذہب اور آنحضرت ﷺ جیسے مقدس انسان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی خلاف فطرت تعلیم ہے کہ ایک معمولی درجہ کا شریف انسان بھی اس کو کراہت کی نظر سے دیکھے گا چہ جائیکہ اشرف النبیین سید الاولین والآخرین ﷺ جیسے پاکیزہ فطرت اور مطہر انسان کو اس کا جاری کرنے والا ٹھہرایا جائے۔

ان لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ اصل وجہ قتل کی ارتداد ہی ہے اس لئے جو بھی مرتد ہو اس کو بے دریغ تہ تیغ کر دینا چاہیئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ جوان ہو یا بوڑھا۔ آزاد ہو یا غلام۔ تندرست ہو یا بیمار۔ غرض کوئی ہو اس کو قتل کر کے فوراً واصل جہنم کرنا چاہیئے اور اس طرح دنیا میں اسلام کی شوکت اور عظمت کا سکہ بٹھانا چاہیئے۔ اگر ایک مرتد شیخ فانی ہے تو اس کو اجازت نہیں دینی چاہیئے کہ وہ چند روز اور زندگی کے دن پورے کر کے اس عالم سے

گزر جائے بلکہ فوراً اس بوڑھے ضعیف کا سر بھی قلم کر دینا چاہیے اور اس طرح اس کو اسلام کی ہیبت کا مزہ چکھانا چاہیے۔ اگر مرتد بیمار پڑا ہے اور اس قابل نہیں کہ بستر سے بھی اٹھ سکے اور بخار کی تیزی یا درد کی شدت کی وجہ سے حالت اضطراب میں ہے تو اس کو بھی مہلت نہیں دینی چاہیے کہ وہ شفا کا منہ دیکھے یا اس بیماری میں ہی اس عالم سے رخصت ہو بلکہ اسلامی جلا د کو چاہیے کہ بسترِ مرض پر ہی اس کے سر کو تن سے جدا کر دے تا اسلام کا جلال دنیا پر ظاہر ہو۔

اسی طرح اگر اسلام سے ارتداد کرنے والی ایک بڑھیا ضعیف عورت ہے اس کی گردن بھی ہمارے علماء کے اسلام کی کھینچی ہوئی تلوار کی ضرب سے محفوظ نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی مرتد نابینا یا پا بچ ہے تو وہ بھی ہمارے علماء کے ہاتھوں ذبح ہونے سے محفوظ نہیں۔ حالانکہ وہ تو میں جو اسلام کی بیخ کنی کے لئے مسلمانوں پر جارحانہ حملے کر رہی ہوں ان کے بعض افراد کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امن دیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ایسے افراد کو باوجود جنگ کے قتل سے بچایا جائے لیکن ہمارے علماء کی مرتد کش تلوار سے ایسے افراد بھی محفوظ نہیں۔

اسلام کی تعلیم تو یہ سکھاتی ہے کہ پیاسے کتے کو پانی پلا کر تم جنت میں جاسکتے ہو اور ایک کافر کو پیاس کے دکھ سے آرام دے کر خدا تعالیٰ سے اجر پاسکتے ہو۔ لیکن ہمارے بعض علماء کا یہ فتویٰ ہے کہ اگر تمہارے پاس وضو کے لئے پانی ہو اور ایک مرتد پیاس سے مر رہا ہو تو اس کو پیاس سے مرنے دو مگر وضو کا پانی اسے نہ دو۔

پھر مرتد کو اپنی جان بچانے کے لئے توبہ کا موقع دینا بھی ایک گروہ علماء کے نزدیک ضروری نہیں اور جائز ہے کہ بغیر ایسا موقع دینے کے مرتد کو مرد ہو یا عورت۔ جو ان ہو یا پیر فرقت۔ تندرست ہو یا بیمار فوراً بلا تا مل قتل کر دیا جائے اور جو علماء موقع دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی اکثر تین دن سے زیادہ مہلت کی اجازت نہیں دیتے اور اس عرصہ میں بھی علماء کا ایک گروہ ہدایت دیتا ہے کہ مرتد کو دکھ دیا جائے تاکہ وہ توبہ کرنے پر مجبور ہو۔ چنانچہ

مولوی ظفر علی خاں صاحب اس کی تائید میں فقہ حنبلی کی مشہور کتاب المقنع سے حسب ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:-

”فمن ارتدّ عن الاسلام من الرّجال والنّساء و هو بالغ عاقل دعی
الیہ ثلاثة ایّام و ضیق علیہ فان لم یتب قتل . لا یجب استتابته بل
تستحب و یجوز قتله فی الحال.“

جو شخص اسلام سے مرتد ہو جائے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور عاقل و بالغ ہو تو اسے تین روز تک اسلام کی طرف بلایا جاوے اور اسے تنگ کیا جائے اگر توبہ نہ کرے تو قتل کیا جائے۔ توبہ طلب کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور مرتد کو معاً قتل کر ڈالنا بھی جائز ہے۔

ایسا ہی لکھا ہے کہ اگر مرتد کو کوئی شخص بغیر قاضی یا بادشاہ کے حکم کے جان بوجھ کر یا بھول کر قتل کر دے یا اس کی آنکھ پھوڑ دے یا ناک کاٹ دے یا ٹانگ توڑ دے، غرض کچھ کرے اس سے کوئی باز پرس نہیں۔

یہ اس تعلیم کا مختصر خاکہ ہے جو آج مولوی صاحبان اسلام کے نام سے دنیا کے آگے پیش کر رہے ہیں۔ ایک نے ان میں سے جن کا نام نامی ”شہیر احمد عثمانی“ ہے یہاں تک جسارت کی ہے کہ کہہ دیا ہے کہ یہ تعلیم صریح طور پر قرآن شریف میں موجود ہے مگر دوسروں نے ایسی جرات نہیں کی بلکہ یہ کہا ہے کہ قرآن شریف اس امر کے متعلق ساکت ہے۔ چنانچہ مولوی ظفر علی خاں صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:-

”بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ ہمدردی پیش کردہ آیات میں مرتد کے لئے سزائے قتل کا ذکر نہیں اور ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ غالباً کسی دوسری آیت میں بھی بالتصریح ایسا حکم نظر نہیں آتا۔“

مولوی ظفر علی خاں صاحب نے تو ”بالتصریح“ ذکر نہ ہونے کی شرط بڑھا کر

مولوی شبیر احمد صاحب کی خاطر داری کو ایک حد تک ملحوظ رکھا مگر مولوی شاکر حسین صاحب سہوانی نے 23 مارچ کے زمیندار میں صاف لکھ دیا کہ

”اس امر میں اختلاف کی کوئی وجہ نہیں کہ قرآن پاک میں قتل مرتدین کا کوئی صریح و غیر صریح حکم موجود نہیں ہے۔“

مگر ساتھ ہی مولوی سہوانی صاحب اور مولوی ظفر علی خاں صاحب فرماتے ہیں کہ سارا دین محض قرآن میں محدود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے مرتد کی دنیوی سزا کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے لیکن قرآن حکیم بعض دیگر احکام مثلاً حد شارب وغیرہ کے متعلق بھی اسی طرح ساکت ہے۔ لہذا اصولاً کہا جائے گا کہ قرآن کریم اس بارے میں ایسا ہی ساکت ہے جیسا کہ بعض دیگر احکام شرعی ہیں۔

اس کے جواب میں ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ شریعت کے تمام تفصیلی احکام قرآن شریف میں موجود ہیں اور بے شک یہ درست ہے کہ بعض تفصیل قرآن شریف میں نہیں پائی جاتیں۔ مگر ان تمام تفصیل کی جڑ اور ان کا اصل قرآن شریف میں موجود ہے۔ قرآن شریف ایک کامل کتاب ہے اور جتنے احکام آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے لئے جاری فرمائے وہ یا تو بالصراحت قرآن شریف میں مذکور ہیں یا ان کا بیج کلام ربانی میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ اگر بالصراحت قتل مرتد کا حکم قرآن شریف میں نہیں پایا جاتا تو کیا بطور بیج اور تخم کے اس حکم کا کوئی نشان قرآن میں ملتا ہے؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک تفصیلی حکم قرآن شریف میں نہ پایا جاتا ہو مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت ﷺ نے کوئی ایسا حکم نافذ فرمایا ہو کہ جو نہ صرف اس کا اصل ہی قرآن شریف میں موجود نہ ہو بلکہ وہ قرآن شریف کی عام تعلیم اور اس کی روح اور سپرٹ کے بھی خلاف ہو۔

قتل مرتد کا مسئلہ یعنی یہ مسئلہ کہ اگر کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار

کرے تو اسے بلا تامل اور بلا دریغ صرف ارتداد اور محض ارتداد کی سزا میں قتل کر دیا جائے۔ یہ بھی ایسا مسئلہ ہے کہ قرآن شریف میں اس کا بیج ہی مفقود نہیں بلکہ یہ مسئلہ قرآن شریف کی تمام تعلیم کے خلاف اور اس کے بالکل الٹ ہے اور اس مسئلہ کو قرآن شریف سے وہی نسبت ہے جو تاریکی کو نور سے ہے اور جس طرح نور اور ظلمت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ایسا ہی قرآن شریف کی تعلیم قتل مرتد کے مسئلہ کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ قرآن شریف کی تعلیم قتل مرتد سے ایسی ہی دور ہے جیسے مغرب سے مشرق بلکہ اس سے بھی زیادہ اور ان میں باہمی وہی تفاوت ہے جو سچ اور جھوٹ میں تفاوت ہے۔ اگر یہ مسئلہ درست ہے تو پھر نعوذ باللہ قرآن شریف جھوٹا ہے اور اگر قرآن شریف سچا ہے تو پھر ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ مسئلہ جس رنگ میں آج ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے بالکل غلط ہے یعنی یہ کہ ایک مرتد کو محض ارتداد اور تنہا ارتداد کے جرم میں قتل کر دینا واجب یا جائز ہے۔

ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قتل مرتد کے متعلق ان لوگوں کے کیا کیا خیالات ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر ایک مرتد صرف ارتداد اور محض ارتداد کے لئے واجب القتل ہے۔ اب ہم قرآن شریف کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا ایسے خیالات کا کچھ اصل قرآن شریف میں بھی پایا جاتا ہے اور کیا یہ مسئلہ قرآن شریف کی تعلیم سے ذرہ بھی مناسبت رکھتا ہے یا بالکل اس کے الٹ اور مخالف ہے؟

اسلام ایک علمی مذہب ہے

جب ہم قرآن شریف پر نظر کرتے ہیں تو سب سے پہلی بات جو ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن شریف اسلام کو ایک سائنس اور فلسفہ کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ سب سے پہلی وحی ہی کو دیکھو جو آنحضرت ﷺ پر غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ قرآن شریف کی ان پانچوں آیتوں کو پڑھو جو سب سے اوّل بطور پیش خیمہ آسمان

سے اُتریں۔ یہ پانچ آیتیں پانچ پھول ہیں جو اسلامی بہار کے آغاز میں کھلے۔ ان کو سونگھو اور دیکھو کہ ان سے کیسی خوشبو آتی ہے تا آپ کو معلوم ہو کہ اس موسم بہار میں کس رنگ کے پھول کھلنے والے تھے۔ یہ پانچ آیتیں اسلام کے باغ کا سب سے پہلا پھل ہیں ان کو چکھو اور ان سے اندازہ لگاؤ کہ اس باغ کے دوسرے پھل کس رنگ اور کس مزہ کے ہونے چاہئیں۔ وہ پانچ آیتیں، وہ اسلام کا پہلا پیغام جو اہل دنیا کے نام آسمان سے نازل ہوا یہ ہے۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ

الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (العلق: 6۲2)

ان آیات سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ اب ایک ایسا دین اترنا شروع ہوا ہے کہ جو ایک علم کے رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس کی اشاعت قلم کے ذریعہ یعنی دلائل اور براہین کے ذریعہ ہوگی نہ جبر و اکراہ کے ذریعہ۔ قرآن شریف کے سوا اور کونسی کتاب ہے جس کے جھنڈے پر قلم کا نشان ہے؟ اور اسلام کے سوا اور کونسا دین ہے جس نے علم کو اپنا Motto اور مقصد قرار دیا ہے۔ تمام دنیا کے مذاہب میں سے یہ امتیازی نشان صرف اسلام نے اپنے لئے انتخاب کیا ہے۔ پس کیا یہ ظلم نہیں کہ ایسے دین کی نسبت جو قلم کے ساتھ دنیا پر ظاہر ہوا اور جس نے اپنے پیغام کو علم کے لفظ سے تعبیر کیا یہ کہا جائے کہ اس نے اپنی اشاعت کے لئے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ تلوار کے زور سے لوگوں کو اپنے دین میں داخل کریں اور جو داخل ہو کر ٹکنا چاہے اس کا سر قلم کر دیں۔

اپنی تلوار کی دھار پر گھمنڈ کر نیوالو! ممکن ہے کہ قلم اور دو ات تہماری نظر میں بہت حقیر اور ذلیل ہوں مگر خدا ان کو عزت دیتا ہے اور ان کے نام پر اپنی پاک کتاب میں قسم کھاتا ہے۔ قرآن شریف میں اس سورۃ شریفہ کو تلاش کرو جس کا نام سورۃ القلم رکھا گیا ہے اور دیکھو وہ کن مبارک الفاظ کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ﴿٢﴾ (القلم: 2)

ہم قلم اور دوات کو اور اس کو جو ان کے ذریعہ سے لکھا جاتا ہے شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

پس جس کو تم حقیر سمجھتے ہو خدا تعالیٰ اس کو عزت دیتا ہے اور اس کے نام پر قسم کھاتا ہے۔ اگر اسلام ایک جنگی مذہب تھا تو چاہیے تھا کہ سیف و سنان کی قسم کھاتا نہ کہ ن والقلم وما یسطرون کی۔ کیا تمہیں کہیں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تلوار اور نیزے اور بندوق کی بھی قسم کھائی ہے؟ قلم تو یہ فخر کر سکتا ہے کہ قرآن شریف کی ایک سورۃ کریمہ اس کے نام سے موسوم ہے مگر کیا تلوار یا نیزہ کو بھی عزت دی گئی ہے؟

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ تمام قرآن مجید اس پہلی وحی الہی کے رنگ میں رنگین ہے جو قلم کے نشان کے ساتھ علم کا جھنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے دنیا پر نازل ہوئی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنی ہر ایک بات کو علم کے پیرایہ میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کہتی کہ ایک خدا پر ایمان لاؤ بلکہ خدا کی ہستی کے زبردست دلائل بھی ساتھ ہی پیش کرتی ہے۔ وہ صرف ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ خدا کی ذات فلاں فلاں صفات سے متصف ہے بلکہ ان صفات کے مظاہر بھی ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے تا ہمیں ان صفات کے متعلق یقین حاصل ہو۔ وہ صرف یہی نہیں کہتی کہ الہام اور وحی کا نزول دنیا کی ہدایت کے لئے ضروری ہے بلکہ بدلائل اس دعویٰ کو ثابت کرتی ہے۔ وہ صرف اتنا ہی نہیں کہتی کہ خدا کے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لاؤ بلکہ وہ ہمیں وہ معیار بھی بتلاتی ہے جن کے ذریعہ ہم سچے اور جھوٹے مدعیوں میں امتیاز کر سکیں۔ وہ صرف ہمیں یہی نہیں سکھاتی کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جو جزا و سزا کی زندگی ہے بلکہ وہ اس کا ثبوت بھی پیش کرتی ہے۔ غرض جو امور ایمانیات کے متعلق ہیں وہ ان کے متعلق ہم سے اس امر کا مطالبہ نہیں کرتی کہ ہم ان کو اندھا دھند مان لیں بلکہ پہلے دلائل کے ساتھ ان کی حقیقت کا یقین ہمارے دلوں

پر بٹھاتی ہے اس کے بعد ان پر ایمان لانے کا حکم دیتی ہے۔

قرآن شریف ہمیں صرف یہی حکم نہیں دیتا کہ نماز پڑھو، روزے رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، صدقہ دو، حج کرو، فلاں بدی سے بچو اور فلاں نیکی اختیار کرو بلکہ ان احکام کی حکمت اور ان کے فوائد بھی ساتھ ہی بیان فرماتا ہے۔ تاہم شوق سے بطیب خاطر ان اعمال کو بجلائیں اور ان کو ایک بوجھ نہ سمجھیں۔

ہم قرآن شریف میں جا بجا دیکھتے ہیں کبھی وہ ہماری توجہ صحیفہ قدرت کی طرف پھیرتا ہے اور کبھی وہ ہماری عقل سلیم اور فطرت کے آگے اپیل کرتا ہے اور ہمیں غور اور فکر اور تدبیر سے کام لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ کبھی وہ سنن الہیہ اور اللہ تعالیٰ کے غیر مبدل قوانین کا ذکر کرتے ہوئے گزشتہ واقعات اور پہلے انبیاء اور ان کی قوموں کی مثال سے عبرت حاصل کرنے کی تحریک کرتا ہے۔ کبھی وہ نہایت ہی پیچیدہ اور مغلق مسائل کو نہایت ہی آسان پیرایہ میں حل کر کے دکھاتا ہے اور کبھی وہ مخالفین کے اعتراضات کا رد کر کے ان پر اتمام حجت کرتا ہے۔ کبھی وہ عقائد باطلہ اور خصائل رذیلہ کو عقائد حقہ اور اخلاق فاضلہ کے مقابل میں رکھ کر اسلامی تعلیمات کی فضیلت کو طالباں حق پر واضح کرتا ہے اور کبھی ہماری ضمیر اور کانشنس سے اپیل کر کے ہماری زبان سے حق کا اقرار کرواتا ہے۔ غرض کوئی علمی، ذہنی، عقلی اور فطری ذریعہ نہیں جس کو وہ کام میں نہیں لاتا اور کوئی سمجھانے کا طریق نہیں جس کو وہ استعمال نہیں کرتا۔

ہر ایک شخص جو قرآن شریف کا کچھ بھی علم رکھتا ہے اس امر کی شہادت دے گا کہ لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لئے قرآن شریف اس بات کی جا بجا ترغیب دیتا ہے کہ وہ غور اور تدبیر سے کام لیں۔ کبھی تو وہ فرماتا ہے:-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
لَايَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقُعُودًا ۗ

عَلَى جُوبِهِمْ وَيَفْكُرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (ال عمران: 191-192)

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں عقلمندوں کے لئے یقیناً کئی نشان موجود ہیں۔ وہ عقلمند جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بارے میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

کبھی وہ فرماتا ہے:-

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٥﴾ (محمد: 25)

کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔

کبھی فرماتا ہے:-

أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفَ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ﴿٦٦﴾ (الانعام: 66)

دیکھ ہم دلیلوں کو کس طرح بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔

غرض قرآن شریف بار بار آفَلَا تَعْقِلُونَ اور آفَلَا تَتَفَكَّرُونَ. لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ. آفَلَا يَعْقِلُونَ. لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ. اور ایسے ہی الفاظ کہہ کر انسان کی عقل سے اپیل کرتا ہے اور اس کو غور اور فکر کی تحریک کرتا ہے اور منافقوں اور کفار کی نسبت فرماتا ہے:-

صُمٌّ بُكْمٌ عُمَىٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٧٧﴾ (البقرة: 172) ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا

يَعْقِلُونَ ﴿٥٩﴾ (المائدة: 59) الصُّمُّ ابْنُكَمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٣﴾ (الانفال: 23)

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا ۗ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا ۗ وَلَهُمْ

أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ أُولَٰئِكَ كَانُوا لَنَا نِعَامًا ۗ بَلْ هُمْ أَصْلٌ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ

الْغٰفِلُونَ ﴿١٨٠﴾ (الاعراف: 180)

یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اس لئے سمجھتے نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ یہ بہرے اور گونگے ہیں جو کچھ بھی عقل

نہیں رکھتے۔ ان کے دل تو ہیں مگر ان کے ذریعہ سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں تو ہیں مگر ان کے ذریعہ سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان تو ہیں مگر ان کے ذریعہ سے وہ سنتے نہیں۔ یہ لوگ چار پاویوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ بالکل جاہل ہیں۔

پس قرآن شریف شروع سے لے کر آخر تک انسان کو اپنی عقل اور دانش اور آنکھوں اور کانوں اور غور و فکر سے کام لینے کی ترغیب دیتا ہے اور ہر ایک بات دلیل کے ساتھ منواتا اور ہر ایک حکم کی حکمت بیان فرماتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ قرآن شریف خود دلائل سے اپنے دعویٰ کی سچائی ثابت کرتا ہے بلکہ حق کے مخالفوں سے بھی دلائل کا مطالبہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:-

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۱۲﴾ (البقرة: 112)

(اے پیغمبر) تو انہیں کہہ دے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔
پھر فرماتا ہے:-

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهِ عِلْمٌ (الحج: 72)

اور وہ لوگ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے لئے اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور جن کے متعلق ان کو کسی قسم کا کوئی علم حاصل نہیں۔

پس کیا یہ ظلم نہیں کہ ایسے دین کی نسبت جس کا دار و مدار دلائل اور براہین پر ہے اور جو عین فطرت صحیحہ کا نقشہ ہے اس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کے سروں پر جو اس کو قبول کریں ایک شمشیر برہنہ آویزاں رکھتا ہے اور ہر آن ان کو اس کی طرف سے یہ دھمکی مل رہی ہے کہ اگر تم مجھے ترک کرنے کا خیال بھی کرو گے تو یاد رکھو یہی شمشیر تمہارے سر پر گرے گی اور تمہیں ہلاک کر دے گی۔

طریق تبلیغ

پھر اس طریق کو دیکھو جو اسلام کی تبلیغ کے لئے قرآن شریف سکھاتا ہے۔ جب ہم قرآن شریف پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسا خود وہ اپنے اصول اور احکام کی خوبی اور کمال کو ظاہر کرنے کے لئے حکیمانہ طریق اختیار کرتا ہے اور دلائل قویہ اور نتج نیہ کے ذریعہ اپنی تعلیم کی خوبی لوگوں کے ذہن نشین کرتا ہے ایسا ہی مبلغین اسلام کو بھی یہی ہدایت دیتا ہے کہ وہ نہایت ہی احسن طریق سے لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں۔ وہ اپنے پیروؤں کو یہ نہیں سکھاتا کہ تم جابرانہ اور قاہرانہ طریق سے اسلام کی اشاعت کرو بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ تم لوگوں کو اسلام کی طرف بلاؤ۔ چنانچہ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: 126)

لوگوں کو حکیمانہ طریق سے اور اچھی اچھی نصیحتوں سے اپنے پروردگار کے رستہ کی طرف بلاؤ اور ان کے ساتھ بحث ایسے طور پر کرو کہ وہ لوگوں کے نزدیک بہت ہی پسندیدہ ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ اہل کتاب کا ذکر کر کے فرماتا ہے:-

وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (العنکبوت: 47)

اہل کتاب کے ساتھ جھگڑانہ کیا کرو مگر ایسے طریق سے جو نہایت ہی احسن ہو۔

مندرجہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ مسلمان جب اپنے دین کی تبلیغ کریں تو نہایت ہی احسن طریق اختیار کریں اور نہایت ہی نرمی اور رافت اور ہمدردی کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں۔ اب بتلاؤ کسی کو یہ کہنا کہ تم اسلام میں داخل ہو جاؤ ورنہ زیادہ سے زیادہ تم کو تین دن کی مہلت دی جاتی ہے اگر اس عرصہ کے

اندر تم واپس اسلام میں داخل نہ ہو گئے تو تمہیں قتل کیا جائے گا۔ کیا یہی طریق ہے جو قرآن شریف کی آیات سے مستنبط ہوتا ہے؟

ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

قرآن شریف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو حق کے قبول کرنے کی توفیق دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی کسی کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے جب تک اللہ تعالیٰ کسی کے سینہ کو اسلام کے قبول کرنے کے لئے نہ کھول دے وہ اسے قبول نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ (الانعام: 126)

جس شخص کے متعلق خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اسے راہ راست دکھائے اس کے سینہ کو قبول اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔
پھر فرماتا ہے:-

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ
وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٧﴾ (القصص: 57)

اپنی خواہش کے مطابق تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہی راہ پر آنے والوں کے حال سے خوب واقف ہے۔

غرض قرآن شریف کی مندرجہ بالا اور اسی مضمون کی اور بہت سی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو کھول دیتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ کسی کو اسلام میں داخل کرنا ہمارے اختیار میں نہیں۔ یہ دل کا فعل ہے اور کسی تلوار کی دھار اس دل تک نہیں پہنچ سکتی جس کے ساتھ اسلام لانے یا نہ لانے کا تعلق ہے۔ وہ دل انسانی زد سے

بہت دور ہے نہ وہاں انسانی تلوار کام کر سکتی ہے اور نہ بندوق۔ کوئی ہاتھ نہیں جو اس دل کو پھیر سکے اور کوئی ہتھیار نہیں جو اس پر اثر کر سکے۔

ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اگرچہ ہدایت ہمارے اختیار میں نہیں لیکن ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسباب سے کام لیں۔ نتائج کا مرتب کرنا بے شک خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم تدبیر اور سعی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ہاں بے شک تم نے سچ کہا مجھے اس امر سے پورا اتفاق ہے اگرچہ ہدایت پانے کی توفیق دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے مگر ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ مگر مجھے بتاؤ وہ کون سے ذرائع ہیں جو کسی کو حق کی طرف راہنمائی کرنے کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں؟ وہ کونسی نشتر ہے جو آنکھوں کے پردوں کو چیر سکتی ہے؟ وہ کس توپ کی گرج ہے جو کانوں کی گرانی کو دور کر سکتی ہے؟ وہ کونسی تلوار ہے جو دل کی بندکھڑکی کو کھول سکتی ہے؟ کیا وہی تلوار جس کی نسبت مولوی شبیر حسین صاحب دیوبندی فرماتے ہیں کہ *اخیر الحیل السیف اور جس کی نسبت مولوی ظفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن میں اس کو تلاش کرنا فضول ہے۔ اس کو ڈھونڈنا ہو تو کابل کے اسلحہ خانہ میں تلاش کرو۔ اے اسلام کو بدنام کرنے والے مولویو! بتاؤ کیا یہی تلوار دلوں کے بند قلعوں کو فتح کر سکتی ہے؟ کیا دلوں کے قفل کھولنے والی یہی چابی ہے جو تمہارے ہاتھ میں دی گئی؟ کیا تسخیر قلوب کے لئے یہی خاص تدبیر ہے جس پر تم کوناز ہے؟ افسوس! صد افسوس!!*

آؤ میں تمہیں بتاؤں وہ تلوار جس کی چوٹ دل پر لگتی ہے وہ لوہے یا فولاد کی تلوار نہیں بلکہ وہ دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کی تلوار ہے۔ وہ نیزہ جو انسان کے سینہ کو چیرتا ہے وہ لکڑی اور لوہے کا نیزہ نہیں بلکہ وہ وہ نیزہ ہے جس کے چلانے کے لئے قرآن شریف کی اس آیت میں حکم دیا گیا ہے:-

وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٤﴾ (النساء: 64)

ان سے ایسی باتیں کرو جو اچھی طرح ان کے دلوں پر اثر کریں وہ حربہ جس کے چلانے کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے خود اسلام کی تعلیم ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَظَرَّتْ اللَّهُ النَّحْيَ فَظَرَّ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم: 31)

یعنی یہ دین کیا ہے؟ خدا کی بنائی ہوئی سرشت ہے جس خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اور فطرت انسانی پر وہی چیز اثر کر سکتی ہے جو عین فطرت کے مطابق ہو۔ پس دشمن کے دل کو فتح کرنے کے لئے سب سے بڑا ہتھیار خود قرآن شریف ہے۔ اس نے وہ کام کیا جو کوئی تلوار نہیں کر سکتی۔ وہی ہتھیار اب بھی موجود ہے مگر ہمارے مخالف مولوی صاحبان کے ہاتھ میں طاقت نہیں کہ اس کو چلا سکیں اس لئے اس آسانی تلوار کو چھوڑ کر زمینی تلوار کی طرف جھک گئے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی کو ہدایت دینا ہمارے اختیار میں نہیں اس لئے تلوار کے ذریعہ کسی کو اسلام کی طرف لوٹانے کی کوشش کرنا ایک بے سود فعل ہے۔

ہمارا کام صرف پہنچا دینا ہے

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں بار بار ہمیں سمجھاتا ہے کہ ہمارا کام صرف پیغام پہنچانا ہے کسی کو اسلام لانے کے لئے مجبور کرنا ہمارا کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

مَاعَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ (المائدة: 100)

کہ رسول پر صرف بات کا پہنچانا واجب ہے۔

پھر فرماتا ہے:-

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ

فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلِيَ رَسُولُنَا الْبَلَّغُ الْمُبِينُ ﴿٩٣﴾ (المائدة: 93)

اور تم اللہ کی بھی اطاعت کرو اور اس رسول کی بھی اطاعت کرو اور ہوشیار رہو اور اگر تم پھر گئے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ تو کھول کھول کر پہنچا دینا ہی ہے۔
پھر فرماتا ہے:-

وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ءَأَسْلَمْتُمْ ؕ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ

اهْتَدَوْا ؕ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَّغُ ؕ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢١﴾ (ال عمران: 21)

(اے پیغمبر) اور ان لوگوں کو جنہیں کتاب دی گئی ہے کہہ دے نیز اُمیوں کو بھی کہ کیا تم فرمانبردار ہوتے ہو۔ پس اگر وہ فرمانبردار ہو جائیں تو سمجھو کہ وہ ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو تیرے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

مندرجہ بالا آیات اور اسی مضمون کی بہت سی دیگر آیات سے یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ رسول کا کام صرف یہی ہے کہ وہ خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا دے اس کا یہ کام نہیں کہ وہ لوگوں کو اس کا پیغام قبول کرنے کے لئے مجبور کرے اور رسول کی امت اپنے نبی کے تابع ہوتی ہے۔ پس اگر مجبور کرنا نبی کا کام نہیں تو اس کے اتباع کا کس طرح ہو سکتا ہے؟

یہ بھی یاد رہے کہ اس مضمون کی آیات صرف مکئی ہی نہیں بلکہ ان میں مدنی آیات بھی شامل ہیں۔ پس جس طرح مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف حکم الہی کا پہنچا دینا تھا ایسا ہی مدینہ میں بھی اتنا ہی کام تھا اور زور کے ساتھ کسی کو داخل کرنا یا داخل ہونے کے بعد اس کو اسی دین میں رہنے پر مجبور کرنا آپؐ کا کبھی کام نہیں ہوا اور نہ اس کی کوئی مثال آپ کے متعلق ملتی ہے۔ لیکن آج مسلمان کہلانے والے اسلام کے سب سے بڑے خیر خواہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے لوگوں کو جبراً مسلمان رکھنے اور بے دریغ قتل کر دینے کا حکم دیا ہے۔ یہیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔

دوسروں کی گمراہی کے ہم جواب دہ نہیں

قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنا فرض تبلیغ ادا کر چکیں اور پھر بھی کوئی نہ مانے تو ہم بری الذمہ ہیں، ہم ایسے لوگوں کی گمراہی کے ذمہ دار نہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ مائدہ میں فرماتا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ
إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۗ (المائدة: 106)

مسلمانو! تم اپنی خبر رکھو۔ جب تم راہ راست پر ہو تو کوئی بھی گمراہ ہو کرے اس کا گمراہ ہونا تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔
اسی طرح فرماتا ہے:-

مَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۗ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۗ
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ (بنی اسرائیل: 16)

جو شخص سیدھے رستے پر چلا تو اپنے ہی فائدہ کے لئے سیدھے رستے پر چلتا ہے اور جو بھٹکا تو اس کے بھٹکنے کا خمیازہ بھی اسی کو بھگتنا پڑے گا اور کوئی تنفس کسی دوسرے تنفس کے بار کو اپنے اوپر نہیں اٹھاتا۔

جب ہم سے گمراہ ہونے والوں کے متعلق کوئی باز پرس نہیں ہوگی بشرطیکہ ہم امر بالمعروف پر عمل کرتے رہیں تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم ایسے لوگوں کو مجبور کریں کہ وہ بہر حال ہماری رائے کے ساتھ اتفاق کریں اور انکار کی صورت میں ہم ان کو قتل کر دیں۔

قرآن شریف حکم دیتا ہے کہ نہ ماننے والوں سے اعراض کرو

مخالف کہتا ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ نہ ماننے والوں کو قتل کرو مگر قرآن شریف

کہتا ہے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ چند آیات صرف بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَاعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٣٠﴾ (النجم: 30)
 اور جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیر لیتا ہے اور سوائے دنیا کی زندگی کے اور کچھ نہیں چاہتا، تو بھی اس کی طرف سے منہ پھیر لے اور اس کی پیروی نہ کر۔
 پھر فرماتا ہے:-

فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ ﴿٥٥﴾ وَذَكَرْنَاكَ الذِّكْرَىٰ
 تَتَنَفَّحُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٦﴾ (الذاریات: 55، 56)

پس اے نبی تو ان سے منہ پھیر لے اور تجھ کو ان کے کاموں کی وجہ سے کوئی ملامت نہیں کی جائے گی اور یاد دلاتا رہے کیونکہ یاد دلانا مومنوں کو نفع بخشا کرتا ہے۔
 پھر فرماتا ہے:-

وَاعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٧﴾ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا (الانعام: 107، 108)
 اور تو مشرکوں سے منہ پھیر لے اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے۔

نبی لوگوں پر داروغہ کے طور پر مقرر نہیں کیا گیا

اللہ تعالیٰ بار بار کھول کر فرماتا ہے کہ نبی کا کام صرف سمجھانا ہے وہ لوگوں پر داروغہ کی طرح متعین نہیں کیا گیا کہ وہ ضرور ان کو اسلام لانے یا اسلام میں رہنے کے لئے مجبور کرے یا ان سے اس کے متعلق کوئی باز پرس کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-
 فَذَكَرْنَا إِنْ مَّا أَنْتَ مَذْكُورٌ ﴿٢٢﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيَّبٍ ﴿٢٣﴾ (الغاشية: 22، 23)
 پس نصیحت کر کہ تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔ تو ان لوگوں پر داروغہ کے طور پر مقرر نہیں ہے۔

پھر فرماتا ہے:-

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكَرَ
بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَيْدٍ ﴿٤٦﴾ (ق:46)

ہم ان کی باتوں سے خوب واقف ہیں اور تو ان پر ایک جابر بادشاہ کے طور پر مقرر نہیں کیا گیا۔ سو تو قرآن کے ساتھ صرف اس کو نصیحت کر جو میرے عذاب کی پیشگوئیوں سے ڈرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے:-

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا ۗ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۗ
وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾ (الانعام:108)

اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور ہم نے تجھے ان پر محافظ نہیں مقرر کیا اور نہ تو ان پر نگران ہے۔

ان آیات سے اور اسی مضمون کی بہت سی دوسری آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کا یہ کام نہیں کہ وہ لوگوں پر بطور محافظ اور داروغہ کے مقرر ہو اور ان کو جبر سے اسلام میں داخل کرے اور جو داخل ہو چکے ہوں ان کو بھٹکنے سے روکے رکھے۔ اس کا کام صرف سمجھا دینا ہے اور بس۔ اور جب خود نبی کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی رنگ میں جبر سے کام لے تو اس کے اتباع کس طرح جبر سے کام لے سکتے ہیں۔

نبی کو ایمان اور کفر کی جزا سزا سے کوئی سروکار نہیں

حامیان دربار کا بل اس بات کے مدعی ہیں کہ اسلام صرف ارتداد اور محض ارتداد کے لئے قتل کی سزا مقرر کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نبی کو اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ کسی کے کفر پر کسی کو سزا دے یہ خدا کا کام ہے جس کو چاہے معاف کرے اور جس کو چاہے

سزا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ

فَأَنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١٢٩﴾ (ال عمران: 129)

(اے پیغمبر) تیرا اس معاملہ میں کچھ دخل نہیں یہ سب معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے چاہے تو ان پر فضل کرے اور چاہے تو ان کو عذاب دے دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا أَنتَ مَنَّهُمْ فِي شَيْءٍ طَائِفًا

أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٦٠﴾ (الانعام: 160)

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ درگروہ ہو گئے ہیں تیرا ان سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ ان کا معاملہ تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر جو کچھ وہ کرتے تھے وہ اس کی انہیں خبر دے گا۔

اسلام مذہبی آزادی کی تعلیم دیتا ہے

مولوی ظفر علی خاں صاحب لکھتے ہیں کہ آزادی ضمیر کا خیال افرنجیت ہے جو مغربی ممالک سے مسلمانوں میں داخل ہوئی۔ یہ ایک مستعار خیال ہے جو مسلمانوں نے مغرب سے سیکھا۔ لیکن مولوی ظفر علی خاں صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ضمیر کی آزادی کا اصول مغرب کی ایجاد نہیں بلکہ یہ وہ اصول ہے جو سب سے پہلے قرآن شریف نے دنیا کو سکھایا۔ آسمان کے نیچے صرف ایک ہی الہامی کتاب ہے جو ضمیر کی آزادی کے اصولوں کو نہایت ہی مضبوط بنیاد پر قائم کرتی ہے۔ مذہبی آزادی کے متعلق آج سے 13 سو سال پہلے جو تعلیم قرآن شریف میں دی گئی اس کی نظیر کسی اور الہامی یا غیر الہامی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اگر مغرب نے ضمیر کی آزادی کا سبق سیکھا ہے تو وہ مسیحیت کے حامیوں کے تشدد اور ظلم اور تعدی سے سیکھا ہے۔ مذہب کے نام پر مغربی لوگوں پر ناقابل بیان ظلم کئے

گئے اور طرح طرح کے عذابوں کے ذریعہ ان کو دکھ دیا گیا اور قتل کیا گیا جس کا برعکس نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو مذہبی تشدد سے نفرت پیدا ہوگئی اور مذہبی آزادی کی قدر ان کے دلوں میں قائم ہوگئی۔ یہ سبق انہوں نے مسیحیت سے نہیں سیکھا بلکہ مسیحی بزرگوں کی خونریزیوں اور جفاکاریوں سے حاصل کیا لیکن ہم اس سبق کے لئے کسی انسان کے ممنون نہیں بلکہ ہمارا خدا اپنی کتاب میں ہمیں اس اصول کی تعلیم دیتا ہے دیکھو اس بارے میں قرآن شریف کی تعلیم کیسی کھلی کھلی اور واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّ هَذِهِ تَذْكَرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿٢٠﴾ (المزمل: 20)

یہ باتیں نصیحت کی ہیں پس جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے کا راستہ اختیار کرے۔ یعنی یہی الفاظ سورۃ دھر میں بھی موجود ہیں۔ پھر فرماتا ہے:-

كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ﴿٥٦﴾ (المدثر: 55-56)

ہرگز ایسا نہیں کیونکہ قرآن تو سراسر نصیحت ہے، پس جو چاہے اس کو سوچے سمجھے۔ پھر فرماتا ہے:-

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (الکہف: 30)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہو کہ یہ قرآن برحق تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے پس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے۔

پھر فرماتا ہے:-

قُلِ اللَّهُ أَعْبَدُ مُخْلِصًا لَهُ دِينِي ﴿١٦﴾ فَأَعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ مِّن دُونِهِ (الزمر: 15-16)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہو کہ میں تو خدا ہی کی فرمانبرداری مد نظر رکھ کر اسی کی عبادت کرتا ہوں۔ رہے تم سوا اس کے سوا جس کو چاہو پوجو۔ پھر فرماتا ہے:-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي

لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ﴿١٠٩﴾ (یونس: 109)

اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اے لوگو جو حق بات تھی وہ تو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آچکی۔ پس جس نے راہ راست اختیار کی تو اپنے ہی فائدہ کے لئے اس کو اختیار کرتا ہے اور جو بھٹکا تو وہ بھٹک کر کچھ اپنا ہی کھوتا ہے اور میں تم پر کچھ ٹھیکہ داروں کی طرح تو مسلط ہوں نہیں۔
پھر فرماتا ہے۔

وَأَنْ أَتَلُّوا الْقُرْآنَ ۖ فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ
إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿٩٣﴾ (النمل: 93)

مجھ کو یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناؤں پس جو راہ پر آ گیا تو وہ اپنے ہی بھلے کو راہ پر آتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو تم کہہ دو کہ جہاں خدا نے اور ڈرانے والے بھیجے ہیں میں بھی ان ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہوں، اور بس۔

ان سب آیات سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آزادی دے رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کھول کر بیان فرما دیا ہے اور راہ راست پر چلنے کے فوائد اور کج راہ پر چلنے کے نقصانات بھی بوضاحت بیان فرما دیئے ہیں اس کے بعد انسان اگر چاہے تو ہدایت کی راہ کو اختیار کرے اور چاہے تو دوسری راہ اختیار کرے۔ ایسی تعلیم کی موجودگی میں یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ جو لوگ اسلام سے مرتد ہونا چاہیں ان کو تلوار کے زور سے اسلام میں رہنے کے لئے مجبور کیا جاوے اور جو لوگ اسلام میں رہنا منظور نہ کریں ان کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ کیا ایسی قابل نفرت تعلیم ایک لمحہ کے لئے بھی قرآن جیسی کتاب کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے جو باواز بلند کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کی راہیں واضح کر کے بیان فرمادی ہیں اور دونوں راہوں کو اختیار کرنے کے نتائج بھی کھول کر بیان فرما دیئے ہیں۔ پس اب ہر ایک شخص کا اختیار ہے چاہے تو حق کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو باطل کی پیروی کرے۔

اس کے اپنے عمل کے مطابق اس کو بدلہ مل جائے گا۔

دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں

اب میں چند آیات قرآنی اس مضمون کی پیش کرتا ہوں کہ دین کے معاملہ میں جبر سے کام لینا ناجائز ہے اور اللہ تعالیٰ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:-

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ لِشُعَيْبٍ
وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُوذُنَّ فِي مِلَّتِنَا قَالَ
أَوْ لَوْ كُنَّا كَرِهِينَ ﴿٨٩﴾ (الاعراف: 89)

شعیبؑ کی قوم میں جو لوگ رودار اور مغرور تھے بولے کہ اے شعیبؑ ہم تجھ کو اور جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہوگا کہ تم لوگ ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ گے۔ شعیبؑ نے کہا کیوں جی! اگر ہم تمہارے دین کو دل سے ناپسند کرتے ہوں پھر بھی زبردستی تمہارے مذہب میں آلیں؟

اس آیت کریمہ میں خدا تعالیٰ کا ایک پاک نبی مذہب کی تبدیلی کے متعلق ایک اصول بیان کرتا ہے۔ جب حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی جماعت سے ان کی بستی کے ذی اقتدار رئیس اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے آبائی مذہب میں واپس لوٹ آویں ورنہ وہ ان کے حق میں یہ حکم جاری کریں گے کہ ان کو بستی سے نکال دیا جائے۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام ان عمامد سے ایک سوال کرتے ہیں وہ ان سے پوچھتے ہیں۔ اگر ہم دل میں تمہارے دین کو ناپسند کرتے ہوں تو کیا پھر بھی ہم اس میں اپنی مرضی کے خلاف اکراہاً و جبراً داخل ہو سکتے ہیں؟ یہاں حضرت شعیبؑ اپنی قوم کے مقابل میں ایک عقلی دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مذہب کا تعلق تو دل سے ہے اگر ہمارے دل تمہارے

مذہب کو ناپسند کرتے ہوں تو پھر ہم سے اس امر کا مطالبہ کرنا کہ ہم اپنی مرضی کے خلاف تمہارے مذہب کی طرف لوٹ آئیں ایک غیر معقول فعل ہے۔ اس دلیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف کسی دین میں داخل ہونے کے لئے مجبور کرنا ہرگز جائز نہیں۔

پس اگر ”أَوْلَوْ كُنَّا كَرِهِينَ“ کی دلیل درست ہے تو مسلمانوں کے لئے بھی یہ ناجائز ہے کہ وہ اسلام سے ارتداد اختیار کرنے والے کسی انسان کو یہ کہیں کہ ”لَنْ قُتِلْنَا يَافْلَانُ أَوْ تَعُوذُنْ فِي مِلَّتِنَا“ بلکہ قتل کرنا تو کجا وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے ”لَنْ نُخْرِجَنَّكَ يَافْلَانُ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُوذُنْ فِي مِلَّتِنَا“ کیونکہ اگر وہ ایسا کہیں گے تو وہ ان کے جواب میں کہہ سکتا ہے ”أَوْلَوْ كُنَّا كَرِهِينَ“۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر حضرت شعیبؑ کی یہ دلیل اپنے اندر کوئی سچائی اور معقولیت رکھتی ہے تو مرتد کے قتل کا فتویٰ غلط ہے اور اگر مرتد کو محض ارتداد کے لئے قتل کرنے کا فتویٰ درست ہے تو حضرت شعیبؑ کی ”أَوْلَوْ كُنَّا كَرِهِينَ“ والی دلیل نعوذ باللہ غلط ٹھہرتی ہے۔

پھر دیکھو اللہ تعالیٰ اس درد کا ذکر کرتے ہوئے جو آنحضرت ﷺ کو اپنی قوم کے متعلق تھا فرماتا ہے:-

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ
حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُوْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَيَجْعَلُ
الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (یونس: 100، 101)

اے پیغمبر! تمہارا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ تم لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیں اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی شخص ایمان نہیں لاسکتا اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو عقل کو کام میں نہیں لاتے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہو سکتا۔ اگر جبر کا اصول درست ہوتا تو خدا تعالیٰ کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اس کام کو لوگوں کے سپرد کرتا۔ وہ اگر چاہتا تو روئے زمین کے تمام لوگوں کو خود مسلمان بنا دیتا۔ اس معاملہ میں اس کو انسانوں کی امداد کی ضرورت نہ تھی۔ پھر فرماتا ہے جبر سے کوئی کسی کو کس طرح مسلمان بنا سکتا ہے۔ ایمان کی توفیق دینا تو خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور جو لوگ خدا داد عقل سے کام نہیں لیتے ان کو ایمان کی توفیق نہیں دی جاتی۔

پس یہ آیات بھی دین کے معاملہ میں جبر کرنے سے روکتی ہیں اور اس کو ایک بیہودہ فعل قرار دیتی ہیں۔ کیونکہ اس سے وہ غرض پوری نہیں ہو سکتی جس کے لئے جبر کا استعمال کیا جاتا ہے اور جس طرح ایسے شخص کے لئے جبر کرنا ناجائز ہے جو کبھی مسلمان نہیں ہوا اسی طرح اس شخص کے لئے بھی جبر ناجائز ہونا چاہیے جو اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرتا ہے۔ پیدائشی کافر بھی کافر ہے اور مرتد بھی کافر ہے اور اگر پیدائشی کافر کے لئے جبر واکراہ درست نہیں تو مرتد کے لئے بھی درست نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک صورت میں جبر ناجائز ہو اور دوسری صورت میں جبر جائز ہو۔ جبر ہر صورت میں ناجائز ہونا چاہیے۔ جبر اگر بُری چیز ہے تو دونوں صورتوں میں بُری ہونی چاہیے۔ پیدائشی کافر کی صورت میں جبر کیوں ناجائز تھا؟ اسی لئے کہ جبر کے ذریعہ کسی کے دل میں اسلام کا نور داخل نہیں کیا جاسکتا اور یہی وجہ مرتد کی صورت میں بھی موجود ہے۔ کیونکہ جیسا پیدائشی کافر کو جبر واکراہ کے ذریعہ ہدایت نہیں دی جاسکتی اسی طرح مرتد کی صورت میں بھی جبر واکراہ ہدایت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ پس اگر پیدائشی کافر کے لئے جبر ناجائز ہے تو مرتد کے لئے بھی جبر اسی طرح ناجائز ہونا چاہیے۔ **فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ**

(الکہف: 30) جیسا پیدائشی کافر پر چسپاں ہوتا ہے ویسا ہی مرتد پر۔

میں قرآن شریف کی بہت سی آیات پیش کر چکا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ

اسلام دین کے معاملہ میں جبر کو ناجائز قرار دیتا ہے اور وہ سب آیات ایسی واضح اور پتین ہیں کہ ان میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ بعض لوگ جبر کی تعلیم کی طرف جھک جائیں گے اور وہ دین کے لئے جبر و اکراہ کو جائز قرار دیں گے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اصول اور قاعدہ اور حکم کے رنگ میں ایک نہایت ہی زبردست اور چٹان کی طرح مضبوط آیت قرآن شریف میں نازل فرمائی ہے جو ہر ایک ایسے شخص کے دعویٰ کو جو زمین میں جبر کے جواز کا قائل ہو پاش پاش کر دیتی ہے۔ وہ قطعی اور فیصلہ کن حکم یہ ہے۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرة: 257)

’دین میں زبردستی کا کچھ کام نہیں‘ (ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی)

دیکھو یہ کیسے کھلے کھلے اور کیسے واضح الفاظ میں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ کو کوئی دخل نہیں۔ قرآن شریف میں اس واضح اور صریح حکم کے موجود ہوتے ہوئے کس طرح کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام قتل کی دھمکی دے کر لوگوں کو ارتداد سے روکتا ہے کیا وہ دین جو لا اکراہ فی الدین کا اعلان کرتا ہے یہ تعلیم دے سکتا ہے کہ جبر سے لوگوں کو مسلمان بنایا جائے اور وہ لوگ جو اسلام لانے کے بعد اسلام سے برگشتہ ہونا چاہیں ان کو جبر سے مسلمان رکھا جاوے۔ یہ آیت کریمہ اپنے منطوق میں ایسی واضح اور پتین ہے کہ جو لوگ دین میں جبر و اکراہ کے قائل ہیں وہ اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ اس آیت کریمہ کو منسوخ قرار دیں۔ ان کا اس آیت کریمہ کو منسوخ قرار دینا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ آیت شریفہ کھلے طور پر جبر و اکراہ سے روکتی تھی اور کوئی معقول توجیہ ایسی نہیں ہو سکتی تھی جس کے رو سے یہ کہا جاسکے کہ یہ آیت اکراہ کی مانع نہیں ہے اس لئے وہ اس کو منسوخ قرار دینے کے لئے مجبور ہو گئے۔

لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں قرآن شریف کوئی حکم نہیں دیتا جس کی دلیل اور حکمت بھی وہ ساتھ ہی بیان نہیں فرماتا۔ چنانچہ اس حکم کی دلیل بھی اس حکم کے ساتھ ہی

بیان فرمادی گئی ہے جو یہ ہے کہ

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرة: 257)

یعنی جبر کا تو ایک ہی مقام ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو سمجھ نہ سکے اس پر جبر کیا جاتا ہے جیسا کہ بچہ کی صورت میں کیونکہ اس میں ابھی سمجھنے کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہاں وہ صورت نہیں ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ”ہدایت گمراہی سے الگ ظاہر ہو چکی ہے۔“ یعنی اب ہدایت اور گمراہی کی راہیں بالکل واضح اور یقین ہو گئی ہیں اور ہر ایک کے لئے جو سمجھنا چاہے ہدایت کا طریق گمراہی سے بالکل الگ ہو گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان تمیز کرنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہی اس لئے جبر کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔ پس دین کے معاملہ میں جبر کرنا ناجائز ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ لا اکراه فی الدین کا حکم جنگی تعلیم کے بعد دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے قتال کے احکام اور اس کی تعلیم بیان فرمائی گئی ہے۔ پس نہ صرف اس آیت کریمہ کا مضمون بلکہ اس کا مقام بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ آیت کریمہ جبر و اکراه کی ممانعت کے لئے نازل ہوئی ہے۔

مذہبی اعتقاد کی بنا پر تکلیف دینا انبیاء کے دشمنوں کا شیوہ ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں گزشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کے تذکرے اس لئے بیان فرمائے ہیں کہ ہم ان سے عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (يوسف: 112)

ان لوگوں کے ذکر میں عقلمندوں کے لئے ایک عبرت کا نمونہ موجود ہے۔

پس اللہ تعالیٰ اپنی پاک کتاب میں مومنوں کا حال بھی بیان کرتا ہے اور کفار کا بھی، اور اس بیان سے منشاء یہ ہے کہ ہم مومنوں کے نمونہ پر چلیں اور ان راہوں سے پرہیز کریں

جن پر مومنوں کے دشمن ہمیشہ قدم مارتے چلے آئے۔ گذشتہ لوگوں کے جن کاموں کی اللہ تعالیٰ تحسین فرماتا ہے وہ نیک کام ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں اختیار کریں اور گذشتہ قوموں کے جن افعال کو اللہ تعالیٰ ظلم قرار دیتا ہے وہ کام ہمیشہ ظلم ہی سمجھے جائیں گے اور جو شخص ان کا ارتکاب کرے گا خواہ وہ کافر کہلاتا ہو یا اپنی تینوں مومن کا خطاب دیتا ہو وہ خدا کے نزدیک ظالم ہے۔ ظلم ہمیشہ ظلم ہے خواہ اس کا مرتکب زید ہو یا بکر۔ اگر مذہبی عقائد کے لئے کسی کو دکھ دینا کفار کے لئے ایک ظلم ہے تو مسلمانوں کے لئے بھی ایسا کرنا ظلم ہے۔ خدا تعالیٰ نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ مذہبی تبدیلی پر کفار کے لئے تو یہ ظلم ہے کہ وہ کسی کو تکلیف دیں مگر مومنوں کے لئے ایسا کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ یہ بالکل انصاف سے بعید ہے کہ کفار ایک کام کریں جو ظلم کہلائے اور بعینہ وہی کام مومن کریں تو وہ نہ صرف جائز سمجھا جائے بلکہ ضروری قرار دیا جائے۔

فرض کرو ایک ہندو ریاست ہے اور اس کا راجہ ایک خود مختار حاکم ہے جس نے یہ قانون جاری کر رکھا ہے کہ جو شخص ہندو مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کرے اسے فوراً قتل کر دیا جائے، اب بتائیے ہندو راجہ کا یہ فعل ظلم ہے یا نہیں؟ کیا تمہاری کائنات اس بات کی شہادت نہیں دیتی کہ وہ راجہ بڑا ہی ظالم اور سفاک ہے جو اسلام لانے پر لوگوں کو قتل کر دیتا ہے؟ کیا تم یہ نہیں کہو گے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک درندہ ہے؟ کیا تم اس کے فعل کو ایک وحشیانہ فعل نہیں کہو گے؟ کیا تمہاری فطرت اس کے خلاف جوش میں نہیں آئے گی؟ اور کیا تمہاری طبیعت نفرت اور غضب سے نہیں بھر جائے گی؟ کیا تم اس کے فعل پر اظہارِ نفرت نہیں کرو گے؟ میں اس سے بھی اتر کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر وہ راجہ اپنی رعایا کے لوگوں کو اس لئے قتل کرتا ہے کہ وہ آریہ مذہب اختیار کرتے ہیں یا مسیحی تثلیث اور کفارہ پر ایمان لا کر بپتسمہ لیتے ہیں تو مجھے سچ بتاؤ تم اس کے اس فعل کو کیسا سمجھو گے؟ تم اپنی ضمیر کو جگا کر پوچھو جو ضرور یہی فتویٰ دے گی کہ وہ راجہ ایک ظالم انسان ہے اور اس کا اس لئے

لوگوں کو قتل کرنا کہ وہ کیوں ہندو مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں جو سخت سنگدلی اور پرلے درجہ کی بے رحمی ہے۔ اس کو کوئی حق نہیں کہ لوگوں کے مذہب کے معاملہ میں دخل دے۔ کسی مذہب کے قبول کرنے یا نہ قبول کرنے کے بارے میں اسے چاہیے تھا کہ وہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیتا تا جس مذہب کو وہ سچا سمجھتے اسے اختیار کرتے۔

پس میں پوچھتا ہوں کہ جو بات دوسروں کے لئے ناجائز ہے وہ تمہارے لئے کس طرح جائز ہوگی؟ یہ کیونکر ہوا کہ جس بات کو تم دوسرے لوگوں کے لئے ظلمِ عظیم کہتے تھے اور جس کو سُن کر تمہارے چہرے سرخ ہو جاتے تھے اور تمہاری آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا وہ تمہارے لئے کیوں عین صواب ہو گیا؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک فعل کو جب دوسرے لوگ کریں تو وہ نہایت ہی وحشیانہ فعل اور خونخواری کہلائے اور جب تم اسی کام کو کرو تو وہ نہایت مہذبانہ اور شریفانہ ہو جائے؟ آج اگر کوئی ہندو ریاست ایسے لوگوں کو جو جنم کے ہندو ہوں اور بعد میں اسلام لے آئیں گرفتار کرنا اور پھر سنگسار کرنا شروع کر دے تو کیا مولوی ظفر علی خاں صاحب ”زمیندار“ کی ایڈیٹری کی کرسی پر بیٹھ کر اس راجہ کے خلاف نہایت پُر زور پُر جوش مضمون نہیں لکھیں گے اور کیا اپنے قلم کا سارا زور اور اپنی ساری قوت بیان اس کے اس فعل کو خلاف انسانیت اور ظالمانہ قرار دینے میں خرچ نہیں کر دیں گے؟ اور کیا اس کے خلاف ایک ہنگامہ قیامت برپا نہ کر دیں گے؟ لیکن اگر مولوی صاحبان کو جواب میں یہ کہا گیا کہ اس راجہ نے بالکل اسی اصول پر کام کیا ہے جس پر امیر صاحب کابل نے کیا ہے تو مولوی ظفر علی خاں صاحب دنیا کو کیا جواب دیں گے؟ کیا مولوی صاحب یہ کہیں گے کہ چونکہ امیر صاحب کابل کا مذہب سچا مذہب ہے اس لئے اس کے لئے نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے کہ جو شخص اس کے مذہب کو چھوڑے وہ اسے قتل کر دے۔ لیکن نیپال کے راجہ یا چین کی حکومت یا روس کی گورنمنٹ کا مذہب سچا مذہب نہیں ہے اس لئے اگر وہ کسی کو مذہب کی تبدیلی سے روکیں اور ایسی تبدیلی کرنے والوں کو

سنگسار کریں تو وہ ظالم ہیں۔ کیا کوئی عقلمند انسان مولوی صاحب کے اس جواب سے تسلی پا سکے گا؟ نپپال کے راجہ کو اور چین کی حکومت کو اپنے مذہب کی صداقت کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ امیر صاحب افغانستان کو یقین ہے۔ پس اگر امیر صاحب افغانستان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو سنگسار کر دیا کریں جو اس کے خیال میں اس کے مذہب سے ارتداد اختیار کریں تو نپپال کے راجہ اور گورنمنٹ چین کو بھی حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی ایسے لوگوں کو قتل کر دیا کریں جو ان کے آبائی مذہب سے ارتداد اختیار کریں۔ جس اصول پر ایک ہندو راجہ کے لئے ناجائز ہے کہ وہ کسی کو مذہب کی تبدیلی سے روکے اسی اصول پر ایک مسلمان امیر کے لئے بھی ناجائز ہے کہ وہ کسی کی تبدیلی مذہب میں مزاحم ہو۔ تم ایک ہندو راجہ کو کیوں ظالم کہتے ہو جب وہ کسی ہندو کو اسلام قبول کرنے سے روکتا ہے؟ کیا اسی لئے کہ ہندو مذہب ایک جھوٹا مذہب ہے اور اسلام ایک سچا مذہب ہے؟ کیا یہی دلیل ہے جو تم ہندو راجہ کے سامنے یا عقلمند طبقہ کے سامنے اس کے ظلم کو ثابت کرنے کے لئے پیش کرو گے؟ کیا تم ہندو راجہ کو یہ کہو گے کہ تم اس لئے ظالم ہو کہ تمہارا مذہب جھوٹا ہے اور اسلام سچا ہے اور تم لوگوں کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ جھوٹے مذہب کو چھوڑ کر سچا دین اختیار کریں؟ تم کس دلیل سے اس ہندو راجہ کا ظلم لوگوں پر اور خود اس راجہ پر واضح کرو گے؟ تم کبھی اپنی دلیل کو اس پیرایہ میں پیش نہیں کرو گے کہ کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ لوگوں کو جھوٹے دین سے سچے دین کی طرف آنے سے روکے بلکہ تم یہ کہو گے کہ کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ کسی شخص کو ایک دین سے دوسرے دین میں آنے سے روکے۔ پس اگر یہ دلیل درست ہے (اور ضرور درست ہے) تو جیسا کہ راجہ نپپال کو حق نہیں کہ وہ کسی ہندو کو عیسائی، بدھ یا مسلمان ہونے سے روکے اور ایسا کرنے والوں کو سنگسار کرے، ایسا ہی امیر صاحب کابل اور کسی اور بادشاہ کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی شخص کو محض ارتداد کی سزا میں قتل یا سنگسار کرے۔

ایسا کرنا نہ صرف اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے بلکہ اسلام کو سخت نقصان پہنچانا

ہے۔ کیونکہ اگر ایک مسلمان بادشاہ کسی شخص کو محض اس لئے قتل اور سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے کہ اس نے ایک غیر مذہب اختیار کیا ہے تو غیر مذہب کی سلطنتیں اس کے مقابل میں ان لوگوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گی جو ان کی رعایا میں سے اسلام قبول کرنا چاہیں گے اور کسی اسلامی مبلغ کو اجازت نہیں دیں گی کہ ان کے علاقہ میں قدم بھی رکھے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کی اشاعت رک جائے گی۔

پس مرتدین کے لئے محض ارتداد کی سزا میں قتل کا فتویٰ دینے والے نہ صرف قرآن شریف کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ اسلام کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ اسلام کے دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں۔ خدا تعالیٰ اسلام کو ایسے دوستوں کے ہاتھوں سے بچائے۔ آمین۔ تم آمین!

قرآن شریف کو اول سے آخر تک پڑھ جاؤ۔ تم یہ تو جابجا لکھاؤ، ادیکھو گے کہ خدا کے نبیوں کے دشمن بڑے ظالم تھے۔ وہ دین کے معاملہ میں جبر سے کام لیتے تھے اور جبراً لوگوں کا اپنا دین چھوڑنے سے روکتے تھے لیکن یہ تم کہیں بھی لکھاؤ، انہ پاؤ گے کہ مومنوں کی جماعتیں بھی جبر سے کام لیتی تھیں اور جو لوگ سچے دین سے منہ پھیر کر بت پرستی یا شرک کی طرف یا کسی اور گمراہی کی راہ یا جھوٹے دین کی طرف رجوع کرتے تھے ان کو مومن قتل اور سنگسار کر دیا کرتے تھے۔ سارے قرآن شریف کو پڑھ جاؤ تم کوئی ایسی مثال نہیں پاؤ گے۔ پھر تم قرآن شریف میں یہ تو لکھاؤ، اپاؤ گے کہ انبیاء کے دشمن بڑے ظالم تھے کیونکہ وہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام لیتے تھے لیکن یہ کہیں نہیں لکھاؤ، اپاؤ گے کہ مسلمانوں کے لئے نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے کہ وہ جبر و اکراہ سے کام لیں بلکہ برخلاف اس کے ہم قرآن شریف میں یہ کھلا کھلا اور صریح اعلان دیکھتے ہیں کہ

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرة: 257)

کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں۔

آؤ ہم قرآن شریف کی طرف رجوع کریں اور گزشتہ امتوں کے حالات کا جو ہمارے لئے بطور سبق بیان کئے گئے ہیں مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ مذہب کی تبدیلی پر دکھ دینا کن لوگوں کا شیوہ رہا ہے؟ مومنین کا یا کفار کا؟ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر بڑے بڑے نبی اور رسول گذرے ہیں میں ان میں سے اکثر کے حالات کو آپ کے سامنے رکھتا ہوں تا آپ کو معلوم ہو کہ امراء کا بل نے نعمت اللہ خان مرحوم اور دیگر شہداء جماعت احمدیہ کو سنگسار کر کے کس گروہ میں اپنی تئیں داخل کیا ہے اور کس جماعت کے نقش قدم پر گامزن ہوئے ہیں؟

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلا اولوالعزم جن کا ذکر قرآن شریف میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مجھے قبول کرو۔ اور پھر فرماتے ہیں:-

إِنَّا إِنَّا لَنَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۱۱۶﴾ (الشعراء: 116)

میں تو لوگوں کو صاف طور پر ڈرانے والا ہوں اور بس۔

میرا یہ کام نہیں کہ میں کسی کو جبراً اپنے دین میں داخل کروں۔ مگر ان کی قوم کہتی ہے۔

لَئِن لَّمْ تَنْتَهِ يَبُوءُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿۱۱۷﴾ (الشعراء: 117)

اے نوح! اگر تم اپنے اس نئے مذہب سے باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

اب دونوں کے طریق کا مقابلہ کرو۔ حضرت نوح علیہ السلام تو اپنی قوم کو اپنے نئے

پیغام کی طرف بلاتے ہیں اور فرماتے ہیں میرا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے اور بس۔

مگر ان کی قوم ان کو سنگساری کی دھمکی دیتی ہے۔ اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ ان

دونوں راہوں میں سے کون سی راہ خدا کی رضا کی راہ ہے اور کون سی راہ وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے

نزدیک بُری ہے اور غضب الہی کو بھڑکاتی ہے۔ اور آپ ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ فرمائیں کہ ان

دونوں میں سے کونسی راہ ہے جو امراء اور علماء کا بل نے اختیار کی؟

پھر حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو بڑا عظیم الشان نبی دنیا میں آیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ آؤ ہم دیکھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رویہ کیسا تھا اور ان کی قوم نے کیسا رویہ اختیار کیا؟ اور پھر اس بات کا فیصلہ کریں کہ اس زمانہ کے مسلمان ان دونوں رویوں میں سے کس رویہ کو اختیار کر رہے ہیں اور امیر کابل نے کونسا رویہ اختیار کیا، ابراہیمی یا نمرودی؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک نوجوان آدمی ہیں جو اپنی قوم کے جھوٹے معبودوں کے عجز اور بے بسی کو ظاہر کرنے کے لئے ان بتوں کو توڑتے ہیں جن کا متولی ان کا اپنا خاندان تھا اور ان کی قوم کے لوگ ٹوٹے ہوئے بتوں کا نظارہ دیکھ کر غضب میں آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کس نے ہمارے بت توڑے؟ وہ بڑا ہی ظالم اور بالفاظ مولوی ظفر علی خاں صاحب بڑا ہی ”مفسد“ اور ”شریر النفس“ انسان ہے۔ اس پر بعض نے پتا دیا اور کہا

سَمِعْنَا قَتْلَیْہِمْ یَذْکُرْہُمْ یُقَالُ لَہٗ اِبْرٰہِیْمٌ ﴿۶۱﴾ (الانبیاء: 61)

وہ نوجوان جس کو ابراہیم کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کو ہم نے ان بتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے۔

اور پھر وہ نوجوان اپنی قوم کے بزرگوں کے سامنے بلایا جاتا ہے اور سوال و جواب میں جب وہ لوگ لاجواب اور شرمندہ ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں:-

حَرِّقُوْہُ (الانبیاء: 69)

یعنی اس نوجوان کو آگ میں ڈال کر جلا دو۔

اسی طرح حضرت ابوالانبیاء کے اب آزر اپنی شفقت کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:-

لَیْسَ لَہٗ تَنْتَہٗ لَا رَجْمَنَّکَ (مریم: 47)

اگر تو اپنے اس نئے مذہب سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔

اب دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا راہ اختیار کی اور ان کی قوم نے کیا طریق اختیار کیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اپنی قوم کو ان کی اعتقادی اور عملی کمزوریوں پر متنبہ کرتے ہیں مگر ان کی قوم ان کو آگ میں جلانے کا فیصلہ کرتی ہے اور ان کے اب آزر سنگسار کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

پھر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے زمانہ کی طرف آؤ اور دیکھو وہاں ہمیں کیا نظارہ نظر آتا ہے حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کو تو حکم ہوتا ہے۔

اِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۖ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ
يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ﴿٤٤﴾ (طہ: 44، 45)

دونو فرعون کے پاس جاؤ۔ اس نے بہت سراٹھا رکھا ہے۔ پھر اس سے نرمی سے بات کرو شاید وہ سمجھ جائے یا ڈرے۔

اس کے مقابل میں فرعون اور اس کی قوم کا عمل دیکھو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ
وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ ۗ وَمَا كَيْدُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۖ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
ذُرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ۗ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَنْ
يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ ﴿٢٦﴾ (المؤمن: 26، 27)

غرض کہ جب موسیٰ ہماری طرف سے حق لے کر فرعون، ہامان وغیرہما کے پاس آئے تو انہوں نے حکم دیا کہ جو لوگ موسیٰ کے ساتھ ایمان لے آئے ہیں ان کے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالو اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو، اور کافروں کی تدبیریں تو آخر کار سب غلط ہی ہو جاتی ہیں اور فرعون نے (اپنے درباریوں سے) کہا کہ مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور وہ اپنے پروردگار کو اپنی امداد کے لئے بلائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ

تمہارے دین کو الٹ پلٹ کر ڈالے یا ملک میں فساد نکال کھڑا کرے۔

پھر ان لوگوں کو مخاطب کر کے جو حضرت موسیٰ کا نشان دیکھ کر

ان پر ایمان لائے فرعون کہتا ہے: - إِنَّ هَذَا لَمَكْرٌ مَّكْرُتُمُوهُ فِي
الْمَدِينَةِ لَتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿١٢٤﴾ لَا قِطْعَانَ أَيْدِيكُمْ
وَأَرْجُلِكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَا صَلْبَتِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٢٥﴾ قَالُوا إِنَّا إِلَى رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ﴿١٢٦﴾
وَمَا نَتَّقُكُمْ مِّثْلًا إِلَّا أَنْ أَمَّا بِإِيَّتِي رَبِّنَا لَمَّا جَاءَنَا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوْفِقَنَا
مُسْلِمِينَ ﴿١٢٧﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَدْرُمُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيَفْسِدُوا
فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَالْيَهْتَكِ ۗ قَالَ سَنَقْبَلُنَّ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَسَتَسْجِي
نِسَاءَهُمْ ۗ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٨﴾ (الاعراف: 124-128)

”ہونہ ہو یہ تمہارا ایک فریب ہے، کہ شہر میں آ کر یہ پا کھنڈ مچایا ہے تاکہ یہاں کے لوگوں کو اس شہر سے نکال دو۔ سو تم کو اپنے کئے کا نتیجہ بھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا۔ میں تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں الٹے کٹواؤں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم کو تو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور تو نے ہم میں قصور کیا پایا ہے صرف یہ کہ جب ہمارے پروردگار کے نشان ہمارے سامنے ظاہر ہوئے تو ہم ان پر ایمان لے آئے اور اب ہماری بس یہی دعا ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر اٹھیل دے اور اپنی فرمانبرداری ہی کی حالت میں ہم کو اس دنیا سے اٹھالے۔ اور فرعون کے لوگوں میں سے سرداروں نے فرعون سے کہا کہ کیا آپ اسے اور اس کی قوم کے لوگوں کو اسی حال پر رہنے دیں گے کہ ملک میں فساد پھیلاتے پھریں اور وہ آپ سے اور آپ کے معبودوں سے سرتابی کرتا رہے۔ فرعون بولا نہیں ہم ابھی ان کے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ماریں گے اور ان کی عورت ذات کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر ہر طرح سے غالب ہیں۔“

متذکرہ بالا واقعات کو ان واقعات پر جو آج کل سرزمین کابل میں ظہور پذیر ہوئے ہیں چسپاں کرو اور بتاؤ کہ مومنین کے حالات کس جماعت پر چسپاں ہوتے ہیں اور کس نے فرعون کا پارٹ ادا کیا؟ کن نوجوانوں نے وہ ثبات اور جان نثاری دکھائی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مومنین نے دکھائی تھی اور کس گروہ نے ان سے وہ سلوک کیا جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون اور اس کے سرداروں نے مومنین سے کیا تھا؟

یہ واقعات قرآن شریف میں اس لئے بیان کئے گئے تھے کہ مسلمان ان سے عبرت حاصل کریں اور وہ راہ اختیار نہ کریں جو پہلے زمانوں میں متکبر اور سرکش اور اپنی طاقت پر گھمنڈ رکھنے والے لوگ کیا کرتے تھے۔ مگر ہائے افسوس! بجائے اس کے کہ وہ ان واقعات سے عبرت حاصل کر کے دشمنانِ حق کی راہوں سے اجتناب کرتے انہوں نے وہی راہ اختیار کی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں نمرود نے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون اور اس کے سرداروں نے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں یہود کے فریسیوں اور فقہوں نے اختیار کی تھی۔

پھر میں کہتا ہوں کہ کابل کے سرداروں اور اراکین نے احمدی جماعت کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا ہے جو مکہ کے عمائد نے صحابہؓ کی غریب جماعت کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مہاجرین کی نسبت فرماتا ہے:-

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَآخَرُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِ

(ال عمران: 196)

پس جن لوگوں نے ہمارے لئے اپنے دیس چھوڑے اور ہماری وجہ سے اپنے گھروں سے نکالے گئے اور دکھ دیئے گئے۔

یہ آیت اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ غریب مسلمانوں کو عمائد مکہ نے اس قدر دکھ دیئے اور ان پر اس قدر ظلم کئے کہ وہ اپنے گھروں سے

نکلنے پر مجبور ہو گئے اور وہ اپنا مال و اسباب اور اپنے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر اپنی جان بچانے کے لئے مکہ سے بھاگ گئے۔

جو غریب، بوڑھے، عورتیں اور بچے پیچھے رہ گئے جو بھاگنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے ان کے بڑھاپے اور ان کی بے کسی اور ان کی عورت ذات ہونے پر بھی ان کو رحم نہ آیا اور ان پر ظلم و تعدی کا ہاتھ دراز کیا۔ چنانچہ وہ خدا کے آگے نہایت عجز و انکسار سے زاری کرتے تھے اور چیختے تھے اور گڑگڑاتے ہوئے کہتے تھے:-

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۗ وَاجْعَلْ لَنَا
مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۗ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿٧٦﴾ (النساء: 76)

اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس بستی یعنی مکہ سے کہیں نجات دے جہاں کے رہنے والے ہم پر ظلم کر رہے ہیں اور خود ہی اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور خود ہی اپنی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار بنا۔

جو لوگ عمائد مکہ کے ظلم و ستم سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے ان کا پیچھا بھی سرداران مکہ نے نہ چھوڑا اور چاہا کہ تلوار سے ان کو صفحہ ہستی سے مٹادیں یا وہ مجبور ہو کر اپنی جان بچانے کے لئے اپنے نئے مذہب سے تائب ہو کر واپس اپنے آبائی مذہب میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ
اِنْ اسْتَطَاعُوا (البقرة: 218)

اور یہ کفار سدا تم سے لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تم کو تمہارے دین سے واپس اپنے مذہب میں پھیر لیں۔

غرض تمام مذہبی تاریخ کو دیکھو تمہیں ایک ہی نظارہ نظر آئے گا کہ حق کے نتیجے کبھی کسی کو مذہبی عقائد کی وجہ سے دکھ دیتے ہوئے نہیں دیکھے جائیں گے۔ لیکن ہر زمانہ میں ہم

دیکھتے ہیں کہ حق کے دشمن ہمیشہ خدا کے راستبازوں کو دکھ دیتے ہیں اور ہمیشہ ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوت و بازو کے زور سے راستبازوں کو یا تو فنا کر دیں یا ان کو مجبور کریں کہ وہ حق سے توبہ کریں۔ کوئی ایک مثال بھی تم ایسی پیش نہیں کر سکتے جبکہ راستبازوں کی جماعت نے دین کے معاملہ میں کسی پر جبر کیا ہو۔

پس مذہبی خیالات کی وجہ سے کسی کو دکھ دینا اور اس کو مجبور کرنا کہ وہ فلاں قسم کے خیالات قبول کرے خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک ظلم ہے اور جو بھی اس فعل کا مرتکب ہو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ظالم اور جبار ہے اور خدا تعالیٰ کے آگے اپنے فعل کا جواب دہ ہے خواہ وہ ریاست کا بل کا امیر ہو یا ملک مصر کا فرعون، خواہ وہ لاہور کا ظفر علی خاں ہو یا وادی مکہ کا ”ابوالحکم“۔

مرتدین کے سوال کا فیصلہ منافقین کی مثال سے

یہ ظاہر ہے کہ جو شخص قتل کے خوف سے اسلام نہیں چھوڑے گا یا قتل کے ڈر سے ارتداد کے بعد پھر اسلام قبول کرے گا ایسا شخص دل سے مسلمان نہیں ہوگا بلکہ اس کا دل کافر ہوگا اور صرف زبان سے اسلام کا اقرار کرے گا۔ ایسا شخص اسلام کی اصطلاح میں منافق کہلائے گا۔ اس لئے منافق کے متعلق قرآن شریف کی تعلیم پر غور کرنے سے ارتداد کا سوال بھی حل ہو سکتا ہے۔ اگر قرآن شریف نفاق کی اجازت دیتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت میں منافقوں کے وجود کو استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان سے ویسا ہی سلوک روا رکھتا ہے جیسا کہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ تو اس صورت میں بے شک ماننا پڑے گا کہ قتل مرتد جائز ہے۔ کیونکہ قتل مرتد کی صورت میں جو قباحتیں نظر آتی ہیں اور جو لازمی نتیجہ اس سے پیدا ہوتا ہے یعنی نفاق اور مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کے گروہ کا شامل ہو جانا ان کے متعلق خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایسی باتیں نہیں جو خدا تعالیٰ کو ناپسند ہوں بلکہ

قرآن شریف اجازت دیتا ہے اور ان امور کو استحسان اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے پس اس صورت میں قتل کی سزا مقرر کر کے لوگوں کو ارتداد سے روکنے سے کوئی حرج نہیں بلکہ یہ بہت ہی اچھی بات ہے لیکن اگر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اور خدا تعالیٰ نفاق کی اجازت نہیں دیتا بلکہ نفاق کو کفر سے بھی بدتر قرار دیتا ہے اور ان سے وہ برتاؤ نہیں کرتا جو دوسرے مسلمانوں سے کیا جاتا ہے اور اس بات کو پسند کرتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت ایسے لوگوں کے وجود سے پاک رہے اور اللہ تعالیٰ ضرور خود ایسے ذریعے پیدا کرتا ہے کہ اسلام کا وجود نفاق کی حبث سے پاک رہے۔ تو اس سے لازمی طور پر نتیجہ نکلتا ہے کہ مرتد کو محض ارتداد کی سزا میں قتل کرنا اسلام کی رو سے ناجائز ہے کیونکہ اس سے نفاق پیدا ہوتا ہے اور اسلام کا خدا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت منافقین کے حبث سے بکلی پاک رہے۔ پس آؤ ہم اب قرآن شریف کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ اسلام میں منافقین کی کیا حیثیت ہے۔ قرآن شریف میں ہمیں منافقین کے بارے میں مندرجہ ذیل قرآنی آیات اور اسی رنگ کی دوسری آیات نظر آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ (النساء: 139)

اس آیت کا ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔
(اے پیغمبر) منافقوں کو خوشخبری سنا دو کہ ان کو آخرت میں دردناک عذاب ہونا ہے۔

پھر اسی رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا۔ (النساء: 141)

اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں سب کو دوزخ میں جمع کر کے رہے گا۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے صرف یہی نہیں کہ منافقین کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو کفار کے ساتھ کیا جائے گا اور ان کو بھی کفار کی طرح دوزخ میں ڈالا جائے گا بلکہ منافق دوزخ کے سب سے نیچے کے درجے میں ہوں گے۔ یعنی وہ اشد ترین عذاب

میں مبتلا ہوں گے اور اکثر کفار سے بھی زیادہ ان کو عذاب دیا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الذَّرِكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 146)

”اس میں شک نہیں کہ منافق دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے۔“
اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند نہیں فرماتا کہ منافق مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ منافقوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:-

قَارِنٌ رَّجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ

لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا (التوبة: 83)

”اے پیغمبر! اگر خدا تم کو (جہاد پر سے) ان منافقوں کے کسی گروہ کی طرف لوٹا کر لے جائے اور پھر کبھی یہ لوگ جہاد کے لئے نکلنے کی تم سے اجازت چاہیں تو تم ان سے کہہ دینا کہ تم نہ تو کبھی میرے ساتھ جہاد کے لئے نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے لڑو گے۔“

پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ منافقین کے گروہ کو اطلاع

دیتا ہے:-

قُلْ أَنْفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَنْ يُتَقَبَلَ مِنْكُمْ ۗ إِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا

فَاسِقِينَ ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقَبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ

كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ وَالْيَاثُوبُ مِنَ الصَّلَاةِ إِلَّا وَهُمْ كَسَالِي

وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَرِهُونَ ﴿۵۵﴾ (التوبة: 53-54)

”اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہو کہ تم خوش دلی سے خرچ کرو یا بے دلی سے تمہاری خیرات تو کسی طرح قبول ہونی نہیں کیونکہ تم نافرمان لوگ ہو اور ان کی خیرات کے قبول ہونے کی

اور کوئی وجہ مانع نہیں ہوئی، مگر یہی کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور نماز کو آتے ہیں تو سخت سستی کی حالت میں اور راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں انتہائی بددلی سے۔“

پھر اللہ تعالیٰ منافقین کے متعلق اپنے غضب کا اظہار اس طرح کرتا ہے:-
سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ لَنْ يَغْفِرَ

اللَّهُ لَهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿٧﴾ (المنافقون: 7)

ان لوگوں کے لئے تم دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو ان کے حق میں دونوں باتیں یکساں ہیں۔ خدا تو ان کے گناہ معاف کرنے والا ہے، ہی نہیں۔ بے شک خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

پھر اللہ تعالیٰ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حکم دیتا ہے:-

وَلَا تَصِلْ عَلَىٰ أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ۗ إِنَّهُمْ

كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَأْوَاهُمُ الْفِسْقُونَ ﴿٨٤﴾ (التوبة: 84)

” (اے پیغمبر!) اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو تم ہرگز ان کے جنازہ پر نماز نہ پڑھنا اور نہ ان کی قبر پر جا کر کھڑے ہونا کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور سرکشی کی حالت میں مر گئے۔“

پھر اللہ تعالیٰ ہر سال ایک یا دو مرتبہ منافقوں کے لئے ایسے سامان پیدا کرتا جن سے ان کا نفاق ظاہر ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کی اس سے یہ غرض تھی کہ ان کا نفاق ظاہر ہو کر یہ لوگ مسلمانوں سے ممتاز ہو جائیں اور جب ان کا نفاق کھل جائے گا اور مومنوں پر ظاہر ہو جائے گا کہ فلاں فلاں شخص منافق ہے تو وہ ہوشیار ہو جائیں گے اور ان کو مومنین کی جماعت میں شامل سمجھ کر دھوکہ نہیں کھائیں گے اور اس طرح عملی طور پر ان کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی جماعت سے خارج کرتا رہتا اور مومنین کے گروہ کو ان کے خبث سے پاک کرتا رہتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

أُولَٰئِكَ يَرْوُونَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ

لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾ (التوبة: 126)

”کیا یہ لوگ اتنی بات بھی نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش کی آگ میں ڈالے جاتے ہیں تاکہ رے اور کھوٹے میں تمیز ہو جائے۔ اس پر بھی نہ تو توبہ ہی کرتے ہیں اور نہ نصیحت ہی پکڑتے ہیں۔“

اس آیت کریمہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا تھا کہ منافق اور مومن ملے جلے رہتے اس لئے وہ ایسے سامان پیدا کر دیتا کہ منافقین کا نفاق ظاہر ہو جاتا اور اس طرح وہ عملی طور پر مسلمانوں کی خالص جماعت سے الگ ہو جاتے اور مسلمان ان کے میل جول کے بد اثر سے محفوظ ہو جاتے۔

پس قرآن شریف میں منافقین کا ذکر کثرت کے ساتھ موجود ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے غضب کا مورد ظاہر کیا گیا ہے اور غالباً کفار کی برائی بھی ایسے زور سے بیان نہیں کی گئی جیسی کہ منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے۔ ان آیات کریمہ کی موجودگی میں کوئی عقلمند اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم دے جس کے نتیجے میں منافقین لوگ اسلام میں داخل ہوں۔ اللہ تعالیٰ تو منافقوں کو مسلمانوں میں سے خارج کرتا ہے تا مسلمانوں کی جماعت ان کے بد اثر سے آلودہ نہ ہو اور وہ ایسے خبیث لوگوں سے پاک اور صاف رہے اور وہ ایسے حکم دیتا ہے جن کے ذریعہ منافق، مسلمانوں سے الگ ہو جائیں اور وہ ان میں مل جل کر نہ رہ سکیں۔ لیکن ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک ایسا حکم دے رکھا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی جان کے خوف سے باوجود بے ایمان ہونے کے مسلمانوں میں ملے جلے رہیں۔ ان کے دل میں کفر ہو مگر وہ یہ ظاہر کرتے رہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور اس طرح مسلمانوں میں منافقوں کا گروہ ہمیشہ قائم رہے۔ قرآن شریف تو ایسے لوگوں کو دھکے دے دے کر مسلمانوں کی جماعت میں سے باہر نکالتا ہے اور

مسلمانوں کو ایسے خبیث لوگوں سے پاک اور صاف رکھنا چاہتا ہے۔ مگر قتل مرتد کے حامی چاہتے ہیں کہ اسلام ایسے گند سے کبھی پاک نہ ہو اور منافقوں کا ناپاک اور خبیث گروہ ضرور مسلمانوں میں ہر وقت موجود رہنا چاہیے اور اگر کبھی کوئی فرد اس گروہ کا مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہونا چاہے تو اس کو قتل کا خوف دے کر جبر سے دوبارہ مسلمانوں کی جماعت میں داخل کرنا چاہیے تا یہ گند ضرور مسلمانوں میں موجود رہے۔

پس دیکھو قرآن شریف کی تعلیم میں اور ان لوگوں کے خیالات میں کس قدر بُعد اور دُوری ہے۔ قرآن شریف کہتا ہے ان لوگوں کو نکالو۔ مگر یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کو بجائے باہر نکالنے کے پھر لوٹا کر مسلمانوں میں داخل کریں۔ یہیں تفاوت راہ از کجا است تا بہ کجا۔ منافقین کی مثال قتل مرتد کے سوال کو ایک اور پہلو سے بھی حل کر دیتی ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ منافقین کو بھی مرتد ہی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:-

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ
وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ (التوبة: 74)

”یہ (منافق) اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے تو یہ (بیجا) بات نہیں کہی حالانکہ ضرور انہوں نے کفر کا کلمہ کہا اور اسلام لائے پیچھے کافر ہوئے۔“
پھر منافقین کی نسبت فرماتا ہے:-

لَا تَعْتَدِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ (التوبة: 66)

”باتیں نہ بناؤ حق تو یہ ہے کہ تم ایمان لائے پیچھے کافر ہو گئے۔“

پھر سورۃ منافقون میں اللہ تعالیٰ منافقوں کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے:-

اتَّخَذُوا اٰيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللّٰهِ ۗ اِنَّهُمْ سَاءَ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطَجَعَ عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ قَهْرٌ ۙ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ (المنافقون: 4، 3)

”ان لوگوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے ہیں۔ نہایت ہی برے کام ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ پہلے ایمان لائے پھر اسلام سے پھر گئے یہاں تک کہ ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی تو اب یہ حق بات کو سمجھتے ہی نہیں۔“

پھر منافقین کی نسبت اللہ تعالیٰ یہی نہیں فرماتا کہ یہ لوگ ایمان اور اسلام لانے کے بعد پھر کافر ہو گئے بلکہ ان کی نسبت خود ارتداد کا لفظ بھی استعمال فرماتا ہے۔ چنانچہ آتا ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ أَزَلَّوْا عَلَىٰ أَذْبَارِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ ۖ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ۖ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ ۗ (محمد: 26، 27)

”بے شک جن لوگوں کو دین کا راستہ صاف طور پر معلوم ہوا اور پھر بھی وہ اپنے اٹلے پاؤں پھر گئے شیطان نے ان کو جتے دیئے اور ان کی آرزوؤں کی رسیاں دراز کر دی ہیں اور یہ ان لوگوں کا ارتداد اس سبب سے ہے کہ جو لوگ (قرآن کو) جو خدا نے اتارا ناپسند کرتے ہیں (مثلاً یہود) یہ منافق ان سے کہا کرتے ہیں کہ بعض باتوں میں ہم تمہاری صلاح پر چلیں گے اور اللہ ان کی سرگوشیوں کو خوب جانتا ہے۔“

غرض منافقین کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں اور ارتداد کے مرتکب ہوتے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ مرتد قرار دے ان کے ارتداد میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اب اگر یہ بات درست ہے کہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرنے والوں اور ارتداد کرنے والوں کی سزا اسلام میں قتل مقرر کی گئی ہے تو ضروری ہے کہ منافقین کی سزا بھی قتل ہی ہو۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ منافقین کی سزا اسلام میں قتل مقرر کی گئی ہے تو ہم اس بات کو بڑی خوشی سے قبول کر لیں گے کہ واقعی مرتد کی سزا قتل ہے۔ لیکن اگر برعکس اس کے یہ ثابت ہو کہ منافقین کی نسبت قرآن شریف قتل کا حکم نہیں دیتا اور جن لوگوں کا نفاق سب پر واضح ہو چکا تھا اور جن کے نفاق کے متعلق خدا نے گواہی دے دی تھی ان کو

قتل کی سزا نہیں دی گئی تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے۔
 اس امر کے فیصلہ کے لئے جب ہم قرآن شریف کی طرف رجوع کرتے ہیں تو
 صاف نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی یہ حکم نہیں دیا کہ منافقین کو قتل کی سزا دی
 جائے۔ برخلاف اس کے قرآن شریف کی آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کو اجازت نہ
 تھی کہ ان پر قتل کے لئے ہاتھ اٹھائے بلکہ وہ اپنی طبعی موت تک زندہ رہنے دیئے جاتے۔
 چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّا تَابَ أَوْ لَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهٖ ۗ إِنَّهُمْ
 كَفَرُوا بِإِلٰهِهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَسِقُونَ ﴿۸۵﴾ وَلَا تَحْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ
 وَأَوْلَادُهُمْ ۗ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَآفِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ
 أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۸۶﴾ (التوبة: 84، 85)

”(اے پیغمبر!) ان میں سے اگر کوئی مر جائے تو اس پر نماز جنازہ نہ پڑھا کر اور نہ اس کی قبر
 پر دعا کے لئے کھڑا ہوا کر۔ کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور ایسی حالت
 میں مرے ہیں جبکہ وہ اطاعت سے خارج ہو رہے تھے۔ اور ان کے مال اور ان کی اولاد تجھے
 تعجب میں نہ ڈالیں۔ اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ان مالوں اور اولادوں کے ذریعہ سے ان کو اس
 دنیا میں عذاب دے اور یہ کہ ان کی جانیں ایسے وقت میں نکلیں کہ وہ منکر ہی ہوں۔“

ان آیات سے ظاہر ہے کہ منافقین کے لئے جن کو اللہ تعالیٰ مرتد قرار دیتا ہے قتل کی
 سزا نہ تھی کیونکہ اگر ان کی نسبت یہ حکم ہوتا کہ چونکہ انہوں نے اسلام کے بعد کفر اختیار کیا
 ہے اس لئے ان کو قتل کر دو تو پھر یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو
 اس کا جنازہ نہ پڑھنا۔ نیز ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارتداد کے بعد بظاہر
 لوگوں کی نظر میں وہ خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے پاس بہت سا مال و دولت
 اور بہت سی اولاد ہوتی تھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ باوجود ارتداد کے وہ اپنے حال پر چھوڑ دیئے جاتے اور لوگوں کی نظر میں مزے کی زندگی بسر کرتے یہاں تک کہ مسلمان بھی تعجب کرتے کہ یہ دنیاوی برکت ان کے پاس کیوں ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ

فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُنْفِقُوا مَعِيَ عَدْوًا (التوبة: 83)

”(اے پیغمبر) تو ان سے کہہ دے کہ تم کو کبھی بھی میرے ساتھ جنگ پر جانے کی اجازت نہیں ہوگی اور کبھی بھی تم میرے ہمراہ ہو کر دشمن سے جنگ نہیں کرو گے۔“ ظاہر کرتا ہے کہ ان مرتدین کے لئے قتل کا حکم نہیں تھا کیونکہ اگر ان کے لئے قتل کی سزا مقرر ہوتی تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ آئندہ نہ تو تم کبھی میرے ساتھ جہاد کے لئے نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے لڑو گے۔ اسی طرح اگر ان مرتدین کے لئے قتل کی سزا مقرر تھی تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

قُلْ أَنْفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَنْ يُتَقَبَلَ مِنْكُمْ ۖ إِنَّكُمْ كُنْتُمْ

إِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فَسِيقِينَ ﴿٥٦﴾ (التوبة: 53)

”(اے پیغمبر) تو ان سے کہہ دے کہ خواہ خوشی سے خرچ کرو خواہ ناخوشی سے، تم سے کسی صورت میں تمہارا صدقہ قبول نہ کیا جائے گا کیونکہ تم تو اطاعت سے نکل جانے والی قوم ہو۔“ اسی طرح تاریخ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ منافقین کے لئے قتل کی سزا مقرر نہیں تھی اگر منافقین کی نسبت قتل کی سزا مقرر ہوتی تو اس سزا کا سب سے زیادہ مستحق عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جو مدینے کی منافق پارٹی کا سرغنہ تھا اور جس کا نفاق کسی پر مخفی نہیں تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ آپؐ کی خدمت مبارک میں اس کے قتل کے متعلق کئی مرتبہ تحریک بھی کی گئی پھر بھی آپؐ نے اس کے قتل کا حکم نہ دیا۔ خود عبداللہ بن ابی کا بیٹا بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا

إِنَّ وَالِدِي يُؤْذِي اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَاذْرَنِي حَتَّى أَقْتُلَهُ

”میرا باپ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کو ایذا دیتا ہے آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اسے قتل کر دوں۔“

مگر آپ نے ہر دفعہ اسے روک دیا پھر اس سے بڑھ کر آپ نے اس رئیس المنافقین کے ساتھ اس کے مرنے پر یہ سلوک کیا کہ آپ نے اس کے بیٹے کو اپنی قمیص عطا فرمائی تاکہ وہ اسے یہ قمیص بطور کفن پہنا دے اور پھر خود جا کر مع دیگر صحابہؓ کے اس کا جنازہ پڑھا۔ (ممانعت جنازہ کا حکم بعد میں نازل ہوا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اشد ترین منافق کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اسلام میں منافقین کے لئے قتل کی سزا مقرر نہیں ہے۔

غرض جیسا کہ قرآن شریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ منافقین کے لئے اسلام قتل کی سزا مقرر نہیں کرتا اور تاریخ سے ثابت ہے کہ منافقین کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی تھی حالانکہ قرآن شریف منافقین کو بھی مرتد قرار دیتا ہے اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ مرتدین کے لئے اسلام میں قتل کی سزا نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی صاحب یہ سوال کریں کہ اگر منافقین کے لئے قتل کا حکم نہیں تو اس آیت شریف کے کیا معنی ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ
وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَبَسَّ الْمَصِيرُ ﴿٧٣﴾ (التوبة: 73)

”کہ اے نبی! کفار اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی سے حملہ کرو۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ رہنے کے لحاظ سے بہت بُری جگہ ہے۔“

اس آیت کریمہ کی تفسیر کے لئے میرے خیال میں فتح البیان کی مندرجہ ذیل عبارت کافی ہے۔

وقال الطبري أولى الاقوال التي قول ابن مسعود لان الجهاد عبارة

عن بذل الجهد و قد دلت الآية على وجوب جهاد المنافقين وليس
 فى الآية ذكر كيفية ذلك الجهاد فلا بد من دليل اخر وقد دلت
 الدلائل المنفصلة ان الجهاد مع الكفار انما يكون بالسيف ومع
 المنافقين باظهار الحجة عليهم تارة و بترك الرفق بهم تارة
 وبالانتهاز تارة و هذا هو قول ابن مسعود . (فتح البيان جلد 4 صفحہ 134)

طبری نے کہا ہے کہ سب اقوال سے میرے نزدیک بہترین قول ابن مسعود کا ہے کیونکہ
 جہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا۔ اس آیت کریمہ سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ منافقین کے
 ساتھ جہاد کرنا واجب ہے لیکن اس آیت میں اس جہاد کی کیفیت بیان نہیں کی گئی۔ پس
 ضروری ہے کہ اس کے لئے کوئی اور دلیل ہو اور کھلے کھلے دلائل سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے
 کہ کفار کے ساتھ جہاد تو تلوار کے ساتھ ہوتا ہے اور منافقین کے ساتھ یہ ہے کہ کبھی تو
 ان پر اتمام حجت کی جائے اور کبھی نرمی کا سلوک ان کے ساتھ ترک کیا جائے اور کبھی
 ان کو زجر کی جائے اور یہی ابن مسعود کا قول ہے۔

یہاں مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کا ترجمہ اور نوٹ نقل کرنا بھی خالی از فائدہ نہ
 ہوگا۔ مولوی نذیر احمد صاحب اس آیت کریمہ کا ترجمہ حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔
 ”اے پیغمبر! کافروں کے ساتھ (ہتھیار سے) اور منافقوں کے ساتھ (زبان سے)
 جہاد کرو اور ان پر سختی کرو کہ (یہ اس سختی کے مستحق ہیں) اور (آخر کار) ان کا ٹھکانا دوزخ
 ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔“

اس ترجمہ پر حسب ذیل نوٹ لکھتے ہیں۔

”ہتھیار اور زبان کی قید ہم نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے برتاؤ سے کی ہے کہ
 منافقوں پر کبھی کافروں کا سا جہاد نہیں ہوا۔“



کیا قرآن کریم قتلِ مرتد کے سوال پر ساکت ہے؟

قتلِ مرتد کے حامی قرآن کریم میں اپنے دعویٰ کی کوئی تائید نہ پا کر بلکہ قرآن شریف کی تعلیم کو اپنے خیال کے بالکل الٹ دیکھ کر اپنے آپ کو بچانے کی اس طرح بے سود کوشش کرتے ہیں کہ قرآن شریف اس مسئلہ کے متعلق ساکت ہے۔ مگر یہ حیلہ ان کے لئے کوئی بچاؤ کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے اس قول کے دوسری لفظوں میں یہ معنی ہیں کہ جب تک ہم قرآن شریف میں ان کو یہ لکھا ہو، انہ دکھا دیں کہ مرتد کو قتل مت کرو ان کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ قرآن شریف ایک حکیم کتاب ہے وہ ہر ایک لغو کلام سے پاک ہے۔ جب قرآن شریف کی تعلیم ہی اس امر کے مخالف پڑی ہوئی ہے کہ کسی کو صرف مذہب کی تبدیلی پر قتل کیا جائے وہ باواز بلند کہہ رہی ہے۔

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (الکہف: 30)

کہ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے انکار کر دے۔

وہ اس امر کا بار بار اعلان کر رہی ہے۔

مَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا

(بنی اسرائیل: 16)

جو ہدایت کو قبول کرے گا اس کا ہدایت پانا اسی کی ذات کے فائدہ کے لئے ہے اور جو

اس ہدایت کو رد کرے گمراہ ہوگا اس کا گمراہ ہونا اسی کے نفس کے خلاف پڑے گا۔

اور جب وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہے

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ (المائدہ: 100)

رسول پر صرف بات کا پہنچانا واجب ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿۱۰۸﴾ (الانعام: 108)

(اے پیغمبر) تو ان پر نگران نہیں ہے۔

اور جب قرآن شریف نے یہ امر بطور قاعدہ کلیہ کے بیان فرما دیا ہے

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرة: 257)

کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں۔

تو ایسی کھلی کھلی تعلیم کے بعد اس امر کی کوئی ضرورت باقی نہیں تھی کہ مسلمانوں کو یہ بھی کہا جاتا کہ جو شخص تم میں سے مرتد ہو جائے اسے قتل نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن شریف کی تعلیم کے ہوتے ہوئے جب مرتد کے قتل کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا پھر اس کی تردید ہی کیوں کی جاتی۔ ایسے حالات کے ماتحت یہ کہنا کہ خبردار! مرتد کو ہرگز قتل نہ کرنا ایک لغو کلام تھا اور قرآن جیسی حکیم کتاب کی شان کے بالکل منافی تھا۔ قرآن شریف ایسی لغو کلام کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

علاوہ ازیں قرآن شریف کی دو آیات جن میں ارتداد کا ذکر ہے خود صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ مرتد کے لئے قتل کا حکم نہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ یہود کی ایک سازش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:-

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيْنَا لَنْ يُغَيِّرَ دِينَنَا

آمَنُوا وَجِهَةَ النَّهَارِ وَانكفروا الخِرَةُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۷۳﴾ (ال عمران: 73)

”اہل کتاب میں سے ایک گروہ (اپنے لوگوں کو) سمجھاتا ہے کہ مسلمانوں پر جو کتاب نازل ہوئی ہے اوّل روز اس پر ایمان لاؤ اور آخر روز اس سے انکار کر دیا کرو (شاید اس تدبیر سے) مسلمان (اس نئے دین سے) پھر جائیں۔“

اس کے جواب میں حامیان قتل مرتد فرماتے ہیں۔ یہ صرف یہود کی ایک تجویز تھی

جسے عمل میں نہیں لایا گیا اس لئے اس آیت سے استدلال نہیں ہو سکتا کہ مرتد کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر ان کی یہ جرح بالکل غلط ہے ہم ایک لمحہ کے لئے فرض کر لیتے ہیں کہ یہود کی یہ صرف ایک تجویز ہی تھی اور اس پر کبھی عمل نہیں کیا گیا پھر بھی یہ آیت اس امر کا ایک قطعی ثبوت ہے کہ مرتدین کو قتل نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی اور مرتدین کو قتل کیا جاتا تو وہ کبھی ایسی تجویز ہی نہ کر سکتے کیونکہ اس سے انہیں سوائے اپنے آدمیوں کو ہلاکت میں ڈالنے کے اور کوئی نفع نہیں تھا۔ پس ان کا ایسی تجویز کرنا خود اس امر کا یقینی ثبوت ہے کہ مرتدین کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ یہود کی نسبت یہ امید کرنا کہ وہ کسی ایسی غرض کے لئے اپنی جان کو یقینی ہلاکت میں ڈالنے کے لئے تیار تھے بالکل ناممکن ہے۔ ان کے متعلق تو قرآن شریف شہادت دیتا ہے:-

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا
يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرَ أَلْفَ سَنَةٍ (البقرة: 97)

”البتہ تم پاؤ گے کہ یہ لوگ زندگی پر سب لوگوں سے کہیں زیادہ حریص ہیں یہاں تک کہ مشرکین سے بھی (جو قیامت ہی کے قائل نہیں) ان میں سے ایک ایک چاہتا ہے کہ اے کاش اس کی عمر ہزار برس کی ہو۔“

پھر اس آیت کریمہ میں ایک اور جملہ بھی ہے جو اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ مرتدین کی سزا قتل نہیں تھی اور وہ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ہے۔ اس میں ان کی سازش کی غرض بتائی گئی ہے یعنی ایسی تجویز انہوں نے کیوں کی ان کی غرض کیا تھی؟ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ یہ تجویز انہوں نے اس لئے کی تھی کہ ان کے ارتداد کو دیکھ کر دوسرے مسلمان اسلام کے متعلق شک میں پڑ جاویں اور اسلام سے ارتداد اختیار کر لیں۔ لیکن اگر یہ دعویٰ درست ہے کہ اسلام میں مرتد کے لئے قتل کی سزا مقرر تھی تو ان کی یہ غرض پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ جب وہ جانتے تھے کہ ہر ایک مرتد کو قتل کیا جاتا ہے تو انہیں کبھی امید نہیں ہو سکتی تھی کہ ان کی

دیکھا دیکھی مسلمان بھی ارتداد اختیار کر لیں گے کیونکہ ان کے مرتد ہوتے ہی جب ان کو قتل کیا جاتا تو اس نظارہ کو دیکھ کر تو جو لوگ ارتداد کے لئے تیار ہوتے وہ بھی رک جاتے نہ کہ اور بھی ارتداد پر آمادہ ہو جاتے۔ پس اس غرض کا متعین کرنا بھی صاف ظاہر کر رہا ہے کہ مرتدین کے قتل کا کوئی حکم اسلام میں نہیں تھا۔

علاوہ ازیں روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی آئی تجویز نہیں تھی جو سرسری طور پر بعض یہود کے خیال میں آئی اور دل لگی کے طور پر انہوں نے اس کا ذکر کر دیا بلکہ مختلف تفاسیر میں ایسے لوگوں کے اسماء اور ان کی تعداد بھی مندرج ہے جنہوں نے یہ مشورہ کیا اور یہ بھی مذکور ہے کہ انہوں نے اس تجویز پر عمل کرنے کا تہیہ بھی کر لیا۔ میں یہاں صرف ایک حوالہ نقل کرتا ہوں۔ بحر المحيط جلد 2 صفحہ 493 پر لکھا ہے

قال الحسن و السدی تو اطا اثنا عشر حبرا من یہود خیبر و قری عرینة و قال بعضهم لبعض ادخلوا فی دین محمدٍ اول النہار باللّسان دون الاعتقاد و اکفروا بہ فی اخر النہار و قولوا انا نظرنا فی کتبنا و شاورنا علماءنا فوجدنا محمداً لیس کذالک و ظہر لنا کذبہ و بطلان دینہ فاذا فعلتم ذلک شک اصحابہ فی دینہم و قالوا ہم اهل الكتاب فہم اعلم منا فیرجعون عن دینہم الی دینکم فنزلت .

”یعنی حسن اور سدی بیان کرتے ہیں کہ یہود خیبر اور عرینے کی بستنیوں کے بارہ عالموں نے اتفاق کیا اور ایک دوسرے کو کہا کہ محمد (ﷺ) کے دین میں اول روز میں داخل ہو جاؤ صرف زبان سے اقرار کرو اور دل سے نہ مانو، اور آخر روز میں انکار کر دو اور کہو کہ ہم نے اپنی کتابوں کو غور سے پڑھا ہے اور اپنے علماء سے بھی مشورہ کیا ہے اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ محمد (ﷺ) سچے نبی نہیں ہیں اور ان کا کذب اور ان کے دین کا باطل ہونا ہم پر ظاہر ہو گیا ہے اور جب تم ایسا کرو گے تو محمد (ﷺ) کے ساتھیوں کو اپنے دین

میں شک پڑ جائے گا اور وہ کہیں گے یہ لوگ اہل کتاب ہیں یہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے دین سے برگشتہ ہو کر تمہارے دین کی طرف آ جائیں گے۔“

اسی مضمون کی دیگر روایات جن میں ان مشورہ کرنے والوں کے نام بھی دیئے گئے ہیں تفسیر کی دوسری کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو فتح البیان جلد 2 صفحہ 60۔ درمنثور جلد 2 صفحہ 42، 43۔ نیز خود قرآن شریف میں اس واقعہ کا ذکر کرنا اور اس کو اہمیت دینا ظاہر کرتا ہے کہ ایسے واقعات ہوتے رہے، ورنہ کیا ضرورت تھی کہ محض ایک خام خیال کو جس کا کوئی اثر نہیں تھا خواہ مخواہ قرآن مجید میں بیان کیا جاتا۔ چنانچہ صاحب بحر المحيط لکھتے ہیں

امّا امتثال الامر ممن امر به فمسكوت عن وقوعه و اسباب النزول

تدلّ علی وقوعه (بحر المحيط جلد 2 صفحہ 493)

یعنی اگرچہ قرآن شریف میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ اس تجویز پر عملدرآمد کیا گیا یا نہیں لیکن اسباب نزول اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایسا کیا گیا۔

علاوہ ازیں قرآن شریف کے دوسرے مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تجویز پر عمل کیا گیا اور قرآن کریم اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ آنحضرت پر نور کے وقت میں ایسے یہودی موجود تھے جو ایسی شرارتیں کرتے تھے۔ چنانچہ سورۃ مائدہ رکوع 9 میں اللہ تعالیٰ یہود کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:-

وَإِذَا جَاءَ وَكُفْرًا قَالُوا آمَنُوا قَدْ خَلَوْا بِالْكَفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ﴿٦٢﴾ (المائدة: 62)

”(مسلمانو!) جب یہ لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے حالانکہ کفر ہی کو ساتھ لے کر آئے تھے اور کفر ہی کو ساتھ لے کر چلے بھی گئے اور جو بات وہ دل میں چھپائے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔“

زیر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا..... الاية روح المعاني جلد 2 صفحہ 196 میں لکھا ہے۔

عن الحسن انهم طائفة من اهل الكتاب ارادوا تشكيك اصحاب رسول الله ﷺ فكانوا يظهرون الايمان بحضرتهم ثم يقولون قد عرضت لنا شبهة اخرى فيكفرون ثم يظهرون ثم يقولون قد عرضت لنا شبهة اخرى فيكفرون ويستمررون على الكفر الى الموت. و ذلك معنى قوله تعالى - وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْ اُنزِلَ عَلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجِهَ النَّهَارِ وَاکْفُرُوْا الْاٰخِرَةَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ.

حسن بصری کا قول ہے کہ آیت کریمہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ اہل کتاب کا ایک گروہ تھا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے دل میں اسلام کے متعلق شک ڈالنا چاہا اس لئے وہ ان کے پاس آ کر پہلے اپنے ایمان کا اظہار کرتے پھر کہتے ہمارے دل میں اور شبہ پیدا ہو گیا ہے۔ پھر انکار کرتے، پھر موت تک اسی انکار پر قائم رہتے اور یہی معنی ہیں اس آیت کے وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْ اُنزِلَ عَلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجِهَ النَّهَارِ وَاکْفُرُوْا الْاٰخِرَةَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۳﴾ (ال عمران: ۴۳)

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مومنوں پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے ابتدائی حصہ میں تو ایمان لے آؤ اور اس کے پچھلے حصہ میں اس سے انکار کر دو۔ شاید اسی ذریعہ سے وہ پھر جائیں۔

حسن بصری کے متعلق جن کا قول میں اوپر نقل کر چکا ہوں تہذیب التہذیب

جلد 2 صفحہ 465 میں لکھا ہے:-

”قال أيوب مارأت عيناى افقه من الحسن وقال عطاء بن ابى رباح

كان اماما ضخما يقتدي به.“

یعنی ایوب کہتے ہیں کہ میری آنکھوں نے حسن بصریؒ سے کوئی زیادہ فقیہ انسان نہیں دیکھا اور عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ وہ ایک عظیم الشان امام تھا جس کے قول کی پیروی کی جاتی ہے۔

اور امام باقرؑ فرماتے ہیں:-

”ذلت يشبه كلامه كلام الانبياء وقال محمد بن سعد فان الحسن

كان جامعًا عالمًا رفيعًا فقيها ثقة مامونًا عابدًا ناسكًا كثير العلم

فصيحًا جميلاً وسيماً.

یہ وہ انسان ہے جس کا کلام انبیاء کے کلام سے مشابہ ہوتا ہے اور محمد بن سعد کا قول ہے کہ حسن بصریؒ کامل ماہر، عالم، بلند شان، فقیہ، معتبر، اپنی رائے میں محفوظ، عابد، پرہیزگار، بہت علم والا، فصیح اللسان اور خوبصورت شکل و سیرت والے تھے۔

پس ایسے عظیم الشان انسان کا یہ قول ہے کہ آیت کریمہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فِيْ جَنِّ مَعْدَنٍ يَّسْتَكْبِرُوْنَ میں جن لوگوں کا ذکر ہے کہ وہ پہلے ایمان لاتے پھر ارتداد اختیار کرتے، پھر ایمان لاتے، پھر کفر کرتے وہ یہودی تھے جنہوں نے یہ مشورہ کیا تھا کہ مسلمانوں کو بہکانے کے لئے اور ان کے دل میں اسلام میں شکوک پیدا کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا جائے تا جب مسلمان دیکھیں گے کہ اہل کتاب جو ان سے زیادہ عالم ہیں اسلام لا کر پھر اسلام سے پھر جاتے ہیں تو ان کے دل میں شبہ پیدا ہوگا کہ واقعی اسلام سچا مذہب نہیں ہے تو وہ بھی اسلام سے پھر جائیں گے۔ پس حضرت حسن بصریؒ جیسے نیک انسان جو تابعی تھے جن کا سب علم صحابہؓ کی بالمشافہ گفتگو پر مبنی تھا اس تاریخی واقعہ کے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ یہود نہ صرف مشورہ کیا کرتے تھے کہ مسلمان ہو کر مرتد ہو جاؤ بلکہ ایسا

کیا بھی کرتے تھے اور ایسے شخص کی شہادت جن کا علم صحابہؓ کے علم سے بلا واسطہ ماخوذ ہے اور جو جھوٹ کے شبہ سے پاک ہے نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

غرض قرآن شریف کی آیت کریمہ وَقَالَتْ ظَالِمَةٌ يَا أَسَافُ مَا أَصَابَكُم مَّا كُنْتُمْ تُعْتَدُونَ ﴿١٠١﴾ اس بات کا قطعی اور یقینی ثبوت ہے کہ اسلام میں مرتدین کو ارتداد کی سزا نہیں دی جاتی تھی اور ان کو ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کیا جاتا تھا ورنہ یہود کبھی ایسی تجویز نہ سوچتے اور نہ اس پر عمل کرتے اور نہ ان کو یہ امید ہوتی کہ ان کی اس تدبیر سے مسلمان اپنے دین سے پھر جاویں گے۔ پس اس آیت کریمہ کی موجودگی میں یہ کہنا کہ قرآن شریف قتل مرتد کے سوال پر ساکت ہے ایک غلط دعویٰ ہے کیونکہ قرآن شریف بآواز بلند کہہ رہا ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں۔

قرآن شریف پر ایک سرسری نظر کرنے سے مجھے پندرہ آیات ایسی ملی ہیں جن میں ارتداد یعنی کفر بعد اسلام کا ذکر ہے لیکن ان میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں مرتد کے لئے قتل کی سزا کا ذکر ہو اور قتل مرتد کے حامی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ ارتداد کی آیات میں اُخروی سزا کا تو ذکر ہے مگر اس دنیا میں قتل کی سزا دئے جانے کا ذکر کہیں نہیں۔ لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس دنیا میں ان کو قتل کی سزا نہیں دی جائے گی اور اس امر کی تائید میں وہ قرآن شریف کی مندرجہ ذیل آیت پیش کرتے ہیں۔

وَمَنْ يَفْتُلْ مُؤْمِنًا مَّتَعَمِدًا فَجَزَاءُ وَهُ جَهَنَّمُ خُلِدًا فِيهَا وَعَذَابٌ

اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿٩٤﴾ (النساء: 94)

اور جو شخص کسی مومن کو دانستہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اس میں دیر تک رہتا چلا جائے گا اور اللہ اس سے ناراض ہوگا اور اسے اپنی جناب سے دور کر دے گا اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کرے گا۔

وہ کہتے ہیں اس آیت کریمہ میں ایسے شخص کے لئے جو کسی مومن کو عمدتاً قتل کر دے صرف اُخروی سزا کا ذکر ہے۔ پس کیا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ایسے شخص کو اس کے جرم کی سزا اس دنیا میں نہیں دی جائے گی اور کیا ایسا آدمی قتل نہیں کیا جائے گا؟

میں یہ کہتا ہوں یہ قیاس مع الفارق ہے۔ ان کی پیش کردہ آیت کے نزول سے پہلے صراحۃً قرآن شریف میں ایسے شخص کے قتل کئے جانے کا حکم نازل ہو چکا تھا اور اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد بھی قصاص کا حکم نازل ہوا لیکن قتل مرتد کے متعلق قرآن شریف میں ایک بھی آیت نہیں چنانچہ قتل مرتد کے حامیوں کو یہ کہنا پڑا ہے کہ قرآن شریف اس سوال کے متعلق ساکت ہے۔

وَمَنْ يُقْتَلْ مُؤْمِنًا مَّتَعِمِدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ كِىٰ آيَةِ سُوْرَةِ نَسَاءٍ مِّنْ نَّازِلٍ
 ہوئی اس سے پہلے سورۃ بقرہ میں قصاص کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ
 فرماتا ہے كِتَبَ عَلَيْنَا فِي الْقَتْلِ (البقرہ: ۱۷۹) تم پر مقتولوں کے
 بارہ میں برابر کا بدلہ لینا فرض کیا گیا ہے اور فرماتا ہے وَلَكُمْ
 فِي الْقِصَاصِ حَيٰوَةٌ يَاۤوَلِيّۤى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ (البقرہ: 180)
 اور اے عقلمندوں تمہارے لئے بدلہ لینے میں زندگی کا سامان ہے اور یہ حکم اس لئے
 ہے تاکہ تم بچ جاؤ۔ نیز سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَنْ قَتَلَ مَظْلُوْمًا
 فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيْهِ سُلْطٰنًا فَلَا يَسْرِفْ فِي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مُنْصُوْرًا ﴿۳۱﴾

(بنی اسرائیل: 34)

اور جس جان کو مارنا اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اُسے شرعی حق کے سوا قتل نہ کرو۔ اور جو شخص
 مظلوم مارا جائے اس کے وارث کو ہم نے قصاص کا اختیار دیا ہے پس اس کے لئے یہ
 ہدایت ہے کہ وہ قاتل کو قتل کرنے میں ہماری مقرر کردہ حد سے آگے نہ بڑھے۔ اگر وہ
 حد کے اندر رہے گا تو یقیناً ہماری مدد اس کے شامل حال ہوگی۔

نیز سورۃ بقرہ: 195 میں فرماتا ہے:-

وَالْحُرْمَتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ
بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ

اور سب ہی عزت والی چیزوں کی تہک کا بدلہ لیا جاتا ہے اس لئے جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اس سے اس کی زیادتی کا جس قدر کہ اس نے تم پر زیادتی کی ہو بدلہ لے لو۔

اور آیت پیش کردہ کے بعد بھی قصاص کی آیت قرآن شریف میں نازل ہوئی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ مائدہ میں فرماتا ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ
وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (المائدة: 46)

اور ہم نے اس تورات میں ان پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلہ میں جان اور آنکھ کے بدلہ میں آنکھ اور ناک کے بدلہ میں ناک اور کان کے بدلہ میں کان اور دانت کے بدلہ میں دانت اور زخموں کے بدلہ میں زخم برابر کا بدلہ ہیں۔

پس قاتل متعمد کے متعلق تو قتل مرتد کے حامی صرف ایک آیت ایسی پیش کرتے

ہیں جس میں اُخروی سزا کا ذکر ہے اور قصاص کا ذکر نہیں لیکن اُس ایک آیت کے مقابل میں کم از کم چار آیتیں موجود ہیں جن میں ایسے قاتل سے قصاص کا صریح حکم موجود ہے۔

مگر قرآن شریف میں کم از کم پندرہ آیات موجود ہیں جن میں ارتداد کا ذکر تو ہے

لیکن قتل کی سزا کہیں بھی مذکور نہیں۔ پس حامیان قتل مرتد کا وَمَنْ يُقْتَلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ کی آیت کو بطور نظیر کے پیش کرنا ان کے لئے کچھ بھی مفید نہیں بلکہ اس سے ان کے خلاف استدلال ہو سکتا ہے کہ اگر مرتد کے لئے بھی قتل کی سزا ہوتی تو جیسے قاتل کی صورت میں اگر ایک جگہ صرف اُخروی سزا کا ذکر ہے تو کم از کم چار جگہ قصاص کا صریح

حکم موجود ہے۔ اسی طرح اگر مرتد کے لئے بھی قتل کی سزا مقرر ہوتی تو جب بار بار قرآن شریف مرتد کے لئے اُخروی سزا کا ذکر کرتا ہے (جیسے عام کافر کے لئے) تو کم از کم ایک مرتبہ ہی اس کے قتل کئے جانے کا ذکر فرمادیتا۔ پس قرآن شریف کا بار بار اُخروی سزا کا ذکر کرنا اور قتل کی سزا کا کہیں بھی ذکر نہ کرنا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ مرتد کے لئے خدا تعالیٰ نے قتل کی سزا مقرر نہیں فرمائی۔ خصوصاً جب کہ ہم تمام قرآن شریف کو ضمیر کی آزادی کی آیات سے بھرہوا دیکھتے ہیں اور جب کہ علی الاعلان اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ اَوْ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ.

کہ جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے اور یہ کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں۔ ہدایت اور گمراہی کا فرق خوب ظاہر ہو چکا ہے۔

نیز یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ارتداد کی آیات قریباً سب کی سب مدینہ میں ایسے وقت میں نازل ہوئیں جب کہ اسلامی سلطنت قائم ہو چکی تھی اور قتل کی سزا کا نفاذ بھی ہو سکتا تھا۔ پھر کیوں اُخروی سزا پر انحصار رکھا گیا حالانکہ اُخروی سزا کا تو انسان مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے سب سے پہلے وہ سزا بیان کرنی چاہئے تھی جو نزول کے وقت دی جاسکتی تھی۔ لیکن میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی درست نہیں کہ قرآن شریف کی آیات متعلقہ ارتداد قتل مرتد کے سوال پر ساکت ہیں۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ قرآن شریف میں کم از کم پندرہ آیات ایسی ہیں جن میں کفر بعد اسلام کا ذکر ہے اور ان میں سے ہر ایک اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ مرتد کے لئے اسلام میں قتل کی سزا نہیں ہے۔ ان پندرہ آیات میں سے ایک آیت تو وہ ہے جس کے متعلق میں پہلے بحث کر چکا ہوں یعنی

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْ اُنزِلَ عَلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَجِهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا اٰخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (ال عمران : ۷۳)

اور جیسا کہ میں ابھی ثابت کر چکا ہوں اس آیت کریمہ سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں قتل کی سزا نہیں دی جاتی تھی اور کفر بعد اسلام کے متعلق چار آیتیں میں منافقین کی بحث میں لکھ چکا ہوں جن میں اللہ تعالیٰ منافقین کے متعلق شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کیا ہے اور ارداد کا لفظ بھی استعمال فرماتا ہے لیکن کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے منافقین کو قتل کا حکم نہیں دیا۔ باقی دس آیات میں جن کو میں یکے بعد دیگرے پیش کروں گا۔

پہلی اور دوسری آیت مع آیات متعلقہ

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٩٢﴾ أُولَٰئِكَ جَزَاءُ وَّهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾ خَلِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٩٤﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٩٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أزدَادُوا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَن يُّقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوْ افْتَدَىٰ بِهِ ﴿٩٧﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّاصِرِينَ ﴿٩٨﴾ (ال عمران: 87-92)

جو لوگ ایمان لانے کے بعد پھر منکر ہو گئے ہوں اور شہادت دے چکے ہوں کہ یہ رسول سچا ہے اور نیز ان کے پاس دلائل بھی آچکے ہیں انہیں اللہ کس طرح ہدایت پر لائے اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب ہی کی لعنت ہو۔ وہ اس لعنت میں رہیں گے۔ نہ تو ان پر سے

عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ اٹھیل ڈھیل دی جائے گی۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں اور اللہ یقیناً بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لانے کے بعد منکر ہو گئے ہوں پھر وہ کفر میں اور بھی بڑھ گئے ہوں ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔ جو لوگ منکر ہو گئے ہوں اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے ہوں ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی جسے وہ فدیہ کے طور پر پیش کریں ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب مقدر ہے اور ان کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔

مندرجہ بالا اقتباس میں دو آیات ایسی ہیں جن میں کفر بعد ایمان کا ذکر ہے اور ان دونوں آیات سے یہ امر صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ پہلے سچے دل سے اس نبی پر ایمان لے آئے اور زبان سے اس کی صداقت کا اقرار کیا اور اس طرح اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کے مصداق ٹھہرے مگر پھر کسی نفسانی وجہ سے انکار کر دیا تو ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں مل سکتی لیکن اگر وہ خدا تعالیٰ کی طرف آنا چاہیں تو پھر خدا تعالیٰ ان کے لئے دروازے کھول دیتا ہے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ارتداد کے بعد کفر میں بڑھتے جاتے ہیں تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں کیونکہ یہ لوگ ایک طرف کفر میں بڑھتے جاتے ہیں اور دوسری طرف منہ سے توبہ کرتے ہیں۔ ان کی ایسی توبہ فائدہ نہیں دیتی۔

ان دونوں آیات سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ارتداد کے بعد مرتد اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مرتد دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بعد میں سچی توبہ کر لیتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ ہدایت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ دوسرے وہ جو اپنے کفر میں بڑھے چلے جاتے ہیں اور اگر توبہ بھی کرتے ہیں تو

جھوٹی، ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ ہدایت روک لیتا ہے اور وہ اپنی گمراہی میں بڑھے چلے جاتے ہیں۔ ان آیات کے پڑھنے سے پہلا اثر جو ہر ایک انصاف پسند انسان کے دل پر پڑتا ہے وہ یہی ہے کہ ارتداد کے بعد مرتدین پر کوئی جبر نہیں ہوتا وہ اپنے حال پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ جو بعد میں سچی توبہ کریں تو ان کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے اور جو لوگ سچی توبہ نہیں کرتے اور اپنے کفر میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں ایسے لوگ ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محروم رہتے ہیں اور گمراہی ہی میں اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ پس ان آیات میں یہ مفہوم ضرور مرکوز ہے کہ مرتد کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی تھی بلکہ ان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل دی جاتی تھی۔ سچی توبہ جبر اور قتل کے سوال کو رد کرتی ہے کیونکہ جب مرتد ہوتے ہی مسلمان تلوار کھینچ کر اس کے گرد ہو جاویں گے کہ توبہ کرو ورنہ تمہیں قتل کر دیا جائے گا تو ایسے حال میں اس کی توبہ جبر و اکراہ کی توبہ ہوگی نہ کہ توبہ برنصوح۔ اسی طرح مرتد کا اپنے کفر میں ترقی کرتے جانا بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس کو خدا تعالیٰ ڈھیل دیتا ہے اور اسے لمبی مہلت دی جاتی ہے کسی تلوار سے اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کیا جاتا۔

پس یہ دونو آیتیں قتل مرتد کے عقیدہ کی تردید کر رہی ہیں۔ ان آیات پر حامیان قتل مرتد نے یہ جرح کی ہے کہ ان کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ یہاں پر اسلام لا کر مرتد ہونے کا ذکر نہیں بلکہ یہ کہ اہل کتاب حضور سرور کائنات پر ایمان لانے کا عہد و پیمانہ کرنے کے بعد آپ کی تشریف آوری پر تمام بیانات سے منکر ہو گئے تھے اسی کفر بعد ایمان کا ان آیات میں ذکر ہے اور لکھتے ہیں کہ ”حقیقت یہ ہے کہ ان آیات کا بہ سلسلہ ارتداد پیش کرنا ہی قرآن (شریف) سے انتہا درجہ کے جہل کا ثبوت ہے۔“ مگر یہ مولوی صاحبان کی خوش فہمی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ ارتداد میں ان آیات کا پیش کرنا قرآن شریف سے انتہا درجہ کے جہل کا ثبوت نہیں بلکہ ان کے یہ الفاظ خود ان پر صادق آتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اوتیت جوامع الکلم (بخاری) یعنی جو کلام مجھے دیا گیا ہے اس میں یہ

خصوصیت ہے کہ تھوڑے لفظوں میں بہت سے معانی ادا کئے گئے ہیں۔ یہ نہیں کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت ایک ہی مفہوم تک محدود ہے اور کوئی دوسرا مفہوم اس سے نکالنا غلطی ہے۔ ایک آیت کو صریح الفاظ کے ہوتے ہوئے ایک ہی معنی میں مخصوص کرنا صحیح نہیں بلکہ کئی مفہوم نکل سکتے ہیں بشرطیکہ ایک معنی دوسرے معنوں کے متضاد نہ ہوں۔

پس آیات زیر بحث میں اگر حامیان قتل مرتد کے معنی بھی درست مان لئے جائیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ کفر بعد اسلام کے ظاہری اور اقرب معنی لینا غلطی ہے بلکہ ان کے پیش کردہ معنوں کے باوجود آیت اپنے ظاہری معنوں میں بھی درست ماننی پڑے گی اور حامیان قتل مرتد یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ یہاں ایمان کے کوئی خاص معنی ہیں اس لئے عام اور معروف معنی لینا جہالت ہے۔ عام اور معروف معنی لینا جہالت نہیں بلکہ جو شخص ان پر اعتراض کرتا ہے وہ خود اپنی جہالت کا ثبوت دیتا ہے۔

افسوس! کہ معترضین کو تمام مفسرین کے مشہور و معروف اور مسلم اصول کا بھی علم نہیں اگر کسی آیت کریمہ کے نزول کا کوئی خاص سبب یا موقع ہو تو وہ آیت اس خاص موقع اور محل کے لئے مخصوص سمجھی جاتی بلکہ وہ اپنے الفاظ کے مفہوم کے جائز دائرہ کے اندر پوری پوری وسعت اور عمومیت رکھتی ہے۔ چنانچہ مفسرین نے اس کے متعلق جو اصل باندھا ہے وہ یہ ہے الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب یعنی ہر ایک آیت اپنے الفاظ کے عام معنوں میں لی جائی گی جس محل پر وہ پہلی دفعہ نازل ہوئی اس محل و موقع میں اس کو محصور نہیں سمجھا جائے گا۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ علی البیضاوی جلد اول صفحہ 131) اسی طرح روح المعانی جلد 2 صفحہ 294 پر لکھا ہے وسبب النزول لا یصلح مخصصا فان العیرة کما تقرر بعموم اللفظ لا بخصوص السبب یعنی کسی آیت کا سبب نزول اس آیت کی تخصیص نہیں کرتا بلکہ وہ آیت اپنے عام معنوں میں سمجھی جائے گی اور اس کو اس

واقعہ کے ساتھ مختص نہیں سمجھا جاوے گا۔ جیسا کہ مسلم ہے۔

پس اگر حامیان قتل مرتد کا یہ کہنا درست بھی مان لیا جائے کہ یہ آیات ان یہود کے متعلق ہیں جنہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ جب نبی موعود کا ظہور ہوگا تو ہم ان پر ایمان لائیں گے لیکن آنحضور پر نور کے ظہور قدسی کے وقت وہ منکر ہو گئے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ آیات عام مرتدین پر چسپاں نہیں ہو سکتیں جو اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کریں۔

علاوہ ازیں خود ان آیات کا مضمون اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ یہود کے لئے مخصوص نہیں بلکہ عام ہیں۔ ان آیات میں تین گروہوں کا ذکر ہے۔ اول وہ جو ارتداد اختیار کرنے کے بعد پھر سچی توبہ کرتے ہیں۔ دوم وہ جو توبہ نہیں کرتے بلکہ اپنے کفر میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ تیسرے وہ جو ابتداء سے ہی کافر رہتے ہیں۔ یہ ایک عام تقسیم ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کو یہود تک محدود کیا جائے۔ اسی طرح ان آیات سے ما قبل کی آیت دیکھو:-

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۗ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ

مِنَ الْخَسِرِينَ ﴿۸۶﴾ (ال عمران: 86)

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہے تو وہ یاد رکھے کہ وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ کیا یہ آیت صرف یہود کے لئے مخصوص ہے یا سب پر حاوی ہے۔ پھر ان آیات سے مابعد کی آیت پڑھو:-

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ (ال عمران: 93)

تم کامل نیکی کو ہرگز نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ اشیاء میں سے خدا کے لئے خرچ نہ کرو۔

کیا حامیان قتل مرتد کے نزدیک اس آیت میں صرف یہود ہی مخاطب ہیں؟ جب

پہلی آیت اور بعد کی آیت اپنے مفہوم میں عام ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان دونوں آیات کی درمیانی آیات کو باوجود الفاظ کی عمومیت کے صرف یہود کے لئے خاص سمجھا جائے۔

حامیان قتل مرتد فرماتے ہیں کہ ان آیات کو بہ سلسلہ ارتداد پیش کرنا ہی قرآن سے انتہا درجہ کے جہل کا ثبوت ہے۔ (زمیندار 20 / مارچ 1945ء کا لم 2 صفحہ 2) ان صاحبان کی دل چسپی کے لئے میں چند خاص خاص تفاسیر سے کچھ اقتباس ذیل میں درج کرتا ہوں تا ان بزرگوں کو دیکھ کر حیرت ہو کہ صرف ہم ہی نہیں جنہوں نے بسلسلہ ارتداد پیش کر کے قرآن شریف سے انتہا درجہ کا جہل کا ثبوت دیا ہے بلکہ وہ جو مسلمانوں میں چوٹی کے مفسر شمار کئے جاتے ہیں وہ ابھی ہماری طرح اسی انتہا درجہ کے جہل میں مبتلا ہیں۔

پہلا مفسر جس نے ان آیات کو مرتدین پر چسپاں کر کے بقول مولوی ظفر علی خان صاحب قرآن شریف سے انتہا درجہ کے جہل کا ثبوت دیا ہے، روح البیان کا مصنف ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

فان قيل ظاهر الآية يقتضي ان من كفر بعد اسلامه لا يهديه الله ومن كان ظالمًا لا يهديه الله وقد راينا كثيرا من المرتدين اسلموا وهداهم وكثير من الظالمين تابوا عن الظلم فالجواب ان معناه لا يهديهم ما داموا مقيمين على الرغبة في الكفر والتبُّ عليه ولا يقبلون على الاسلام واما اذا تحروا اصابة الحق. والاهتداء بالادلة المنصوبة فحينئذ يهديهم الله بخلق الاهتداء فيهم.

(روح البیان جلد نمبر 1 صفحہ 344)

دوسرا مفسر جس نے بقول مولوی ظفر علی خان صاحب ایسے انتہا درجہ کے جہل کا ثبوت دیا ہے، ابن جریر ہے۔ وہ اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں:-

۱۔ بقول مولوی ظفر علی خان صاحب

نزلت في اثنا عشر رجلا رجعوا عن الاسلام ولحقوا بقريش ثم كتبوا الى اهلهم هل لنا من توبة فنزلت اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ. (ابن جرير جلد 3 صفحہ 242)

تیسرا مفسر جن نے بقول مولوی ظفر علی خان صاحب قرآن شریف سے ایسے انتہا درجہ کے جہل کا ثبوت ہے، ابن کثیر ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

عن عكرمة عن ابن عباس ان قوماً اسلموا ثم ارتدوا افارسلوا الى قومهم يسألون لهم فذكروا ذلك لرسول الله ﷺ فنزلت هذه الآية اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ اَزْدَادُوْا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ هكذا رواه واسناده جيد. (ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان جلد نمبر 2 صفحہ 249)

چوتھا مفسر جس کو اسی زمرہ میں شامل کرنا چاہیے، بحر المحیط کا مصنف ہے۔ وہ لکھتا

ہے:-

او معنى ثُمَّ اَزْدَادُوْا كُفْرًا تموا على كفرهم وبلغوا الموت به فيدخل فيه اليهود والمرتون قاله مجاهد و قال نحوه السدي وقيل نزلت فيمن مات على الكفر من اصحاب الحارث بن سويد.

(بحر المحیط جلد نمبر 2 صفحہ 519)

تیسری آیت

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٧﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْاٰخِرَةِ ۗ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾

(النحل: 107-108)

”جو شخص ایمان لائے پیچھے خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر کرے سوائے اس کے جو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ لیکن ہاں وہ جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب اور ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں پسند کیا اور یہ کہ اللہ ان لوگوں کو جو کفر کرتے ہیں ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

اس آیت کریمہ میں بھی دوسری آیات کی طرح صرف اُخروی سزا کا ذکر ہے قتل کی سزا کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن مولوی ظفر علی خان صاحب اس آیت کریمہ پر یہ جرح کرتے ہیں کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُخروی وعید کے علاوہ اس دنیا میں کوئی اور سزا نہ ملنی چاہیے۔

اول تو کسی آیت میں بھی قتل کی سزا کا ذکر نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے لیکن اگر اس آیت پر غور کیا جائے تو صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ اس میں صرف اُخروی سزا پر انحصار کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے کیونکہ

(1) قتل کی سزا میں اکراہ لازم آتا ہے اور اس آیت کریمہ میں کنایۃً (اور دیگر آیات میں صراحۃً) اکراہ فی الدین کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو تبدیلی عقائد کی وجہ سے لوگوں کو دکھ دیتے ہیں برا کہا گیا ہے۔

(2) اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ عقائد کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ پس اگر ایک انسان قتل کے خوف سے ظاہر میں ایمان کا اقرار بھی کرے مگر دل سے کافر ہو تو ایسے اقرار سے مسلمانوں کو یا خود اس شخص کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

(3) ان آیات میں مرتدین پر غضب کی وجہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْاٰخِرَةِ

یعنی یہ غضب اور یہ عذاب اس لیے ہے کہ انہوں نے ورلی زندگی کو آخرت کے مقابل میں پسند کیا۔ ان الفاظ سے بھی پایا جاتا ہے کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں تھی۔ کیونکہ مرتدوں کو اگر فوراً ارتداد کے بعد قتل کر دیا جاتا تو ذَلِکَ بِأَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ والی غرض پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ غرض تو اسی صورت میں پوری ہو سکتی تھی کہ ارتداد کے بعد وہ زندہ رہتے اور ان کے قتل کا حکم نہ ہوتا۔

چوتھی آیت

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ أَرَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيُغْفِرْ لَهُمْ وَلَا لِيُهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿١٣٨﴾ (النساء: 138)

”جو لوگ اسلام لائے اور پھر اسلام سے انکار کر دیا پھر اسلام لائے اور پھر انکار کیا، اور پھر اس کے بعد کفر میں بڑھتے گئے تو خدا نہ تو ان کی مغفرت ہی کرے گا اور نہ ان کو راہِ راست ہی دکھائے گا۔“

اس آیت پر بھی یہی اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں اگر دنیوی سزا کی صراحت نہیں تو نفی بھی نہیں۔ میں کہتا ہوں یہی تو معرضِ بحث ہے کہ باوجود قرآن کریم میں کئی جگہ مرتدین کا ذکر ہونے کے پھر تمہاری مزعومہ سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر یہ سزا ہوتی تو ضرور کسی نہ کسی جگہ اس کا اشارہ ہوتا۔ پس ہماری دلیل یہ ہے کہ ہر جگہ ارتداد کی سزا اُخروی عذاب ہی فرمانا قتل کی نفی ہے۔

دوسرے اس آیت میں دو دفعہ ایمان اور دو دفعہ کفر کا ذکر ہے اور پھر اصرار علی الکفر کا ذکر ہے۔ اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو ایسے نظارہ کا مشاہدہ ناممکن تھا۔ قتل کی سزا کی موجودگی میں کسی جماعت یا فرد سے ایسی جرأت کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا۔

تیسرے اَزْدُدُوا كُفْرًا میں لمبے عرصہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ دو تین دن کی مہلت

میں توبہ نہ کرنے پر یہ الفاظ چسپاں نہیں ہو سکتے بلکہ یہ ایک لمبا عرصہ چاہتے ہیں۔ پس اس آیت کے الفاظ یقینی طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ کسی کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کیا جاتا تھا۔

چوتھے اس آیت کے متعلق حسن بصریؒ کا یہ قول ہے کہ

انهم طائفة من اهل الكتب ارادوا تشكيث اصحاب رسول الله
 ﷺ وكانوا يظهرون الايمان بحضرتهم ثم يقولون قد عرضت لنا
 شبهة فيكفرون ثم يظهرون ثم يقولون قد عرضت لنا شبهة أخرى
 فيكفرون ويستمرون على الكفر الى الموت و ذلك معنى قوله
 تعالى: وقالت طائفة من اهل الكتب الى لعنهم يرجعون.

(روح المعانی جلد نمبر 2 صفحہ 196)

یعنی اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ اہل کتاب کی ایک جماعت تھی جنہوں نے صحابہؓ کے دل میں اسلام کے متعلق شک ڈالنا چاہا اس لئے ان کے پاس آ کر وہ ظاہر کرتے کہ ہم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں۔ پھر بعد میں کہتے کہ ہمارے دل میں شبہ پیدا ہو گیا ہے اور ارتداد اختیار کرتے۔ پھر آ کر ایمان کا اظہار کرتے پھر کہتے کہ ہمارے دل میں اور شبہ پیدا ہو گیا ہے اور پھر اسلام سے انکار کرتے اور پھر اسی انکار پر قائم رہتے یہاں تک کہ مر جاتے اور یہی معنی ہیں اس آیت کریمہ کے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ اول روز میں قرآن پر ایمان لاؤ اور آخر روز میں انکار کر دو تا اس حیلہ سے مسلمان اسلام سے روگردانی کر لیں۔ پس حضرت حسن بصریؒ کے اس قول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مرتدین کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی تھی۔

پانچویں آیت

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ

إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ قَيْمًا وَهُوَ
 كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
 وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٨﴾ (البقرة: 218)

”اور یہ کفار تم سے برابر لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں اور جو تم میں سے اپنے دین سے برگشتہ ہوگا اور کفر ہی کی حالت میں مر جائے گا تو ایسے لوگوں کا کیا کریا دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت گیا اور یہی ہیں دوزخی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔“

اس آیت کریمہ میں بھی کسی دنیوی سزا کا ذکر نہیں اور یہ نہیں کہا گیا کہ مرتد کو قتل کیا جائے گا۔ اس آیت کریمہ پر ایک مولوی صاحب جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
 ”اس آیت میں بھی قَيْمًا کا لفظ سزائے قتل کا منافی نہیں۔ اس لئے کہ اوّل تو یہ لفظ موت بالقتل اور موت طبعی دونوں پر یکساں حاوی ہے اور اس کے استعمال سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام مرتدین کے ساتھ ساتھ ان مرتدین کے متعلق بھی صراحت کر دی جائے جو ارتداد اختیار کرتے ہی ہیئت حاکم اسلام کے دائرہ اثر و اقتدار سے باہر نکل جائیں اور اسلامی حکومت کا محکمہ قضاء ان پر حد جاری نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ یہ آیت ان مرتدین کی حالت پر بھی منطبق ہوتی ہے جو کسی غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہونے کے باعث شرعی سزائے قتل سے محفوظ رہتے ہیں۔“

اس اقتباس میں اس آیت کریمہ کے سزائے قتل کے منافی نہ ہونے کی دو جوہات لکھتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں موت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو قتل اور طبعی موت دونوں پر حاوی ہے اور یہ مشترکہ لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ عام مرتدین کے ساتھ ساتھ ان مرتدین کے متعلق بھی صراحت کر دی جائے جو اسلامی سلطنت سے بھاگ جانے کے باعث سزائے قتل سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ”عام مرتدین“ سے مولوی صاحب کی مراد وہ

مرتدین ہیں جن کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ مگر میں مولوی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ بقول آپ کے موت کا لفظ رکھ کر استثنائی صورت کی تو صراحت کر دی گئی مگر عام حکم کی بھی صراحت ہونی چاہیے تھی۔ جس کے ساتھ ساتھ اس استثنائی صورت کی وضاحت کی گئی ہے وہ کہاں ہے؟ عام مرتدین کے متعلق تو قتل کی سزا تھی اور ایسے احکام کسی قانون کی کتاب میں ذومعنی الفاظ میں کبھی نہیں دیئے جاتے۔ اول ضرورت تو عام قاعدہ کی تھی کہ مرتد کو قتل کر دو۔ اس حکم کی صراحت نہیں کی گئی اور بقول آپ کے استثناء کی صراحت کر دی گئی ہے۔ مولوی صاحب! یہ استثناء ایسا نہیں تھا۔ جس کے ذکر کی بھی ضرورت ہوتی۔ کیونکہ جس کو ذرا بھی عقل ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص ارتداد اختیار کرتے ہی ہیئتِ حاکم اسلام کے دائرہ اثر و اقتدار سے باہر نکل جائے اور اسلامی حکومت کا محکمہ قضاء اس پر حد جاری نہ کر سکے ایسا شخص قتل سے محفوظ ہو جائے گا۔ پس اس امر کے سمجھانے کے لئے یہ ضرورت نہ تھی کہ قتل کا لفظ چھوڑ کر موت کا لفظ استعمال کیا جاتا اور قتل کے حکم کو ایسا مخفی کر دیا جاتا کہ سوائے مولوی ظفر علی خان صاحب کے دماغ کے اس کو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

اگر اس آیت میں یہی منشاء تھا کہ قتل اور طبعی موت دونوں صورتوں کی صراحت کر دی جائے تو اس جگہ بھی وہی طریق اختیار کیا جاتا جو ایسے موقعوں پر قرآن شریف میں دوسرے مقامات میں اختیار کیا گیا ہے نہ یہ کہ ایک غیر ضروری استثناء کی وضاحت کے لئے عام اور ضروری حکم کو اخفاء کے ایسے پردے میں چھپا دیا جاتا کہ کبھی بھی کسی انسان کی عقل وہاں تک نہ پہنچ سکتی۔ اگر قتل اور طبعی موت دونوں صورتوں کے بیان کی ضرورت پیش آئے تو قرآن دونوں صورتوں کے اظہار کے لئے ایسا نہیں کرتا کہ قتل اور موت کے لئے صرف موت کا ہی لفظ استعمال کرے بلکہ دونوں لفظوں کو الگ الگ استعمال فرما کر صحیح مفہوم کو واضح فرماتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ آل عمران میں فرماتا ہے:-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

أَفَأَبْرَأَتُ إِذْ أَقْبَلَتْ أَوْ قَتَلَتْ أَنْفَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۗ (ال عمران: 145)

اور محمد صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔ پس اگر وہ وفات پا جائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے۔

اگر محض موت کے لفظ میں دونوں مفہوم موجود تھے اور دونوں کی صراحت کے لئے

یہی ایک لفظ کافی تھا تو پھر قُتِلَ کا لفظ بلا وجہ کیوں بڑھایا گیا؟

پھر قتل کے لفظ کی جگہ موت کا لفظ اختیار کرنے کی دوسری حکمت مولوی صاحب یہ بیان فرماتے ہیں کہ تا یہ آیت ان مرتدین کی حالت پر بھی منطبق ہو جائے ”جو کسی غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہونے کے باعث شرعی سزائے قتل سے محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً جس طرح آج کل ہندوستان کے حلقہ ارتداد کے مرتدین محفوظ و مصون ہیں۔

مولوی صاحب! اس آیت کریمہ کو پھر نظر اٹھا کر دوبارہ پڑھیں اور بتائیں کہ اس میں اول مخاطب کون لوگ ہیں؟ کیا وہ جو اسلامی حکومت میں بود و باش رکھتے تھے یا وہ جو ہندوستان یا چین میں سکونت رکھتے تھے؟ جب اول مخاطب وہ لوگ تھے جن میں سے ارتداد اختیار کرنے والوں پر بقول مولوی صاحب قتل کی سزا جاری کرنے چاہئے تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ قتل کے حکم کی تو وضاحت نہ کی گئی جس کی وضاحت کی سب سے پہلے ضرورت تھی اور ہندوستان کے حلقہ ارتداد کے مکاناتوں کے متعلق وضاحت کر دی گئی کہ ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ تو ایسا مسئلہ تھا کہ اس کی نسبت دیوبند کا ایک ادنیٰ درجہ کا مولوی بھی نہایت آسانی سے اجتہاد اور قیاس کر سکتا تھا۔ اصل ضرورت تو عام مرتدین کے متعلق فیصلہ سنانے کی تھی اس کی تو وضاحت نہ کی گئی اور استثنائی صورتوں پر زور دیا گیا۔

مولوی صاحب! آپ ادھر ادھر کیوں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں؟ کیوں ایک آیت قرآنی کے صاف مفہوم سے بچاؤ ڈھونڈنے کے لئے اس کو بلا ضرورت استثنائی صورتوں پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیوں دیانت داری سے صاف طور پر اقرار نہیں کر

لیتے کہ یہ آیت سب مرتدین کے متعلق ہے اور فَيَسْمُتُ كَالْفَرْسِيِّ كَالْفَرْسِيِّ اور صرف اخروی سزا کا ذکر صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔ یہ آیت بطور ایک تحذیر کے نازل ہوئی ہے اور اگر مرتد کے لئے قتل سزا مقرر ہوتی تو یہ اس کے ذکر کا عین محل تھا مگر اس موقع پر اس سزا کا ذکر نہ ہونا صاف بتاتا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے۔ دیکھو صاحب روح البیان اس آیت کریمہ کے متعلق کیا لکھتے ہیں:-

هو تحذير من الارتداد وفيه ترغيب في الرجوع الى الاسلام بعد

الارتداد الى حين الموت. (روح البیان جلد نمبر 1 صفحہ 227)

”اس آیت میں ارتداد سے ڈرایا گیا ہے نیز اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ وہ ارتداد سے رجوع کر کے پھر اسلام کی طرف لوٹ آویں اور یہ موقع ان کو آخری دم تک حاصل ہے۔“

نہایت تعجب کی بات ہے کہ رحیم کریم خدا تو مرتدین کو زندگی بھر کی مہلت دے تا وہ ارتداد سے رجوع کر کے اسلام قبول کر لیں اور اس طرح اخروی عذاب سے کسی طرح بچ جاویں۔ لیکن ہمارے علماء میں سے بعض تو یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ انہیں فوراً قتل کر دیا جائے ایک دم مہلت کی بھی ضرورت نہیں اور بعض زیادہ سے زیادہ تین دن کی مہلت دینے پر بڑی مشکل سے راضی ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب کا عقیدہ خواہ کچھ ہی ہو مگر قرآن شریف کی آیات پر جب انہوں نے جرح کی ہے تو اپنے ضمیر اور کانشنس کو عمد ابالائے طاق رکھ کر صرف اپنی قلم کے زور سے سفید کو سیاہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ خود ان کا قلب جانتا تھا کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں صرف میری سینہ زوری ہے اور ایسے موقع پر ضروری ہے کہ انسان سے کسی وقت سچ بھی نکل جائے کیونکہ عمد غلط بیانی کی جائے تو اس کو پورے طور پر نباہنا مشکل ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے ان کو یاد نہیں رہتا کہ ابھی ہم کیا کہہ آئے ہیں۔ چنانچہ اسی آیت

پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے اپنے عدم حافظہ کا عجیب ثبوت دیا ہے اس موقع پر انہوں نے ارتداد کے متعلق تین آیات پر جرح کی ہے اور آیت زیر بحث اس سلسلہ میں آخری آیت ہے جس کے متعلق انہوں نے اپنے ضمیر کے خلاف اس امر پر زور دیا ہے کہ یہاں فَيَمُتْ کے معنی عام مرتدین کے لئے قتل کے ہی ہیں۔ لیکن جو نبی وہ اس آیت پر اپنی بحث کو ختم کر چکتے ہیں ان کے سارے دلائل فوراً ان کے حافظہ سے نکل جاتے ہیں اور جو کچھ تکلف سے انہوں نے ثابت کرنا چاہا تھا وہ سب ان کو فراموش ہو جاتا ہے اور ان تینوں آیات پر بحث ختم کرنے کے بعد پہلی بات جو ان کے قلم سے نکل جاتی ہے وہ یہ ہے:-

”بلاشبہ ان تینوں آیات قرآنی میں سزائے قتل کا کوئی ذکر نہیں“

مولوی صاحب! آپ بھول گئے۔ تیسری آیت میں تو ضرور سزائے قتل کا ذکر ہے کیونکہ آپ نے بڑی کوشش سے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ یہاں عام مرتدین کے لئے موت کے معنی طبعی موت نہیں بلکہ قتل کے ہیں اور آپ نے بڑی حکمتیں بیان فرمائی تھیں کہ یہاں خدا تعالیٰ نے بجائے قتل کے موت کا لفظ کیوں اختیار کیا؟

مولوی صاحب! حافظہ نباشد والی بات سچ ہے میں نے یونہی آپ کے اس دعویٰ کی تردید کی کوشش کی۔ آپ نے تو خود ہی اپنے سارے لکھے لکھائے پر خط نسخ کھینچ دیا تھا کہ ”بلاشبہ ان تینوں آیات قرآنی میں سزائے قتل کا کوئی ذکر نہیں۔“

قرآن شریف کی جن تین آیات کی نسبت مولوی ظفر علی خان صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ ”بلاشبہ ان تینوں آیات قرآنی میں سزائے قتل کا کوئی ذکر نہیں“ انہی میں سے تیسری آیت میں سے جس پر میں ابھی بحث کر چکا ہوں، ایک دیوبندی مولوی صاحب اخبار زمیندار مورخہ 5 اکتوبر 1924ء میں اپنی منطق کے زور سے اس امر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ پہلے مولوی صاحب نے توفیقِ مُت سے قتل مرتد کا ثبوت نکالا تھا مگر اس دوسرے مولوی صاحب نے اس سے بھی زیادہ کمال دکھایا

ہے۔ انہوں نے اس آیت کے ایک ایسے ٹکڑے سے قتل کا حکم نکالا ہے جہاں کسی دوسرے شخص کے وہم میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ یہاں سے بھی قتل کا حکم نکالا جاسکتا ہے۔

أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (التوبة: 69)

یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا کے متعلق بھی اور آخرت کے متعلق بھی ضائع ہو گئے۔ ناظرین تعجب کریں گے کہ ان الفاظ سے قتل کا حکم کس طرح مستنبط ہو سکتا ہے۔ مگر جن مولوی صاحب کا ذکر رہا ہوں وہ تو فرماتے ہیں کہ حبط اعمال کے بجز قتل کے کوئی اور معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ

’ففي الدنيا سے ضرور یہ مفہوم نکلا کہ مرتد کے اعمال جن کو وہ دنیا میں کرتا ہے سب کے سب ارتداد کی وجہ سے باطل ہوں گے اور اعمال دنیویہ کے بطلان کا امکان اس وقت تک نہیں ہو سکتا جس وقت تک کہ اس کا بدن جو کہ مبدائے اعمال دنیویہ ہے موجود رہے۔ لہذا حبط فی الدنيا کی سزا کے معنی بجز اعدام کے کچھ نہیں ہو سکتے۔‘

مجھے اس عجیب غریب تفسیر پر جرح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں صرف مولوی صاحب سے اتنا پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کے یہ معنی درست ہیں تو کیا ان سب لوگوں کو جن کے حبط اعمال کا ذکر قرآن شریف کی آیات میں پایا جاتا ہے بموجب نص قرآن سنگسار کرنا چاہیے؟ مولوی صاحب کیا فتویٰ دیتے ہیں ایسے لوگوں کے بارہ میں جن کا ذکر قرآن شریف کی مندرجہ ذیل آیات میں ہے:-

(۱) وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي

الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ﴿٥١﴾ (المائدة: 6)

اور جو ایمان کی باتوں کو نہ مانے تو اس کا کیا کرایا اکارت ہے اور آخرت میں بھی وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

(۲) وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾ (الانعام: 89)

اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا کرایا ان سے ضائع ہو جاتا۔

(۳) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَّتْهَا تُؤَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْحَثُونَ ﴿١٦﴾ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطُلَّ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾ (هود: 16، 17)

جن کا مطلب دنیا کی زندگی اور دنیاوی رونق ہوتی ہے ہم ان کا بدلہ یہیں دنیا میں ان کو پورا پورا دے دیتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی طرح گھائے میں نہیں رہتے۔ لیکن یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا اور کچھ نہیں اور ان کے دنیا کے عمل سب اکارت گئے اور ان کا کیا کرایا سب لغو۔

(۴) وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ آيْمَانِهِمْ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خِسرِينَ ﴿٥٤﴾ (المائدة: 54)

اور جب (مسلمانوں پر منافقوں کا نفاق کھل جائے گا تو) مسلمان (ان کے حال پر افسوس کر کے آپس میں) کہیں گے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو بڑے زور سے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے اور ہم سے کہا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کا سارا کیا کرایا اکارت ہو اور وہ نقصان میں آ گئے۔

(۵) وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ

هَلْ يُجْرَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٨﴾ (الاعراف: 148)

اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو اور لقاء آخرت کو نہ مانا ان کا کیا کرایا سب اکارت، یہ سزا ان کو انہی کے اعمال کی دی جائے گی۔

(۶) مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ

بِالْكَفْرِ ۗ أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۗ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ (التوبة: 17)

مشرکوں کو کوئی حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مسجدیں آباد رکھیں اور اپنے اوپر کفر کی گواہی بھی

دیتے جاویں۔ یہی لوگ ہیں جن کا کیا کرایا سب اکارت ہو اور یہی لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔

(۷) **أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ**
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٦٩﴾ (التوبة: 69)

منافقوں کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہی وہ لوگ ہیں جن کا کیا کرایا سب اکارت ہو گیا دنیا اور آخرت میں اور یہی لوگ ہیں نقصان پانے والے۔

(۸) **أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ**
فَلَا تُنْفِئُهُمْ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزُنًا ﴿١٠٦﴾ (الکہف: 106)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کی ملاقات کو نہ مانا تو ان کا سب کیا کرایا اکارت ہو گیا۔ تو ہم ان کے لئے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے۔

(۹) **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ**
وَلَا تَجْهَرُوْا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ
اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿٣﴾ (الحجرات: 3)

مسلمانو! اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے اونچا نہ ہونے دو اور نہ اس کے ساتھ بہت زور سے بات کرو جیسا کہ تم ایک سے ایک آپس میں زور سے بولا کرتے ہوتا ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب اکارت ہو جائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

(۱۰) **أُولَٰئِكَ لَمْ يُوْمِنُوْا فَاَحْطَبَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ** ﴿٢٠﴾ (الاحزاب: 20)

یہ لوگ ایمان لائے ہی نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے عمل اکارت کر دیئے۔

(۱۱) **ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْطَبَ اَعْمَالَهُمْ** ﴿١٠﴾ (محمد: 10)

یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے اس کلام کو جو خدا تعالیٰ نے اتارا ناپسند کیا۔ سو خدا تعالیٰ نے ان کے عمل اکارت کر دیئے۔

چھٹی آیت

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ
الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ ۗ (البقرة: 144)

اور (اے پیغمبر!) جس قبلہ پر تم (پہلے) تھے (یعنی بیت المقدس) یا جس قبلہ پر تم ہو (یعنی کعبہ) ہم نے اس کو اس غرض سے مقرر کیا تھا تا ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اپنے الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے اور مدینہ میں ہجرت کے بعد قریباً ڈیڑھ سال تک مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس رہا۔ یعنی نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کیا جاتا تھا اس کے بعد بیت المقدس کی بجائے مکہ معظمہ قبلہ مقرر کیا گیا۔ یہ دونوں قبلے بطور ابتلاء کے تھے۔ مکہ میں کوئی یہودی نہیں تھا اور مکہ کے لوگ کعبہ کی عزت کرتے تھے اور نسلًا بعد نسل اس کو اپنا دینی مرکز سمجھتے تھے اور ان کے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ کعبہ کو چھوڑ کر وہ بیت المقدس کو جو یہود کا قبلہ تھا اپنا قبلہ مقرر کریں اور صرف ایسے ہی لوگ کعبہ کو چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف منہ پھیر سکتے تھے جو سچے دل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔ خواہ وہ ان کے طبعی میلان اور ان کی روایات اور مذہبی جذبات کے کیسے ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ اس لئے مکہ میں اہل مکہ کے لئے بیت المقدس کا قبلہ ایک امتحان تھا۔ اور اس امتحان میں وہی پاس ہو سکتے تھے جو مخلص مومن ہوتے تھے۔ لیکن جب مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حالات بالکل اس کے خلاف تھے۔ یہاں یہود کی قومیں آباد تھیں جو بیت المقدس کو اپنا قبلہ سمجھتی تھیں اور ان کے لئے بیت المقدس سے منہ موڑ کر کعبہ کی طرف منہ کرنا ایک موت تھی۔ مگر بیت المقدس کی طرف منہ کرنا عین ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق

تھا اور اس کی طرف مسلمانوں کے ساتھ مل کر منہ کرنا ان کے لئے چنداں دشوار نہ تھا اور بہت سے یہودی منافقانہ طور پر مسلمانوں میں ملنے شروع ہو گئے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا شروع کیا ایسے لوگوں کے امتحان کے لیے اور منافقوں اور کمزوروں کو مخلصین کی جماعت سے الگ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کیا کہ بیت المقدس جو چودہ پندرہ سال سے مسلمانوں کا قبلہ مقرر تھا اس کو ترک کر دینے کا حکم دیا۔ پس یہ دونوں قبلے بطور ابتلاء کے مقرر کئے گئے اور اس ابتلاء کی غرض اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے **لِيَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ** (البقرة: 144) تاہم یہ ظاہر کر دیں کہ رسول کا سچا تابع کون ہے اور کون اپنی ایڑیوں پر واپس لوٹ جاتا ہے۔

پس اس آیت کریمہ سے یہ ثابت ہو کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچا ایمان نہیں ہے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں وہ اسلام میں سے نکل جائیں اور مسلمانوں کی جماعت میں صرف مخلصین کا گروہ باقی رہے اور اللہ تعالیٰ خود ایسے سامان پیدا کرتا ہے جس کی رو سے کچے لوگ مسلمانوں میں سے نکل جائیں اور اسلام کو چھوڑ دیں۔ غرض خدا تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ جو لوگ ارتداد اختیار کرنا چاہیں وہ بڑی خوشی سے مرتد ہو کر اسلام سے الگ ہو جائیں۔ یہی خدا تعالیٰ کا منشاء ہے تا اسلام خس کم جہاں پاک کا مصداق ہو مگر قتل مرتد کے حامی اسلام کی طرف ایسی تعلیم پیش کرتے ہیں جس کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ جھوٹے اور بے ایمان لوگ اسلام کے اندر ہی شامل رہیں اور وہ کبھی اسلام کو نہ چھوڑیں۔ پس ایسی تعلیم اس خدائے قدوس کی نہیں ہو سکتی ہے جو چاہتا ہے کہ ایسے لوگ اسلام میں سے نکل جائیں اور خود ان کے نکالنے اور اسلام سے خارج کرنے کے سامان پیدا کرتا ہے۔

تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ کے موقع پر جو اللہ تعالیٰ کا اس حکم سے منشاء تھا

وہ پورا ہوا اور بہت سے لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے۔ تفسیر ابن جریر جلد نمبر 2 صفحہ 8 میں لکھا ہے:-

”حتی ارتد فیما ذکر رجال ممن کان قد اسلم“

پھر اسی تفسیر کے صفحہ 9 پر لکھا ہے:-

”قال ابن جریر بلغنی ان ناسا ممن اسلم رجعوا فقالوا امرۃ ہلہنا

ومرۃ ہلہنا. (ابن جریر جلد نمبر 2 صفحہ 9)

مگر اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان مرتدین کو قتل کی سزا دی گئی؟ پس یہ آیت بھی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ مرتدین کی سزا اسلام میں قتل نہیں ہے۔

ساتویں آیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ
يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ
يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۗ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ
يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾ (المائدة: 55)

مسلمانو! تم میں سے اگر کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ (اس کے بدلہ میں) ایک ایسی قوم لے آئے گا جن کو وہ دوست رکھتا ہوگا اور اس کو وہ دوست رکھتے ہوں گے، مسلمانوں کے ساتھ نرم، کافروں کے ساتھ کڑے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوشش کرنے والے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کچھ باک نہیں رکھیں گے۔ یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور بڑا جاننے والا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو بشارت دیتا ہے کہ اگر کوئی بد قسمت تم میں سے مرتد ہو جائے تو تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے بلکہ تمہیں خوش ہونا چاہیے کیونکہ اگر ایک تم

میں سے ارتداد اختیار کر کے جماعت اسلامی سے نکلے گا تو اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ مخلص اور مجاہد مومنین کی ایک جماعت لائے گا۔

یہ آیت کریمہ مدینہ میں اتری جہاں کہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی مگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ نہیں کہتا کہ اگر تم میں سے کوئی ارتداد اختیار کرے تو تمہیں ایسے شخص کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ اسلام میں ہی رہے اور اگر وہ اسلام میں داخل ہونے سے انکار کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیے بلکہ فرماتا ہے کہ ایسے موقع پر تمہیں کچھ غم نہیں کرنا چاہیے کہ کیوں یہ شخص اسلام کو چھوڑتا ہے اگر وہ اسلام کو چھوڑنا چاہتا ہے تو اسے چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ ایک ارتداد کرنے والے کے بدلے میں ایک جماعت تمہیں دے گا۔

جب یہ صورت تھی مسلمانوں کو کیا ضرورت تھی کہ مرتدین کو مجبور کریں کہ وہ اسلام میں دوبارہ داخل ہوں اور مسلمانوں کی جماعت میں ایک منافق کا اضافہ کر کے خدا کے اس فضل کو روکیں جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی جماعت میں ایک مخلص قوم کا اضافہ کرنا تھا۔ پس اس آیت کریمہ کا مفہوم بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ حکم نہیں ہے کہ وہ قتل کی دھمکی دے کر لوگوں کو ارتداد سے روکیں اور ارتداد اختیار کرنے والوں کو قتل کر دیں۔

آٹھویں آیت

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ

كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (البقرة: 110)

مسلمانو! اکثر اہل کتاب باوجودیکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے پھر بھی اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔

اس آیت کریمہ میں بھی یہ موقع تھا کہ مسلمانوں کو ڈرایا جاتا کہ اگر تم یہود کے بہکانے سے اسلام سے پھر گئے تو تمہیں قتل کی سزا دی جائے گی مگر یہاں کسی ایسی سزا کا ذکر نہیں۔ علاوہ ازیں یہود کا

حسد کی وجہ سے یہ خواہش کرنا کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین کو چھوڑ کر اپنا پہلا کفر اختیار کر لیں یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس طرح دین کے چھوڑنے والوں کو کوئی سزا نہیں دی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ یہ یہود تمہارے دشمن ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں مرتد بنا کر قتل کروادیں۔ پس اس آیت کریمہ کا مفہوم بھی اسی امر پر دال ہے کہ مرتدین کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔

نویں آیت

وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَن يَصَرَ اللَّهُ سَيِّئًا (ال عمران: 145)

اور جو اپنے اٹھے پیروں کفر کی طرف لوٹ جائے گا تو وہ خدا تعالیٰ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔

یہ آیت کریمہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ مرتد کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اول تو یہاں باوجود موقع ہونے کے کسی ایسی سزا کا ذکر نہیں کیا گیا۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ایسا شخص خدا کا یعنی اسلام اور مسلمانوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا ظاہر کرتا ہے کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں تھی کیونکہ اگر ایک شخص نے مرتد ہوتے ہی قتل کیا جانا تھا تو پھر بگاڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا جس نے فوراً قتل ہو جانا ہو وہ کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

دسویں آیت

وَمَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ (البقرة: 109)

اور جو ایمان کے بدلے کفر اختیار کرے تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

یہاں بھی اس بات کا موقع تھا کہ اگر ارتداد کی کوئی دنیوی سزا تھی تو اس کا ذکر کیا جاتا۔ یہاں صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ ایسا شخص سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کے لئے صرف اُخروی سزا ہو سکتی ہے۔ جو شخص سیدھے راستے سے

بھٹک جائے اس کو قتل نہیں کر دیتے بلکہ وہ اپنی غلطی کا خمیازہ آخرت میں بھگتتا ہے۔ صرف راستہ سے بھٹک جانا ایسا فعل نہیں جس کے لئے انسانی فطرت قتل کی سزا تجویز کرے۔ ایک معمولی فطرت کا انسان بھی اس سے کراہت کرے گا کہ کسی شخص کو محض صحیح راستہ سے بہک جانے کی وجہ سے قتل کر دیا جائے چہ جائیکہ اسلام جیسے پاکیزہ اور مطہر مذہب کے متعلق یہ خیال کیا جاوے کہ وہ ایسے فعل کے لئے قتل کا حکم دیتا ہے۔ پس یہ آیت کریمہ بھی دوسری آیات قرآنی کی طرح اس اٹہام کو بے بنیاد ثابت کرتی ہے کہ ارتداد کی سزا اسلام میں قتل ہے۔



حامیانِ قتلِ مرتد کے دلائل پر نظر

اب ہم قرآن شریف کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر نظر کر چکے ہیں اور دیکھ چکے ہیں کہ قرآن شریف اول سے لے کر آخر تک ضمیر کی آزادی کے اصول کو قائم رکھتا ہے اور کسی قسم کے جبر و اکراہ کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی تعلیم کے محل میں ہم مختلف دروازوں سے داخل ہو چکے ہیں اور اس کے ایک ایک کونہ کو دیکھا ہے کہیں بھی قتلِ مرتد کی تعلیم کی ذرہ بھر بھی تائید نہیں پائی جاتی۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعلیم قرآن شریف کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اور ایسی تعلیم کو قرآن جیسی کتاب کی طرف منسوب کرنا ایک ظلمِ عظیم ہے۔

مولوی شبیر احمد صاحب کی پیش کردہ آیت

اب مناسب ہے کہ حامیانِ قتلِ مرتد کے دلائل کو بھی دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک صحت اور درستی پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلے میں مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی کے دعویٰ کو لیتا ہوں۔ وہ اپنے ایک رسالہ ”الشہاب“ میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں بہت سی آیات ہیں جو مرتد کے قتل پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن ایک آیت کریمہ میں قتلِ مرتد کا حکم نہایت تصریح اور ایضاح کے ساتھ پایا جاتا ہے اور وہ آیت یہ ہے

إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعَجَلِ فَتُوبُوا إِلَيَّ يَا رَبِّكُمْ
فَأَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (البقرة: 55)

جس کا ترجمہ مولوی صاحب اس طرح پر کرتے ہیں۔

”اے قوم بنی اسرائیل! تم نے پچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ تو اب خدا کی

طرف رجوع کرو پھر اپنے آدمیوں کو قتل کرو۔“

اور مولوی صاحب اس آیت کی تفسیر اس طرح پر کرتے ہیں کہ قوم میں سے جن لوگوں نے بچھڑے کو نہیں پوجا تھا ان میں سے ہر ایک نے اپنے عزیز و قریب کو جس نے گوسالہ پرستی کی تھی اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور اس آیت کریمہ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ گوسالہ پرست مرتد ہو گئے تھے اس لئے ان پر گوسالہ پرستی کے جرم میں یہ حد جاری کی گئی کہ ان کو قتل کر دیا گیا اور قرونِ خالیہ کے جن احکام و شرائع کو قرآن نے نقل کیا ان کی پیروی و اتباع ہمارے لئے ضروری ہے جب تک کہ خاص طور پر ہمارے پیغمبر یا ہماری کتاب اس حکم سے ہم کو علیحدہ نہ کر دیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم بھی اس واقعہ سے سبق حاصل کر کے مرتدین کو قتل کر دیا کریں۔

پھر ساتھ ہی مولوی شبیر احمد صاحب یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان مقتولین نے قتل سے پہلے توبہ بھی کی تھی اور اس کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

وَلَمَّا سَقَطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا لَيْسَ لَنَا
يَرْحَمَنَا رَبَّنَا وَيَعْفِرْ لَنَا لَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَسِرِينَ (الاعراف: 150)

اور جب وہ شرمندہ ہو گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ گمراہی میں پڑ گئے تھے تو انہوں نے کہا اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمیں معاف نہ کرے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

مگر ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ اگرچہ وہ تائب بھی ہو گئے مگر باوجود توبہ کے ان کو قتل کر دیا گیا۔ فرماتے ہیں کہ ان مقتولین کی تعداد ہزاروں سے کم نہیں تھی اور ان کو محض ارتداد کے جرم میں نہایت اہانت اور ذلت کے ساتھ قتل کیا گیا اور توبہ بھی ان کو خدائی سزا سے محفوظ نہ کر سکی۔ مولوی صاحب کے نزدیک قاتل وہ لوگ تھے جو بنی اسرائیل میں سے اس گوسالہ پرستی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جو لوگ شریک ہوئے تھے ان میں سے

ایک متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑا گیا اور باوجود توبہ کے سب کو ایک ہی دن میں قتل کر دیا گیا۔ نہیں نہیں۔ میں بھول گیا ایک کو چھوڑ دیا گیا یعنی سامری کو۔ باوجودیکہ وہ اس گوسالہ پرستی کا بانی مبنی تھا قتل نہ کیا گیا۔ (بلکہ اس کو بجائے قتل کے بائیکاٹ کی سزا دی گئی۔ غالباً اس لئے کہ دوسرے تائب ہو گئے تھے اور یہ تائب نہیں ہوا تھا۔)

مولوی صاحب کی اس تفسیر پر پہلے تو میں یہ سوال کرتا ہوں کہ مولوی صاحب کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ گوسالہ پرستوں کو قتل کرنے کا حکم ان لوگوں کو دیا گیا جو گوسالہ پرستی میں شریک نہیں تھے؟ یہ ان کو کس طرح معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کے کیمپ میں دو گروہ تھے ایک وہ جو گوسالہ پرستی میں شریک ہوئے اور ایک وہ جو اس سے مجتنب رہے؟ ایسے گروہ کا نہ تو قرآن شریف سے پتا چلتا ہے نہ بائبل سے۔ پس اگر مولوی صاحب اپنی تفسیر اور استدلال کو صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ فرض ہے کہ پہلے یہ ثابت کریں کہ جس گروہ کو قتل کی سزا سے مستثنیٰ کیا گیا تھا اور جن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ گوسالہ پرستوں کو قتل کر دیں وہ اس شرک میں شریک نہیں ہوئے تھے؟ جب تک مولوی صاحب اس گروہ کے وجود کا یقینی اور قطعی ثبوت پیش نہیں کریں گے۔ ان کی تفسیر اس قابل نہیں کہ اس کی طرف توجہ کی جاوے۔ اور ان کا استدلال سراسر باطل ہے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں خود وہ آیت جس سے انہوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ ہر ایک گوسالہ پرست کو قتل کیا گیا تھا اور صرف انہی لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا جو گوسالہ پرستی میں شامل نہیں ہوئے تھے ان کے معنوں کو رد کر رہی ہے۔ کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم انہی لوگوں کو دیا گیا تھا جو گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوئے تھے اور وہی لوگ اس حکم کے مخاطب تھے۔ مولوی صاحب نے استدلال کرتے وقت آیت کے الفاظ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو جن کو قاتلوا اَنْفُسَكُمْ کا حکم دیتا ہے یہ جرم لگاتا ہے اَنْكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجَلِ۔ مگر مولوی

صاحب فرماتے ہیں کہ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ کا حکم ان لوگوں کو دیا گیا تھا جنہوں نے
استخارہ عجل کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ اب مولوی صاحب فرمائیں کہ ہم کس کس کو سچا سمجھیں۔
اللہ تعالیٰ کو یا مولوی صاحب کو؟

غرض اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ گوسالہ پرستی کے وقت بنی اسرائیل کے
دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو اس فعل میں شریک ہو گئے تھے اور دوسرے وہ جنہوں نے
اس سے اجتناب کیا۔ تب بھی مولوی صاحب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کیونکہ جس آیت میں
قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس میں وہی لوگ مخاطب ہیں جو اس کاروائی میں شریک
ہوئے تھے۔

پس مولوی صاحب کی یہ تفسیر کہ قاتلین وہ لوگ تھے جو اس فعل میں شریک نہیں
ہوئے تھے۔ خود آیت قرآنی کی رو سے غلط ٹھہرتی ہے اس لئے ان کا استدلال بھی باطل
ٹھہرتا ہے۔ جب قاتل بھی گوسالہ پرستی میں شریک تھے تو ان کو کیوں قتل نہ کیا گیا؟
اگر تھوڑی دیر کے لئے مولوی صاحب کی پیش کردہ تفسیر کو صحیح بھی مان لیا جاوے
تب بھی مسئلہ ارتداد کے متعلق اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔ خود مولوی شبیر احمد صاحب
قتل مرتد کے مسئلہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

”مرتد کو اولاً سمجھاؤ۔ اس کے شبہات کا ازالہ کرو۔ اگر وہ خدا کی کھلی کھلی آیات
دیکھنے اور واضح دلائل سننے کے بعد بھی اپنے معاندانہ ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور اپنی
ہوا و ہوس یا اوہام باطلہ کی پیروی سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کی جماعت کو اس کے
زہریلے وجود سے پاک کر دو۔“

پھر اس مسئلہ کی مندرجہ ذیل مثال کے ذریعہ توضیح فرماتے ہیں:-

”ایک شخص اتفاقاً گھوڑے سے گر پڑا۔ ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہڈی کے ریزے ادھر ادھر
گھس گئے۔ سول سرجن کا کام یہی ہے کہ ہڈی کو جوڑے۔ زخم صاف کرے۔ پٹی باندھے

اور مرہم لگائے لیکن اگر کسی تدبیر سے زخم مندمل نہ ہو سکے..... تو کیا اس وقت سول سرجن کا یہ مشفقانہ فرض نہیں ہو جاتا کہ وہ ٹانگ کے مسموم حصہ کو کاٹ کر پھینک دے۔“

پھر لکھتے ہیں:-

”یاد رکھو کہ ارتداد ایک سخت زہریلہ مادہ ہے جو جسم مسلم میں پیدا ہو جاتا ہے۔ خدائی سول سرجن جب اس کی تحلیل یا اخراج کی تدبیر سے تھک جاتے ہیں۔ تو آخر الجیل السیف کے قاعدہ سے اس عضو فاسد کو کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔“

اسی اصول کو دوسرے حامیان قتل مرتد نے بھی تسلیم کیا ہے۔

اب مولوی شبیر احمد صاحب کے مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ارتداد اختیار کرے تو اولاً یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی غلطی سے تائب ہو کر پھر اسلام میں داخل ہو جاوے لیکن اگر وہ تائب نہ ہو تو پھر بامر مجبوری اس کو قتل کر دینا چاہیے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیت پیش کردہ سے مرتد کے متعلق مذکورہ بالا فیصلہ مستطب ہو سکتا ہے؟ جب ہم اس آیت کو اس تفسیر کے ساتھ پڑھتے ہیں جو مولوی صاحب موصوف نے کی ہے تو ہمیں تعجب آتا ہے کہ مولوی صاحب نے اس آیت کو اپنے عقیدہ کی تائید میں کیوں پیش کیا کیونکہ ان کی تفسیر تو بالکل اس اصل کے مخالف پڑتی ہے جو مولوی صاحب نے پیش کیا۔ کیونکہ مرتد کے متعلق مولوی صاحب کا پیش کردہ اصل تو یہ ہے کہ پہلے اسے سمجھاؤ کہ وہ تائب ہو جائے۔ اگر توبہ کرے تو اسے قتل نہ کرو۔ اگر توبہ کرنے سے انکار کرے تو پھر اسے بامر مجبوری قتل کر دو۔

لیکن مولوی صاحب کی تفسیر کی رو سے آیت پیش کردہ کا مطلب یہ ہے کہ مرتد کو کہو کہ وہ توبہ کرے اور جب وہ توبہ کر چکے اور اس کی توبہ بھی سچی توبہ ہو تو پھر اس کے بعد اس کو قتل کر دو۔

اب ناظرین خود انصاف سے بتائیں کہ آیا اس آیت سے مولوی صاحب کے

اپنے پیش کردہ اصول کی تائید ہوتی ہے یا تردید۔ مولوی صاحب نے تو ہمیں مثالیں دے دے کر یہ سمجھایا تھا کہ مرتد کے متعلق پہلے کوشش کرو کہ وہ تائب ہو جائے اور اس کو سمجھانے کے لئے پورا زور لگاؤ اور جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اور کامل مایوسی تک نوبت پہنچ جائے تب لاچار ہو کر قتل کرو۔ مگر مولوی صاحب کی تفسیر یہ کہتی ہے کہ پہلے اس بیمار عضو کے اچھا کرنے کی کوشش کرو اور جب وہ اچھا ہو جاوے تو پھر اس کو کاٹ دو۔ مولوی صاحب! آپ کی ڈاکٹر والی مثال کدھر گئی؟ کیا اس مثال کا یہی مطلب ہے کہ ڈاکٹر کو چاہیئے کہ ٹوٹے ہوئے عضو کی پہلے اصلاح کرے اور جب اس کی اصلاح ہو جاوے اور عضو درست ہو جاوے اور ڈاکٹر اپنے پہلے علاج میں کامیاب ہو جاوے اس کے بعد اسے چاہیئے کہ وہ اس عضو کو کاٹ کر پھینک دے۔ کیا ایسا ڈاکٹر عقلمند کہلائے گا یا پاگل؟

معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو خود یہ بات کھٹکی ہے اور ان کو یہ بات سو جھگٹی ہے کہ ان کی تفسیر خود ان کی اپنے اصل کے خلاف ہے اس لئے انہوں نے ناظرین کی آنکھوں پر یہ کہہ کر پٹی باندھنے کی کوشش کی ہے کہ ”اب بھی بعض اقسام مرتد کے متعلق علماء کا یہی فتویٰ ہے کہ وہ توبہ کے بعد بھی حداً قتل کیا جائے گا۔“ مولوی صاحب نے ایک گول مول بات کہہ کر پردہ ڈالنا چاہا ہے۔ مگر ایسی چال بازیوں سے حق نہیں چھپ سکتا۔

مولوی صاحب کو چاہیئے تھا کہ اس بات کو کھول کر بیان فرماتے کہ وہ کون سے مرتد ہیں جن کے متعلق علماء کا یہ عام فتویٰ ہے کہ باوجود سچی اور خالص توبہ کے بھی ان کو محض ارتداد کے جرم میں قتل کر دیا جاوے۔ تاہم دیکھ سکتے کہ آیا یہ آیت ایسے مرتدین پر چسپاں ہوتی ہے یا نہیں؟ مولوی صاحب کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ بحث اس امر کے متعلق ہے کہ آیا مرتد کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل کرنا واجب یا جائز ہے۔ مولوی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ مرتد کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل کرنا واجب ہے اور اسی امر کے ثابت کرنے کے لئے انہوں نے قلم اٹھایا ہے اور بڑی تحدی سے یہ اڈعا کیا ہے کہ میں اس دعویٰ کو قرآن شریف

سے ثابت کر سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

”یوں تو قرآن کریم کی بہت سی آیات ہیں جو مرتد کے قتل پر دلالت کرتی ہیں لیکن ایک واقعہ جماعت مرتدین کے بحکم خدا قتل کئے جانے کا ایسی تصریح اور ایضاح کے ساتھ قرآن میں مذکور ہے کہ خدا سے ڈرنے والوں کے لئے اس میں تاویل کی ذرہ گنجائش نہیں۔ نہ وہاں محاربہ ہے نہ قطع طریق۔ نہ کوئی دوسرا جرم۔ صرف ارتداد اور تہارتداد ہی وہ جرم ہے جس پر حق تعالیٰ نے ان کے بے دریغ قتل کا حکم دیا ہے۔“

اس دعویٰ کی تائید میں وہ ایک ایسی آیت پیش کر بیٹھے ہیں جس سے ان کی تفسیر کے مطابق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایک شخص ارتداد کرے تو اس کو پہلے سمجھاؤ کہ وہ توبہ کرے اور جب وہ توبہ کر چکے تو پھر اس کے بعد اس کو قتل کر دو۔ اب مولوی صاحب نے دیکھا ہے کہ یہ نتیجہ خود ان کے اپنے قائم کردہ اصل کے خلاف ہے اور تمام حامیان قتل مرتد کے مسلمہ اصول کے مخالف۔ تو انہوں نے اپنے اس مضحکہ خیز استدلال کی بیہودگی کو لوگوں کی نظر سے پوشیدہ کرنے کے لئے یہ حیلہ تراشا کہ بعض اقسام مرتدین کے ایسے بھی ہیں جن کے متعلق علماء کا یہی فتویٰ ہے کہ سچی اور خالص توبہ کے باوجود بھی ان کو قتل کر دیا جائے۔

اول تو مولوی صاحب کا فرض یہ تھا کہ قتل مرتد کے متعلق جو اصل انہوں نے پیش کیا تھا کہ مرتد کو توبہ کا موقع دیا جائے اگر توبہ کرے تو فیہا ورنہ قتل کیا جائے۔ اس اصولی مسئلہ کی تائید میں قرآن شریف سے کوئی آیت پیش کرتے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایک ایسی تفسیر پیش کی جو ان کے قائم کردہ اصول کے بالکل الٹ ہے۔ دوم اگر مولوی صاحب اصل کو چھوڑ کر کسی شاذ اور استثنائی صورت کی پناہ ڈھونڈنا چاہتے ہیں تو وہ کوئی ایسی مثال پیش کریں جو

(۱) خالص ارتداد کی صورت ہو کسی اور چیز کی آمیزش اس میں نہ پائی جائے

(کیونکہ یہی امر ہمارے زیر بحث ہے)

(۲) اس مثال میں یہ بھی ضروری ہو کہ مرتد کو توبہ کا موقع دیا جائے اور توبہ کی تلقین کی جائے تاکہ **فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ** کے الفاظ بھی اس مثال پر چسپاں ہو سکیں۔

(۳) اس مثال میں یہ بھی ضروری ہو کہ وہ مرتد سچے دل سے توبہ کرے اور اس امر کا کوئی شک اور شبہ نہ ہو کہ منافقانہ طور پر توبہ کر رہا ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کا آیت زیر بحث میں ذکر ہے انہوں نے حسبِ اقرار مولوی صاحب سچی توبہ کی اور سچے دل سے وہ اپنی غلطی پر نادم ہوئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی۔

(۴) اس مثال میں یہ بھی ضروری ہو کہ باوجود سچی توبہ اور مخلصانہ ندامت اور پوری پشیمانی کے پھر بھی ایسے لوگوں کا جو اسلام کے ائمہ کہلاتے ہیں اس کے متعلق عام طور پر یہ فتویٰ ہو کہ اس کو قتل کیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی فتویٰ ہو کہ ایسا مقتول اخروی عذاب سے بچایا جائے گا۔ کیونکہ جن مرتدین کا آیت زیر بحث میں ذکر ہے ان میں حسبِ بیان مولوی صاحب یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔

(۵) یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی ایک آدھ مثال نہ ہو بلکہ کئی اقسام کے مرتدین ہوں جن میں یہ سب شرطیں پائی جاتی ہوں اور پھر بھی وہ ائمہ اسلام کے نزدیک واجب القتل ہوں اور پھر جنتی بھی۔ کیونکہ انہی شرائط کے ساتھ یہ آیت اس تفسیر کے ماتحت جو مولوی صاحب نے اس آیت کی ہے ایسی مثالوں پر چسپاں ہو سکتی ہے۔

اس جگہ یہ بھی غیر مناسب نہ ہو گا کہ بعض بڑی بڑی تفاسیر کی طرف بھی رجوع کریں اور دیکھیں کہ ان تفاسیر کی رو سے مولوی صاحب کے اس خیال کی کہاں تک تائید ہوتی ہے اور آیا مفسرین بھی اس قتل کو ویسا ہی قتل قرار دیتے ہیں جو مرتد کے لئے تجویز کیا گیا ہے اور آیا ان کے نزدیک بھی مسلمان اس امر میں موسوی شریعت کے پابند ہیں۔ تفسیر کبیر بحوالہ روح البیان جلد ۱ صفحہ ۹۳:-

”وقال في التفسير الكبير و ليس المراد تفسير التوبة بقتل النفس“

بل بيان ان توبتهم لا تتم ولا تحصل الا بقتل النفس وانما كان
كذلك لان الله تعالى اوحى الى موسى ان توبة المرتد لا تتم الا
بالقتل“

یعنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں یہ مراد نہیں کہ قتل نفس کے ذریعہ توبہ کی
تفسیر کی گئی ہے بلکہ یہاں یہ بیان ہے کہ ان کی توبہ اسی وقت پوری ہو سکتی ہے اور حاصل ہو
سکتی ہے جبکہ نفس کو قتل کیا جائے اور یہ بات اس طرح اس لئے تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت
موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ مرتد کی توبہ تب ہی مکمل ہوتی ہے جب کہ اسے قتل کیا جائے۔
اس تفسیر کی رو سے یہ آیت حامیان قتل مرتد اپنی تائید میں پیش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قتل توبہ کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا اور ایک قسم کا کفارہ تھا۔ مگر مرتد
کے لئے جو قتل ہمارے مولوی صاحبان تجویز کرتے ہیں وہ ارتداد کا کفارہ نہیں ہے اور نہ وہ
توبہ کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس قتل کو اس قتل سے حسب بیان تفسیر مذکور کوئی
مناسبت نہیں۔

پھر روح البیان جلد ۱ صفحہ ۹۴ میں لکھا ہے:-

”فقتل منهم سبعون الفا فكان من قتل شهيدا ومن بقى مغفورة ذنوبه
و اوحى الى موسى انى ادخل القاتل والمقتول الجنة هذا على
رواية ان القاتل من المجرمين على ان معنى. فاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ.
ليقتل بعض المجرمين بعضا فالقاتل هو الذى بقى من المجرمين
بعد نزول امر الكف عن القتل.

رُوى ان الامر بالقتل من الاغلال التى كانت عليهم وهى المواثيق
اللازمة لزوم الغلّ ومن الاصر وهو الاعمال الشاقة كقطع الاعضاء
الخاطئة وغيرها فهذه الامور رفعت عن هذه الامة تكريماً للنبي

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“

”تب بنی اسرائیل میں سے ستر ہزار آدمی مارے گئے اور جو لوگ مارے گئے وہ سب شہید تھے اور جو باقی رہ گئے ان کے گناہ بخش دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ ہم قاتل و مقتول دونوں کو جنت میں داخل کریں گے۔ یہ معنی اس روایت پر مبنی ہیں کہ قاتل مجرمین میں سے تھے۔ اس صورت میں فاقتلوا انفسکم کے یہ معنی ہوں گے کہ مجرمین میں سے بعض دوسرے مجرموں کو قتل کر دیں۔ اور جب قتل سے رکنے کا حکم آ گیا تو اس وقت جو باقی رہ گئے وہ قاتل ہوئے۔“

اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ قتل کا حکم ان طوقوں میں سے ایک طوق تھا جو بنی اسرائیل کے گلے میں پڑے ہوئے تھے یعنی وہ پختہ اقرار جو ان سے اس طرح چٹے ہوئے تھے جس طرح طوق گلے میں چمٹا ہوا ہوتا ہے اور یہ حکم ان بوجھوں میں سے ایک بوجھ تھا جو ان پر ڈالے گئے تھے یعنی اعمال شاقہ مثلاً ایسے اعضاء کا کاٹ ڈالنا جن کے ساتھ گناہ کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ امور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز کی خاطر امت پر سے اٹھائے گئے ہیں۔“

اس تفسیر کی رو سے بھی یہ آیت قتل مرتد کے حامیوں کے لئے کچھ مفید نہیں ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن کو قتل کیا گیا وہ شہید ہوئے اور یہ کہ یہ قتل ان اعمال شاقہ اور ان بھاری بوجھوں میں سے ہے جو پہلی امتوں پر ڈالے گئے اور جو امت محمدیہ پر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز کی خاطر اٹھا دیئے گئے ہیں۔ پس یہ آیت اس تفسیر کی رو سے بھی قتل مرتد کے سوال سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ کیونکہ بیان مذکورہ کے مطابق یہ قتل اور ہی رنگ کا قتل تھا جو اب منسوخ ہو چکا ہے اور امت محمدیہ میں اب یہ حکم جاری نہیں ہے۔ اسی طرح روح البیان جلد ۱ صفحہ ۹۵ میں فاقتلوا انفسکم کے ایک اور معنی بھی لکھے ہیں اور وہ یہ ہیں:-

فاقتلوا انفسکم بقمع الهوی لان الهوی هو حیات النفس وبالہوی

ادعى فرعون الربوبية وعبد بنوا اسرائيل العجل .
یعنی اپنے نفسوں کو اپنی نفسانی خواہشوں کے قلمع قمع کے ذریعہ قتل کرو کیونکہ نفسانی
خواہشیں نفس کی جان ہیں۔ اور اپنی نفسانی خواہشوں کی وجہ سے فرعون نے خدائی کا
دعویٰ کیا اور انہی خواہشوں کی وجہ سے بنی اسرائیل نے پھڑے کی پرستش کی۔
انہی معنوں کی تائید مفردات راغب کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے:-

”قیل عنى بقتل النفس اماطة الشهوات“

یعنی ایک قول یہ بھی ہے کہ قتل نفس سے مراد شہوات کا مٹانا ہے۔

ان معنوں کی رو سے تو قتل کا سوال ہی اٹھ جاتا ہے اور مولوی صاحب کا ”ایضاح
اور تصریح“ سب بالائے طاق دھرے رہ جاتے ہیں۔

مولوی شبیر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں کسی اور معنی کی گنجائش ہی نہیں مگر پہلے
لوگ اس آیت کے اور معنی لکھ چکے ہیں جن کی رو سے قتل کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اور
مولوی صاحب کی ساری تحدیٰ خاک میں مل جاتی ہے۔
پھر فتح البیان جلد ۱ صفحہ ۱۱۱ میں لکھا ہے:-

”فاقتلوا انفسكم اى اجعلوا القتل متعقبا للتوبة تماما لها.“ یعنی فاقتلوا
انفسكم کے یہ معنی ہیں کہ قتل کے ساتھ توبہ کی تکمیل کرو۔ یہ وہی معنی ہیں جو اوپر لکھے
جا چکے ہیں اور مولوی صاحب کے استدلال کو باطل کرتے ہیں۔
پھر بحر المحیط جلد نمبر ۱ صفحہ ۲۰۸ میں لکھا ہے۔

”وانظر الى لطف الله بهذه الملة المحمدية اذ جعل توبتها فى

الاقلاع عن الذنب والندم عليه والعزم على عدم المعاودة اليه“

یعنی دیکھو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر کیسا لطف فرمایا ہے کہ ان کے لئے توبہ صرف یہی
ہے کہ وہ گناہ سے باز آ جائیں اور اس پر پشیمان ہوں اور آئندہ کے لئے پختہ ارادہ کر

لیں کہ پھر اس کا ارتکاب نہیں کریں گے۔

پھر لکھا ہے:-

”فیه ثلاثۃ اقوال۔ الاول الامر بقتل انفسہم۔ الثانی الاستسلام

بالقتل والثالث التذلیل للاہواء“

اس بارے میں تین قول ہیں۔ اول یہ کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے نفسوں کو قتل کر دیں۔ دوم یہ کہ قتل کے لئے اپنے تئیں حوالہ کر دیا۔ سوم خواہشات کو دبا دیا۔

پھر لکھا ہے:-

”وقیل توبوا الیہ من افعالکم و اقوالکم و طاعاتکم و اقتلوا انفسکم

فی طاعاتہ و قتل النفس عما دون اللہ و عن اللہ بانفراغ من طلب

الجزاء حتی ترجع الی اصل العدم و یبقی الحق کمالم یزل“

(بحر المحیط جلد ۱ صفحہ ۲۰۹)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اپنے افعال، اقوال اور طاعات سے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اپنے نفسوں کو خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں فنا کر دو اور اپنے نفس کا قتل کر دینا ماسوی اللہ سے اور اللہ تعالیٰ سے اس طور پر کہ طلبِ جزاء سے فارغ ہو جاوے یہاں تک کہ اصل عدم کی طرف لوٹ آئے اور حق ہی حق باقی رہ جائے جیسا کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔

یہ تمام تفاسیر مولوی شبیر احمد صاحب کے استدلال کا ابطال کر رہی ہیں اور ان میں سے ایک بھی نہیں جو مولوی صاحب کے لئے کچھ سہارے کا موجب ہو۔ کیونکہ اول تو قتل نفس کے معنی ہی نفسانی خواہشوں کا مٹانا لکھا ہے اور جب ان الفاظ کو ظاہری قتل کے معنی میں لیا گیا ہے تو اس کو توبہ کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور اس قتل کا نام شہادت رکھا ہے۔ اور لکھا ہے کہ پہلی امتوں پر اس قسم کے بوجھ ڈالے گئے تھے اور امت محمدیہ پر

اللہ تعالیٰ نے یہ رحم کیا ہے کہ ان پر ایسے بوجھ نہیں ڈالے اور ان کے لئے سچی توبہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اب مولوی صاحب خود فرماویں کہ یہ تفسیر ان کے استدلال کی تائید کرتی ہیں یا تردید؟

یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ سامری کو قتل کی سزا نہیں دی گئی بلکہ اسے زندہ رہنے دیا گیا ہے صرف اس کے ساتھ میل جول بند کر دیا گیا ہے۔ اگر سامری کو قتل کی سزا دی جاتی تب بے شک مولوی صاحب کا کہیں ہاتھ پڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی نسبت یہ ثابت نہیں کہ وہ تائب ہوا ہو بلکہ اس کے جواب سے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس نے دیا پایا جاتا ہے کہ اس نے کسی پشیمانی کا اظہار نہیں کیا۔ پس اگر اس کو قتل کیا جاتا تو مولوی صاحب کہہ سکتے تھے کہ دیکھو سامری تائب نہ ہوا اور اس کو ارتداد کی سزا میں قتل کیا گیا۔ لیکن یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ جو تائب ہوتے ہیں ان کو حسب تفسیر مولوی صاحب قتل کیا جاتا ہے اور جو تائب نہیں ہوتا اور جو سب سے زیادہ مجرم ہے اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے اس سے مولوی صاحب مرتدین کے متعلق اگر کوئی استدلال کر سکتے ہیں تو یہ کر سکتے ہیں کہ مرتد اگر توبہ کرے تو اسے قتل کر دو اور اگر توبہ نہ کرے تو اسے چھوڑ دو۔ یہ استدلال اگر مولوی صاحب کے مفید مطلب ہے تو بے شک ان کو اجازت ہے کہ وہ ایسا استدلال کر لیں مگر وہ کسی صورت میں اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ مرتد اگر توبہ کرے تو اسے چھوڑ دو اگر توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کر دو۔

مولوی صاحب نے اپنی طرف سے اس بارے میں پیش بندی کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ وہ سامری کے قتل نہ کئے جانے کی ایک وجہ تجویز فرماتے ہیں۔ مگر افسوس کہ قرآن شریف ان کو کہیں ٹھہرنے نہیں دیتا۔ جو سہارا وہ پکڑتے ہیں قرآن شریف اسے گرادیتا ہے۔ مولوی صاحب اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ کیوں سامری کو جو اس ساری شرارت کا بانی تھا قتل نہیں کیا گیا فرماتے ہیں۔

”سامری شرارت کا ایسا ہی بانی تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین، قصہ افک کا بانی اور الذی تولی کبیرہ کا مصداق اعظم تھا مگر حسب روایت صحیحہ اس پر حد قذف جاری نہ کی گئی۔ حالانکہ حضرت حسان بن ثابت وغیرہ مومنین پر حد قذف جاری ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ منافقین سب سے بڑھ کر شرارتیں کرتے ہیں لیکن اپنے نفاق کی وجہ سے دنیا میں قانونی گرفت سے اپنے کو بچاتے رہتے ہیں۔ جھوٹ بولنے اور بات بنا دینے میں ان کو کوئی باک نہیں ہوتا۔ ساری کارروائی کر کے بھی قانونی زد سے اپنے کو بچا لیتے ہیں۔“

مولوی صاحب نے بات تو اچھی بنائی ہے مگر افسوس! یہ عذر یہاں چل نہیں سکتا اور مولوی صاحب حق کی زد سے اپنے کو بچا نہیں سکے۔ اگر عبداللہ بن ابی اپنے تئیں قانونی زد سے بچانے میں کامیاب ہو، تو سامری اپنے تئیں نہیں بچا سکا کیونکہ اس کے خلاف تمام قوم نے شہادت دی کہ گوسالہ پرستی کا بانی مبنی سامری ہی ہے۔ چنانچہ آتا ہے:-

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلَكِنَّا حَمَلْنَا آوْرَارًا
مَنْ زِينَةُ الْقَوْمِ فَقَدْ فَهِمْنَا فَكَذَلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ۗ فَأَخْرَجَ
لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُورٌ (طہ: 88، 89)

ان آیات کریمہ کا ترجمہ مولوی نذیر احمد خان صاحب دہلوی نے حسب ذیل کیا ہے۔
”انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اختیار سے آپ کے ساتھ عہد شکنی نہیں کی بلکہ ہم کو یہ معاملہ پیش آیا کہ قوم کے زیوروں کا بوجھ جو ہم پر لا دا گیا تھا اب (سامری کے کہنے سے) ہم نے اس کو (آگ میں لا) ڈالا اور اسی طرح سامری نے بھی (اپنے پاس کا زیور لا) ڈالا۔ پھر سامری ہی نے لوگوں کے لئے اس کا ایک پھڑا بنا کر نکال کھڑا کیا جس کی آواز بھی پھڑے کی سی تھی۔“

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے جواب طلب کیا تو اس نے اپنے

قصور کا صاف اقرار کیا اور قانون کی زد سے بچنے کے لئے وہ کوئی بات نہ بنا سکا۔

پھر مولوی صاحب کے عذر کا بطلان اس سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جرم کے ثابت ہونے پر اس کو سزا بھی دی اور اس کا جواب سننے کے بعد اس کے خلاف فیصلہ بھی کیا اور وہ فیصلہ یہ ہے:-

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ
وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَنْ تُخْلَفَهُ ۗ (طہ: 98)

”چل اس زندگی میں تو تیری یہ سزا ہے کہ کہتا پڑا پھر کہ دیکھو مجھے کوئی چھو نہ جانا۔ اور اس کے علاوہ تیرے لئے ایک وعدہ اور ہے جو کسی طرح تجھ پر سے ٹلے گا نہیں۔“

پس مولوی صاحب کا یہ عذر غلط ہے کہ اس نے عبداللہ بن ابی کی طرح قانون کی زد سے اپنے تئیں بچا لیا۔ اس پر عدالت نے فرد جرم لگایا اور اس کو سزا بھی دی۔ مگر وہ سزا قتل کی نہیں تھی بلکہ لامساس کہنے کی سزا تھی۔

مولوی صاحب کی پیش کردہ مثال سے ایک مفید نتیجہ

مولوی صاحب کی اس پیش کردہ آیت سے ایک نہایت ہی مفید نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے جس واقعہ کو مولوی صاحب نے بطور مثال کے پیش کیا ہے اس میں ایک مرتد یعنی سامری کا ذکر ہے جو اپنے ارتداد پر قائم رہا۔ مگر پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو قتل نہیں کیا۔ پس اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں ہے کیونکہ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو ضرور قتل کرتے۔ پس خود مولوی صاحب کی اپنی دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں۔ مولوی صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے یہ دلیل مجھے سمجھائی ورنہ میرا ذہن اس طرف نہ جاتا۔ اب مولوی صاحب فرمائیں کہ اس دلیل کا ان کے پاس کیا

جواب ہے؟

ان تمام بزرگوں نے جنہوں نے اس وقت قتل مرتد کی حمایت میں قلم اٹھایا ہے آزادیِ ضمیر کے سوال پر بہت لے دے کی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کی جرح پر بھی ایک نظر کی جائے۔ آزادیِ ضمیر کے اصول پر سب سے زیادہ جرح کرنے والا اخبار الجمعیۃ ہے جو جمعیۃ العلماء کا آفیشل آرگن ہے۔ میں اس کی جرح کو ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ اس جرح سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ عرف عام میں آزادیِ ضمیر کس چیز کا نام ہے اور قرآن شریف کی رو سے اس کا مفہوم کیا ہے یا عمداً جہالت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ الجمعیۃ نے آزادیِ ضمیر کے متعلق کئی شقیں قائم کی ہیں اور ہر ایک شق پر الگ الگ جرح کی ہے اور اس کی ساری جرح کا لب لباب یہی نکلتا ہے کہ وہ یا تو آزادیِ ضمیر کا مفہوم ہی نہیں جانتا یا جان بوجھ کر دھوکہ دیتا ہے۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ہمیں الزام دیتا ہے کہ ہم جانتے ہی نہیں آزادیِ ضمیر کی کیا حقیقت ہے۔ اب میں اس کی ایک ایک شق کو ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

شق اول

اگر ضمیر کی آزادی کا یہ مطلب لیا جاوے کہ ہر فرد جو رائے قائم کرے اور واقعات پر جو حکم لگائے اور مقدمات سے جو نتائج وہ نکالے وہ اس کے حق میں صحیح اور درست ہیں اور ہر شخص اپنی رائے پر عمل کرنے کا مکلف ہے۔ کسی دوسرے کی رائے کو سننا، ماننا، عمل کرنا ضروری نہیں تو اس کا بطلان بدیہی اور واضح ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ضمیر کی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ جو اس شق میں بیان کیا گیا ہے۔ جو لوگ آزادیِ ضمیر کے حامی ہیں ان میں سے کسی کا بھی یہ خیال نہیں کہ ہر ایک شخص کی رائے ضرور درست اور صحیح ہوتی ہے اور نہ کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ کسی

دوسرے کی رائے کو نہ سننا چاہیے اور نہ اس پر غور کرنا چاہیے بلکہ آزادی ضمیر کا صرف یہی مطلب ہے کہ اگر ایک شخص کسی امر کے متعلق کوئی خاص عقیدہ رکھتا ہے تو ہمیں اسے مجبور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس عقیدہ کو ترک کر دے۔ کیونکہ ایسا کرنا ایک احمقانہ حرکت ہے۔ ہم جبر سے کسی کے عقیدہ کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر ہماری رائے میں اس کا عقیدہ غلط ہے تو ہمیں عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ سے اس کی فطرت انسانی کے آگے اپیل کر کے کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی غلطی کو سمجھ جائے لیکن اگر وہ ہمارے سمجھانے کے بعد بھی اپنے غلط عقیدہ کو ترک نہیں کرتا تو ہمیں اس کے غلط عقیدہ کی وجہ سے اس کو دکھ اور عذاب نہیں دینا چاہیے۔ یہ ہے مفہوم آزادی ضمیر کا۔ اگر اس پر کوئی اعتراض پڑتا ہے تو الجمعیۃ کو اختیار ہے کہ اپنے اعتراض کو پیش کرے لیکن اس پر اعتراض کرنا خود قرآن شریف پر اعتراض کرنا ہے کیونکہ قرآن شریف اسی امر کی تعلیم دیتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۱) فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۗ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۗ (الغاشیة: 23)

پس (اے پیغمبر) نصیحت کر کہ تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔ تو ان لوگوں پر داروغہ کے طور پر مقرر نہیں ہے۔

(۲) فَاَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ

اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۗ (النجم: 30)

(اے رسول) تو بھی اس شخص سے منہ پھیر لے اور اس کی پیروی نہ کر جو ہمارے ذکر سے منہ پھیر لیتا ہے اور سوائے دنیا کی زندگی کے اور کچھ نہیں چاہتا۔

(۳) وَاِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ اِنِّي عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلِكُمْ ۗ اَنْتُمْ

بَرِيۡئُوْنَ مِمَّا اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيۡءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۗ (یونس: 42)

اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو انہیں کہہ کہ میرا عمل خود میرے لئے اور تمہارا عمل تمہارے لئے

فائدہ مند یا نقصان دہ ہوگا۔ جو کچھ میں کرتا ہوں اس سے تم بری الذمہ ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں۔

(۴) إِنَّ هَذِهِ تَذْكَرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿۲۰﴾ (المزمل: 20)

یہ قرآن ایک نصیحت ہے پس جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے۔

(۵) قُلِ اللَّهُ أَعْبَدُ مُخْلِصًا لَهُ دِينِي ﴿۱۵﴾ فَأَعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ

مَنْ دُونِهِ (الزمر: 15: 16)

(اے پیغمبر) تو کہہ دے کہ میں اللہ کی عبادت اپنی اطاعت کو صرف اس کے لئے وابستہ کرتے ہوئے کرتا ہوں۔ سو تم اللہ کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو۔

شق دوم

اگر یہ معنی تسلیم کر لئے جاویں کہ ہر شخص مذہبی امور میں کامل آزاد خود مختار ہے جو مذہب چاہے اختیار کرے اور جو عقیدہ چاہے رکھے تو ماننا پڑتا ہے کہ دنیا میں جس قدر مذہبی اعتقادات اور مذہبی خیالات ہیں وہ سب حق و درست ہیں۔

اقول:

آپ کا یہ نتیجہ صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

قُلِ اللَّهُ أَعْبَدُ مُخْلِصًا لَهُ دِينِي ﴿۱۵﴾ فَأَعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ

مَنْ دُونِهِ (الزمر: 15: 16)

یعنی اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہہ دو کہ میں خالص اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں تم اس کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو۔

کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی عبادت کرنا حق اور درست ہے؟

الجمعیۃ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم تو صرف اتنا ہی کہتے ہیں جتنا قرآن شریف فرماتا ہے یعنی ہمارا صرف اتنا فرض ہے کہ ہم لوگوں کو حق پہنچادیں اس کے بعد ان کا اختیار ہے چاہیں قبول کریں چاہیں قبول نہ کریں ہمیں کسی پر جبر نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے اگر الجمعیۃ یہ نتیجہ نکالے کہ اس طرح تمام مذاہب کو سچا ماننا پڑتا ہے تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔

شق سوم

اگر تیسرے معنی لئے جاویں کہ مذہبی عقائد کے متعلق (خواہ غلط ہوں) دنیا میں اس سے تعرض نہ کیا جائے گا اور اس کو سزا نہ دی جائے گی۔ تو اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ جب کسی کے غلط عقیدہ پر غلطی کا حکم لگایا گیا اور فتویٰ دیا گیا کہ یہ عقیدہ اور عمل کفر ہے اور اس کی سزا جہنم ہے تو پھر ضمیر کی آزادی کہاں رہی۔ اگر آزادی دیتے ہیں تو اس کے عقیدہ اور عمل کو جائز قرار دیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں مذہبی سیاست کا وجود نہیں ہونا چاہیے نہ کسی کو زنا کی سزا دی جاوے۔ نہ چوری کی۔ نہ شراب خوری پر مواخذہ ہو۔ نہ بہتان و تہمت پر۔ عمل عقیدہ کی فرع ہے۔ اگر عقیدہ میں سزا دہی نا جائز ہے تو فرع میں سزا دینے کے کیا معنی ہوں گے؟

اقول:

یہ تیسرے معنی بالکل درست ہیں۔ یہی ہمارا مطلب ہے۔ مگر ان معنوں پر الجمعیۃ کی جرح بے بنیاد ہے۔

الجمعیۃ کی یہ منطق ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر کسی کو اس کے مذہبی عقائد کی وجہ سے دنیا میں سزا نہ دی جاوے تو اس سے کس طرح لازم آتا ہے کہ وہ عقیدہ جائز ہو گیا۔ سورۃ معارج میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَذَرَهُمْ يَخْضَوْنَ وَيَلْعَبُونَ حَتَّىٰ يَلْقُوا يَوْمَهُمُ
الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿٤٣﴾ (المعارج: 43)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کفار کو جو دین کے متعلق خوض و لعب میں مصروف ہیں ان کے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ وعدہ کا دن آجائے۔ اب کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ان کفار کا خوض و لعب جائز تھا؟

الجمعیۃ لکھتا ہے کہ جب کسی کے غلط عقیدہ پر غلطی کا حکم لگایا گیا تو پھر ”آزادی ضمیر کہاں رہی“ معلوم نہیں الجمعیۃ نے آزادی ضمیر کے کیا معنی سمجھ رکھے ہیں۔ آزادی ضمیر کے اس سے زیادہ اور کوئی معنی نہیں کہ عقیدہ کے معاملہ میں کسی پر جبر نہ کیا جاوے۔ یا الجمعیۃ کے اپنے الفاظ میں آزادی ضمیر کے یہ معنی ہیں کہ ”مذہبی عقائد کے متعلق (خواہ غلط ہوں) دنیا میں اس سے تعرض نہ کیا جاوے گا اور اس کو سزا نہ دی جائے گی۔“ اب خدا را الجمعیۃ ہمیں بتائے کہ جب آزادی ضمیر کے وہ معنی لئے جائیں جو اس نے خود شق نمبر ۳ میں بیان کئے ہیں تو ان لفظوں کو ان معنوں میں لیتے ہوئے کس طرح یہ لازم آتا ہے کہ جن لوگوں کو آزادی ضمیر کے اصول کی وجہ سے سزا نہ دی جائے ان کا عقیدہ بھی درست ہے۔ اگر ایک شخص کو اس دنیا میں سزا نہ دی جاوے تو اس سے یہ کس طرح لازم آتا ہے کہ اس کا عقیدہ درست ہے؟

پھر الجمعیۃ لکھتا ہے کہ اگر عقیدہ کی وجہ سے سزا نہ دی جاوے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ عمل کی وجہ سے کسی کو سزا دی جاوے اس لئے اگر آزادی ضمیر کا اصول درست ہے تو ایسی صورت میں مذہبی سیاست کا وجود نہیں ہونا چاہیے۔ نہ کسی کو سزا کی سزا دی جاوے اور نہ

چوری کی۔ عقیدہ اور عمل دونوں میں آزادی ہونی چاہیے۔

اقول:

اگر عقیدہ اور عمل دونو کا ایک ہی حال ہوتا تو اس صورت میں بے شک ضروری تھا کہ دونو میں اس کو آزادی حاصل ہوتی۔ لیکن دونو کا ایک حال نہیں۔ جب عقائد سے گزر کر انسان اعمال کی طرف جاتا ہے تو اس کے بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جن کا ضرر یا فائدہ دوسرے انسان کو پہنچتا ہے اس لئے وہ ان افعال میں اب آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس کی آزادی اس دائرہ تک محدود ہے جہاں تک صرف اس کی ذات کا تعلق ہے۔ لیکن جب اس کے افعال اس دائرہ میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں اس کی غلطی سے دوسرے لوگوں کو ضرر پہنچ سکتا ہے تب اس کی آزادی روکی جاتی ہے کیونکہ اب صرف اسی کی ذات کا سوال نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے حقوق کا بھی سوال ہے اور اس کو کوئی حق نہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچائے اور ان کے حقوق کو تلف کرے۔ اس لئے اگر وہ کوئی ایسا فعل کرنا چاہے گا جس سے دوسروں کو ضرر پہنچتا ہو تو وہاں اس کے ہاتھ کو روک دیا جائے گا اور اس کی آزادی اس سے چھینی جائے گی۔ یہی اصل ہے جس پر تمام شرعی احکام کی بنیاد ہے اور تمام دنیا کی حکومتوں کے قوانین اسی اصول پر جاری ہیں۔ جہاں محض اس کی ذات کا تعلق ہے وہ آزاد ہے لیکن جہاں اس کے افعال کا اثر تمدن پر پڑتا ہے وہاں شریعت کا قانون اور ایسا ہی انسانی حکومتوں کا قانون دخل دے گا۔ معترض کہتا ہے کہ اگر اسے ضمیر کی آزادی حاصل ہے تو پھر اسے اجازت ہونی چاہیے کہ جو چاہے کہے اور جو چاہے کرے۔ نہ چوری کی وجہ سے اس کے ہاتھ کاٹنے چاہئیں اور نہ زنا کی وجہ سے اسے کوڑے لگانے چاہئیں اور نہ شراب خوری کی حد اس پر جاری کرنی چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ان افعال میں وہ آزاد نہیں ہو سکتا کیونکہ ان افعال کا تعلق تمدن سے ہے وہ ایسے افعال میں آزاد نہیں۔ ہاں عقائد

میں اور ایسے اعمال میں جن کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود ہے اس کو پوری آزادی حاصل ہے۔ اگر ایک شخص خدا تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا اور خدا کے آگے گریہ وزاری نہیں کرتا تو ہم اس پر کوئی سزا جاری نہیں کر سکتے لیکن اگر وہ دوسرے کا مال چھینتا ہے یا زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو وہاں شریعت اور انسانی حکومت ضرور دخل دیں گی کیونکہ یہاں وہ تمدن کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ بغیر سزا کے نہیں چھوڑا جائے گا۔

قرآن شریف کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کوئی حکم نہیں دیتا جس کے ساتھ اس کی دلیل بیان نہ کرے۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق جب ہدایت اور گمراہی کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ کسی پر جبر نہ کیا جاوے وہاں یہی دلیل بیان فرمائی ہے کہ چونکہ کسی کی ہدایت یا گمراہی سے دوسروں کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس میں صرف اسی شخص کی اپنی ذات کا تعلق ہے اس لئے اس میں جبر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ الزمر میں فرماتا ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۚ

وَمَنْ ضَلَّ فَاتِّمَامًا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿٤٢﴾ (الزمر: 42)

”ہم نے تجھ پر لوگوں کے فائدہ کے لئے حق کے ساتھ یہ کتاب اتاری ہے پس جس نے راہ پائی اس نے اپنا بھلا کیا اور جو گمراہ ہو گیا تو اس کی گمراہی کا نقصان اسی کو پہنچے گا اور تو ان کا ذمہ دار نہیں ہے۔“

اس آیت کریمہ میں بہت سی دیگر آیات کی طرح یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ایمان اور کفر کے معاملہ میں جبر سے کام نہیں لینا چاہیے اور ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر ایک شخص راہ راست کو اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کا اپنا فائدہ ہے اور اگر راہ راست کو چھوڑتا ہے تو اس میں اس کا اپنا نقصان ہے۔ دوسرے لوگوں کے حقوق کا کوئی نقصان نہیں اس لئے کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے۔

اس آیت میں الجمعیۃ کے اس اعتراض کا بھی جواب آ گیا ہے کہ اگر عقیدہ میں آزادی دی جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ ہر ایک کا عقیدہ درست ہے۔ یہ استدلال قرآن شریف کی متذکرہ بالا آیت سے رد ہوتا ہے کیونکہ اس میں صاف بتلایا گیا ہے کہ اس آزادی سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ سب کے عقائد درست ہیں اور کسی کو آخرت میں سزا نہیں دی جائے گی بلکہ وہی راہ راست پر سمجھے جائیں گے جو خدا تعالیٰ کی بتائی ہوئی راہ کو قبول کریں گے اور جو اس راہ کو اختیار نہیں کریں گے وہ گمراہ سمجھے جائیں گے اور اس کا بدلہ ان کو آخرت میں مل جائے گا۔ اور آزادی کے صرف یہی معنی ہیں کہ ان پر جبر نہ کیا جاوے اور اس دنیا میں عقائد کی وجہ سے ان کو سزا نہ دی جائے۔

کیا اسلام میں داخل ہونے کے بعد اکراہ فی الدین جائز ہے؟

الجمعیۃ کی تمام شقوں کا تصفیہ کرنے کے بعد اب میں ان مولوی صاحبان کی ایک اور دلیل کو لیتا ہوں جس کے ذریعہ انہوں نے قتل مرتد کو لَّا اِکْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرة: ۲۵۷) کے حکم سے خارج کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولوی شاہ حسین صاحب سہسوانی اپنے مضمون مندرجہ زمیندار میں تحریر فرماتے ہیں:-

”داخل فی الاسلام کے لئے اور احکام ہیں اور خارج عن الاسلام کے لئے اور۔ اس بناء پر آیہ شریفہ لَّا اِکْرَاهَ فِي الدِّينِ کا مفہوم کسی طرح بھی مفید مطلب نہیں ہے۔ یہ امر کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہ کیا جائے کسی طرح بھی اس کو مستلزم نہیں کہ قبول اسلام کے بعد انسان جب چاہے اس کا جو اگر دن سے اتار کر پھینک دے۔ معمولی اور موٹی سی بات ہے کہ بادشاہ وقت کسی کو زبردستی اپنی ملازمت میں منسلک نہیں کرتا۔ لیکن جو شخص اس کی ملازمت میں داخل ہو چکا ہے اس کو کبھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی خوشی سے جو چاہے کرے یا جب چاہے اس ذیل سے نکل جائے۔ اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ حسبِ اعمال

سزایاب ہوتے ہیں۔“

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جب ایک شخص ایک دین کو قبول کرتا ہے تو اس پر اس دین کے متعلق بعض پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں جو پہلے ان پر لازم نہ تھیں اور جب تک وہ اس دین میں ہے وہ ان کی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ وہ اس دین کے دوسرے پیروؤں کی طرح ان تمام ضوابط اور قوانین کا پابند ہوگا جو اس دین نے اپنے پیروؤں کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور ان کی خلاف ورزی میں وہ اسی تعزیر کا مستوجب ہوگا جو اس دین میں ایسی خلاف ورزی کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایک دفعہ ایک دین کو قبول کرنے کے بعد پھر اس کو کبھی ترک کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر یہ قاعدہ درست ہے کہ ایک شخص ایک دفعہ ایک مذہب اختیار کرنے کے بعد پھر اس مذہب کو کسی صورت میں ترک نہیں کر سکتا تو یہ قاعدہ جیسا اسلام کے واسطے درست ماننا پڑے گا ویسا ہی دوسرے مذاہب کے لئے بھی درست ماننا پڑے گا۔ جیسا اسلام کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ اس میں داخل ہو لیکن جب ایک انسان اپنی خوشی سے اسے قبول کرتا ہے تو وہ اپنی مرضی سے اس کے قوانین کا جو اپنی گردن پر رکھتا ہے اور اپنے تئیں اس کا پابند بنا دیتا ہے کہ ان کی تعمیل کرے اور خلاف ورزی کی صورت میں اس سزا کو برداشت کرے جو اس کے لئے مقرر کی گئی ہے ایسا ہی دوسرے مذاہب بھی کسی کو مجبور نہیں کرتے کہ وہ ان کو اختیار کریں لیکن اگر ایک شخص اپنی خوشی سے ان کو قبول کرتا ہے تو وہ اپنی مرضی سے ان کے ضوابط کا جو اپنی گردن پر اٹھاتا ہے اور وہ پابند ہے کہ جب تک وہ اس مذہب کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے اس کے قوانین کی پیروی کرے اور عدم تعمیل کی صورت میں اس تعزیر کو قبول کرے جو ایسے موقع کے لئے تجویز کی گئی ہے۔

پس اس قاعدہ میں عقلاً اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ یہ قاعدہ اگر معقول ہے تو سب مذاہب کے لئے عام ہونا چاہیے اور مولوی شاکر حسین صاحب سہوانی

نے اپنے دعویٰ کی معقولیت ثابت کرنے کے لئے جو مثال دی ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ اسلام کے لئے خاص نہیں بلکہ سب مذاہب کے لئے عام ہے کیونکہ اگر وہ مثال درست ہے تو وہ صرف اسلام پر چسپاں نہیں ہوتی بلکہ تمام ادیان پر۔ اس لئے مولوی شاہ حسین صاحب کا پیش کردہ قاعدہ درست اور صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس مذہب میں کوئی شخص ایک دفعہ داخل ہو جاوے خواہ اسلام یا کوئی اور مذہب پھر اس کا کوئی حق نہیں کہ وہ اس مذہب کو کسی صورت سے ترک کر سکے۔ اب اگر اس کے لئے اس مذہب سے نکلنے کا کوئی دروازہ ہے تو وہ موت کا ہی دروازہ ہے اور کوئی راہ نہیں۔ لیکن یہ بدابتناً باطل ہے۔ کیا مولوی شاہ حسین صاحب اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ اگر ایک شخص مسیحی مذہب اختیار کرے تو پھر وہ پابند ہو جاتا ہے کہ تادم مرگ مسیحی مذہب پر ہی قائم رہے اور اس کو کوئی حق نہیں کہ وہ مسیحی مذہب چھوڑ کر کوئی دین قبول کرے؟

مولوی صاحب! یہ ہے نتیجہ آپ کی دلیل کا۔ اس سے تو لازم آتا ہے کہ جس مذہب کو ایک دفعہ انسان قبول کرے اس کو اختیار نہیں رہتا کہ پھر اس مذہب کو ترک کر سکے۔ جب تک کہ وہ کسی مذہب کو قبول نہیں کرتا اس وقت تک وہ آزاد ہے جس مذہب کو چاہے قبول کرے۔ لیکن جو نبی کہ وہ ایک مذہب کو قبول کرتا ہے اس کی آزادی چھینی جاتی ہے اور وہ آزادی کا قانون جس سے وہ پہلے فائدہ اٹھا سکتا تھا اب اس سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جاتا ہے کیونکہ اب وہ قاعدہ اس پر جاری نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ ”یہ معمولی اور موٹی سی بات ہے کہ بادشاہ وقت کسی کو زبردستی اپنی ملازمت میں منسلک نہیں کرتا لیکن جو شخص اس کی ملازمت میں داخل ہو چکا ہے اس کو کبھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب چاہے اس ذیل سے نکل جائے۔“ مولوی صاحب! بے شک یہ ”معمولی اور موٹی سی بات ہے“ مگر کیا وجہ ہے کہ ”یہ معمولی اور موٹی سی بات“ صرف اسلام پر چسپاں ہو سکے اور دوسرے ادیان پر چسپاں نہ ہو سکے؟ کیوں یہ مثال ہندو مذہب یا مسیحیت یا بدھ مذہب وغیرہ پر

چسپاں نہ کی جائے؟

مولوی صاحب! کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ اس مثال کو اپنے لئے خاص کر لیں دوسروں کو اجازت نہ دیں کہ وہ بھی اس مثال سے آپ کی طرح فائدہ اٹھائیں؟ مولوی صاحب! اگر یہ مثال درست ہے تو اس سے تو یہ بھی لازم آتا ہے کہ کسی غیر مذہب کے آدمی کو اپنے مذہب میں داخل نہ کیا جاوے کیونکہ وہ تو ایک دوسرے آقا کا ملازم ہے۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم اس کو اپنی ملازمت میں داخل کر لیں۔ وہ تو اپنے پہلے آقا کی ملازمت چھوڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ آپ کا قاعدہ اس بات سے مانع ہے کہ کوئی شخص اپنے آقا کی ملازمت کو چھوڑ سکے۔

امید ہے کہ اس وقت تک مولوی صاحب پر یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ ان کی پیش کردہ دلیل بالکل لغو اور لچر ہے اور وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ اگر کوئی شخص ایک دفعہ ایک دین کو قبول کر لے تو وہ اس دین کو ترک کرنے کے معاملہ میں اب بھی ویسا ہی آزاد ہے جیسا کہ وہ اپنے سابقہ دین کو ترک کرنے کے لئے آزاد تھا۔

لیکن میں ایک اور طریق سے بھی مولوی صاحب کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مولوی صاحب! آپ اپنی ہی پیش کردہ مثال پر مزید غور فرماویں۔ کیا بادشاہان وقت استعفا بھی منظور فرمایا کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا تمام مہذب سلطنتوں میں استعفا کا رواج بھی جاری ہے یا نہیں؟ پس اگر آپ کی ہی مثال کو لیا جاوے تب بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک دین کو قبول کرنے کے بعد پھر اس سے مستعفی ہو سکتا ہے۔ اس کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ مثال ایک لطیف سبق سکھاتی ہے اور میں مولوی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مثال کو پیش کیا۔ دراصل اگر مولوی صاحب اسی اپنی پیش کردہ مثال پر غور فرماویں تو یہی اکیلی مثال ان کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔ میں مولوی صاحب کی ہی مثال کو لے کر مولوی صاحب سے ایک سوال کرتا ہوں اور اس کا جواب ان سے مانگتا ہوں۔ مولوی صاحب مجھے بتائیں! ایک شخص بادشاہ وقت کی

ملازمت میں داخل ہوتا ہے لیکن بعد میں ثابت ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے فرائض کے ادا کرنے کے ناقابل ہے۔ نہ یہ اپنے کام کو خوبی سے ادا کر سکتا ہے نہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور نہ یہ دل سے سرکار کا خیر خواہ ہے۔ اب مولوی صاحب بتائیں! ایسے شخص کی نسبت بادشاہ وقت کیا کارروائی کرے گا؟ کیا وہ ایسے ذرائع اختیار کرے گا کہ ایسا شخص کبھی اس کی ملازمت سے الگ نہ ہو یا فوراً اس کو اپنی ملازمت سے الگ کر دے گا؟ میں یقین کرتا ہوں کہ مولوی صاحب یہی جواب دیں گے کہ ایسا شخص اس قابل نہیں کہ بادشاہ وقت کی ملازمت میں رہے۔ ایسے شخص کو فوراً علیحدہ کر دینا چاہیے۔

اب مولوی صاحب اپنے اصول کو دیکھیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم کسی کو جبراً اسلام میں داخل نہیں کریں گے اور اس صورت میں لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ پر عمل کیا جائے گا۔ لیکن جب ایک شخص ایک دفعہ اسلام کو قبول کر چکے تو پھر وہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو جبراً اسلام میں رکھا جائے گا اور اس کو اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اسلام کو ترک کرے۔ اب میں مولوی صاحب کی مثال کو لے کر مولوی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایسا شخص اس ملازم کی طرح نہ ہوگا جو دل سے سرکار کا خیر خواہ نہیں ہے جو اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جاوے اور نہ وہ اس قابل ہے کہ اپنے فرائض کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔ وہ کون سی خوبی ہے جو ہمارا بادشاہ اپنے بندوں سے چاہتا ہے۔ کیا وہ یہی نہیں

قُلْ اِنِّيْ اَمَرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لِّهٖ الدِّيْنَ (الزمر: 12)

(اے رسول) تو کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ اطاعت صرف اسی کے لئے مخصوص کر دوں۔

پس کیا ایسا شخص اس خدمت کو بخوبی ادا کر سکے گا؟ کیا وہ اس قابل ہوگا کہ اخلاص کا خراج اپنے بادشاہ کے حضور پیش کرے؟ ہرگز نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے شخص کو جبراً

اسلام میں رکھا جاوے؟

پس مولوی صاحب کی اپنی ہی مثال مولوی صاحب کو یہ سبق سکھاتی ہے کہ قبول اسلام کے بعد بھی ایمان کے معاملہ میں اکراہ جائز نہیں ہے۔ اگر ایک شخص اسلام سے الگ ہونا چاہتا ہے تو اس کو ہونے دو۔ اس کو جبر کر کے اسلام میں رکھنا اسلام کی خدمت نہیں بلکہ اسلام کو نقصان پہنچانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت منافقین کے وجود سے ہمیشہ پاک اور صاف رہے۔

اس موقع پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ قتل مرتد کے دعویداروں نے جس قدر دلائل قتل مرتد کی تائید میں پیش کئے ہیں ان سب میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ اس زور کے ساتھ دیگر مذہب کے پیروؤں کی طرف سے بھی پیش کئے جاسکتے ہیں اور ان کی بناء پر ہر ایک مذہب کے پیرو کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمارے مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کرے گا تو ہم پر واجب اور لازم ہے کہ ہم ایسے شخص کو قتل کر دیں۔

مولوی صاحبان اپنے زعم میں اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ اسلام میں مرتد کا قتل کرنا واجب ہے مگر وہ اس امر کو بھول جاتے ہیں کہ جو دلائل وہ پیش کر رہے ہیں وہ جیسے مسلمانوں کی طرف سے پیش کئے جاسکتے ہیں اسی طرح مسیحیوں اور ہندوؤں کی طرف سے بھی پیش کئے جاسکتے ہیں اور اگر مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اسلام سے ارتداد اختیار کرنے والے کو قتل کر دیں تو اسی طرح مسیحیوں اور ہندوؤں کا بھی حق ہے کہ وہ تمام ان لوگوں کو قتل کر دیں جو ان میں سے اسلام کو قبول کریں۔

اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ ان مولوی صاحبان کے دلائل اگر صحیح تسلیم کئے جاویں تو ان سے ان کفار مکہ کی بھی تائید ہوتی ہے جنہوں نے ان لوگوں کو قتل کیا جو ان میں سے نکل کر اسلام قبول کرتے تھے اور جن کے دست تعدی کو روکنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو تلواریں اٹھانے کا حکم دیا۔ اگر یہ دلائل درست ہیں تو نہ صرف

مکہ کے صنادید مسلمانوں کو دکھ دینے میں حق پر تھے بلکہ یروشلم کے فریسی اور فقیہ اور نمرود اور فرعون اور وہ تمام لوگ حق پر تھے جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں آباؤی دین ترک کرنے والوں کو دکھ دیا اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ کیونکہ جو دلائل آج ریاست کاہل کے امیر اور علماء کے فعل کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں وہی دلائل یہ لوگ اپنی تائید میں پیش کر سکتے تھے اور یہی امر ان دلائل کے غلط ہونے کے لئے کافی دلیل ہے کیونکہ ان سے ایسے افعال کی تائید ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ اپنی پاک کتاب میں ظلم اور تعدی قرار دے چکا ہے۔

کیا قتلِ مرتد اسلام کو بے حرمتی سے بچانے کیلئے ضروری ہے؟

ایک اور دلیل جو قتلِ مرتد کی تائید میں پیش کی گئی یہ ہے کہ اسلام کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے مرتد کا قتل کرنا ضروری ہے۔ مولوی ظفر علی خان صاحب لکھتے ہیں۔

”از برائے خدا مجھے بتائیں کہ آخر اس قانون کو جس کا نام اسلام ہے بے حرمتی سے بچانے کے لئے واضح قانون کو کسی تدبیر کے اختیار کرنے کا حق بھی حاصل ہے یا نہیں؟“

میں مولوی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک غیر مذہب کا شخص انہی کے الفاظ میں ان سے یہی سوال کرے تو وہ اس کو کیا جواب دیں گے؟ ایک سنتان دھرمی راجہ اپنے ملک میں یہ قانون جاری کرتا ہے کہ جو شخص اس کی رعایا میں سے مسیحیت یا اسلام کو قبول کرے تو اس کو قتل کیا جائے اور اس کی تائید میں یہی دلیل پیش کرتا ہے کہ میں اپنے دھرم کا محافظ ہوں اور میرا فرض ہے کہ جو شخص اس مذہب کو ترک کر کے اس کی بے حرمتی کرتا ہے میں اس کو سزا دوں اور اس طرح اپنے دھرم کو بے حرمتی سے بچاؤں۔ کیا مولوی صاحب اس کے اس فعل کو اس دلیل کی وجہ سے جائز قرار دیں گے؟ مولوی صاحب! آپ ایسے

دلائل کیوں دیتے ہیں جن سے ظلم کی حمایت ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ایک غلط عقیدہ کی تائید کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے جو دلائل آپ اس کی حمایت میں پیش فرماتے ہیں لازماً اس سے باطل کی حمایت پیدا ہوتی ہے۔

نیز آپ نے اپنی دلیل میں بے حرمتی کا لفظ غلط طور پر استعمال کیا ہے۔ اگر ایک شخص ایک مذہب کا پابند ہونے کا مدعی ہو اور اس کے تمام احکام کو درست ماننا ہو پھر وہ اس کے قوانین کی عمداً خلاف ورزی کرے تب کہا جائے گا کہ اس نے اس قانون کی بے حرمتی کی ہے۔ جب تک وہ ایک مذہب کے پیروکار ہونے کا مدعی ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے قوانین کا احترام کرے اور خلاف ورزی کی صورت میں وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر مقررہ حدود جاری کی جائیں۔ لیکن اگر وہ اس مذہب کو ترک کر کے کوئی اور مذہب اختیار کرتا ہے تو وہ اس فعل کے ساتھ ہی اس مذہب کے دائرہ عمل سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص ایک حکومت سے نکل کر دوسری حکومت میں چلا جاتا ہے اور دوسری سلطنت کی رعایا میں اپنے آپ کو داخل کر دیتا ہے۔ اب وہ پہلی حکومت کے قوانین کا پابند نہیں رہتا بلکہ نئی سلطنت کے قوانین اس پر نافذ ہوں گے۔ ہاں ایک حکومت سے نکل کر دوسری حکومت کی رعایا بننے کے لئے نقل مکانی کی ضرورت ہے۔ مگر ایک دین سے دوسرے دین میں جانے کے لئے کسی نقل مکان کی ضرورت نہیں۔ صرف زبان کا اعلان اس کو ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف منتقل کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں داخل ہونے کے لئے کسی سفر کی ضرورت نہیں کیونکہ مذاہب جغرافیہ کی حدود سے بالا ہیں۔ ظاہری سلطنتیں جغرافیہ حدود کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں جانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی حدود کو طے کیا جاوے۔ لیکن مذاہب کی حکومتوں کو جغرافیہ کی حدود ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتیں۔ دل کی تبدیلی سے انسان ایک مذہب سے دوسرے مذہب

کی طرف چلا جاتا ہے اور زبان اس تبدیلی کا اعلان کرتی ہے۔ اس کے بعد اب وہ اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جو ایک حکومت سے نکل کر دوسری حکومت کی ماتحتی اختیار کرتا ہے اس لئے وہ اپنے سابق مذہب کی حکومت سے باہر چلا جاتا ہے اس لئے اس مذہب کی حدود کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ مولوی ظفر علی خان صاحب خود ایک موقع پر اس اصل کو تسلیم کرتے ہیں اور ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا ایک سلطنت سے نکل کر دوسری سلطنت کے ماتحت چلے جانا اور اس صورت میں وہ اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ پہلے مذہب کے قوانین اس پر جاری نہیں ہو سکتے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:-

”جو شخص آج افغانستان میں سکونت پذیر ہے اور افغانستان کے قوانین کا پابند ہے اگر کل نقل مکانی کر کے ہندوستان میں چلا آئے تو اسے عدالت و قانون کے افغانی شکنجہ میں نہ جکڑنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے جو انگریزی رعایا کے ساتھ ہوتا ہے۔“

مولوی صاحب شاباش! آپ نے کیا ہی سچ کہا ہے! اسی اصول پر میں کہتا ہوں کہ جو شخص ایک مذہب کے قوانین کا پابند ہے اگر کل تبدیلی مذہب کر کے دوسرے مذہب میں چلا جائے تو اسے پہلے مذہب کے قانون کے شکنجہ میں نہ جکڑنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے جو دوسرے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی مسلمان ہندو یا عیسائی بن جائے تو آپ کے اصول ہی کے مطابق اس سے کوئی تعرض نہ کرنا چاہیئے۔

مرتد کس سلطنت کا باغی ہے؟

ایک اور دلیل جو قتل مرتد کی تائید میں پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ ارتداد، اسلام سے بغاوت کا نام ہے اور باغی کی سزا قتل ہے۔ اس لئے مرتد کا قتل واجب ہے۔

اقول:

قتل کا فتویٰ لگانے کے لئے جرم کی کیفیت کو صراحت کے ساتھ بیان کرنا چاہیے اور وضاحت سے اس کی تعیین کرنی چاہیے۔

مرتد کے لئے بغاوت کے جرم پر قتل کا فتویٰ دینے والے اپنا فتویٰ دینے سے پہلے ہمیں یہ بتائیں کہ مرتد کس سلطنت کا باغی ہے؟ کیا مسلمانوں کی ظاہری سلطنت کا یا اسلام کی آسمانی بادشاہت کا؟ کیا ایک شخص محض اپنا دین بدلنے سے مسلمانوں کی ظاہری سلطنت کا باغی ہو جاتا ہے؟ کیا دوسرے دین کی پیروی بغاوت کو مستلزم ہے؟ ریاست کا بل کی نسبت ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہاں مسلمانوں کے علاوہ کئی دیگر مذاہب کے پیرو بھی کثرت سے آباد ہیں اور وہ سب امیرِ کابل کی رعایا ہیں اور امن سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اب اگر ایک شخص ارتداد اختیار کر کے ہندو یا سکھ یا عیسائی ہو جاتا ہے تو اس کا یہ فعل مسلمانوں کی ظاہری سلطنت کے خلاف بغاوت کیونکر کہلا سکتا ہے؟ کیا رعایا کے ایک گروہ سے نکل کر دوسرے گروہ میں شامل ہو جانا بغاوت کہلاتا ہے۔ اس نے ظاہری سلطنت کے خلاف کون سا بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ اسلام کی آسمانی بادشاہت کا ضرور باغی ہے مگر آسمانی بادشاہت کے باغیوں کو آسمانی بادشاہ خود سزا دیتا ہے۔ اس امر میں وہ ہمارا محتاج نہیں۔ اس کے لئے اس نے الگ انتظام کیا ہوا ہے۔ وہ خدمت گزاروں کو انعام دیتا ہے اور باغیوں کو سزا دیتا ہے۔ وفادار رعیت کو قرب کا انعام بخشتا ہے اور جنت کی نعمتیں عطا فرماتا ہے لیکن باغیوں کو جہنم کی آگ میں پھینکتا ہے۔ اسی لئے وہ مرتدین کی نسبت فرماتا ہے:-

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فِيمَتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ
أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۗ هُمْ

فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٨﴾ (البقرة: 218)

اور تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے اور پھر کفر کی حالت میں ہی مرجائے تو یاد رکھے کہ ایسے لوگوں کے اعمال اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اکارت جائیں گے اور ایسے لوگ دوزخ کی آگ میں پڑنے والے ہیں۔ وہ اس میں دیر تک رہیں گے۔

پس مرتد ہماری ظاہری سلطنت کے باغی نہیں بلکہ وہ آسمانی بادشاہت کے باغی ہیں۔ ایسے باغیوں سے ظاہری سلطنت کو کوئی سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ خود ہی ان سے نپٹ لے گا۔ ہمارے سپرد صرف انہی امور کا انتظام ہے جن کا تعلق تمدن سے ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ صرف مرتد ہی اسلام سے باغی نہیں بلکہ ہر ایک ایسا شخص جو اسلام کو قبول نہیں کرتا اسلام سے باغی ہے۔ اسلام کی سلطنت صرف ان لوگوں تک محدود نہیں جو اس کو قبول کرتے ہیں بلکہ اس کے حدود روئے زمین کے کناروں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جنّ و انس سب اس کی رعایا میں داخل ہیں اور تمام دنیا کی قومیں اس بات کی پابند ہیں کہ اس کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک قوم یا ایک ملک یا ایک زمانہ کے لئے نہیں بلکہ تمام قوموں اور تمام ملکوں اور تمام آنے والے زمانوں کے لئے بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ کی دعوت تمام دنیا کی طرف ہے اور آپ کی کتاب کل عالم کے لئے نازل ہوئی ہے اور آپ کا دین روئے زمین کے ہر فرد و بشر کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا: 29)

اور (اے رسول) ہم نے تجھ کو تمام بنی نوع انسان کی طرف جن میں سے ایک بھی تیرے حلقہ رسالت سے باہر نہ رہے ایسا رسول بنا کر بھیجا ہے جو مومنوں کو خوشخبری دیتا اور کافروں کو ہوشیار کرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے:-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف: 159)

(اے پیغمبر) کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل دنیا کے لئے مبعوث ہوئے تو دنیا کی تمام قوموں کا فرض ہے کہ وہ آپ کو قبول کریں اور جن قوموں نے قبول نہیں کیا وہ بھی اسلام سے ایسے باغی ہیں جیسے مرتد باغی ہیں۔ پس اگر اسلام سے بغاوت کی سزا قتل ہے تو دنیا کے تمام کفار کو قتل کرنا چاہیے نہ صرف مرتدین کو۔ مرتدین میں اور دوسرے کفار میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ مرتدین نے ایک دفعہ اطاعت قبول کر کے پھر سرکشی اختیار کی اور دوسرے کفار ابتداء ہی سے سرکش رہے اور اطاعت سے سرے سے ہی انکار کر دیا۔ پس اگر کسی ظاہری سلطنت کی طرف سے ایسے سرکشوں کی سرکوبی کی ضرورت ہوتی تو نہ صرف مرتدین اس سرکوبی کے مستحق تھے بلکہ تمام کفار کی سرکوبی ضروری تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں نہ کفر کی سزا مقرر فرمائی ہے نہ ارتداد کی بلکہ دونوں کی سزا کے لئے آخرت میں جہنم تیار کیا گیا ہے۔ اس دنیا میں کفار اور مرتدین ہر دو کو صرف اس صورت میں سزا دی جائے گی جب وہ اسلامی سلطنت کا مقابلہ کریں یا اسلامی سلطنت کی حدود میں فساد کے مرتکب ہوں ورنہ محض کفر یا ارتداد کے لئے اس دنیا میں کوئی سزا مقرر نہیں۔ دونوں کے لئے اللہ تعالیٰ صرف آخرت کی سزا بیان فرماتا ہے اور بس۔ اگر صرف مرتد کو قتل کیا جاوے اور باقی کفار سے کوئی تعرض نہ کیا جاوے تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ چونکہ مرتد اکا دکا مسلمانوں کے قابو میں ہوتا ہے اس لئے اس کو قتل کر دیتے ہیں اور باقی کفار چونکہ ایک جمعیت رکھتے ہیں اور ان کو قتل کرنا آسان کام نہیں اس لئے ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

آزادیِ ضمیر اور کابل کی سنگساریاں

آزادیِ ضمیر کے اصول پر جرح کرتے ہوئے حامیان قتل مرتد نے ایک اعتراض

یہ کیا ہے کہ اگر آزادی ضمیر کا پیش کردہ اصول درست ہے تو کابل کی سنگساریوں پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں:-

”جن لوگوں کی آزادی ضمیر قتل مرتد کا فتویٰ دے رہی ہے وہ اپنی آزادی کی نمائش کے لئے کہاں جائیں؟ اگر آزادی ضمیر کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص جو چاہے کہے اور جو چاہے کرے تو پھر افغانستان کے ان لاکھوں باشندوں پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جو تہ دل سے قتل مرتد کے معتقد ہیں؟ کیا ان پر اعتراض ان کی آزادی ضمیر سے تعرض نہیں ہے؟“

پیشتر اس کے کہ مولوی صاحب کے سوال کا جواب دوں، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ آزادی ضمیر کے وہ معنی کس نے کئے جن کی بنا پر آپ اعتراض کر رہے ہیں۔ کس نے کہا کہ آزادی ضمیر کے یہ معنی ہیں کہ ہر شخص جو چاہے کہے جو چاہے کرے؟ اگر حامیان عدم قتل مرتد نے ایسا نہیں لکھا تو دنیا کی کسی اور قوم کا نام لوجو آزادی ضمیر کے یہ معنی کرتی ہو جو آپ نے اس کی طرف منسوب کر کے ان پر اعتراض قائم کرنے شروع کر دئے ہیں۔

عدم قتل مرتد کے قائلین کا تو اس سے زیادہ کوئی دعویٰ نہیں کہ اختلاف عقائد کی خاطر یا محض کفر یا ارتداد کی وجہ سے سزا نہیں دینی چاہیے۔ میں اس امر کی اوپر تشریح کر چکا ہوں اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ آزادی ضمیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس کو چاہے قتل کرے۔ جس کو چاہے ذلیل کرے۔ جس کا چاہے مال چھین لے۔ جس کا چاہے حق دبا لے۔ دیکھو سلطنت برطانیہ نے اپنی رعایا کو مذہبی آزادی دے رکھی ہے مگر باوجود اس مذہبی آزادی کے وہ کسی ہندو عورت کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سستی ہو جاوے۔ نہ کسی ہندو کو یہ اجازت دیتی ہے کہ وہ کسی انسان کی قربانی کرے کیونکہ اس کا اثر تمدن پر اور دوسروں کے حقوق پر پڑتا ہے اور آزادی ضمیر کا یہ منشاء نہیں کہ انسان اپنے خیال کے مطابق لوگوں کے حقوق بھی دبا لے۔ پس اگر افغانستان کی آبادی یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ

مرد کو قتل کرنا واجب ہے تو یہ عقیدہ ان کو مبارک ہو لیکن ان کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کو اس طور پر عملی جامہ پہنائیں کہ دوسرے لوگوں کے جان و مال اور عزت کا نقصان کریں۔

مولوی صاحب! افغانستان کی آبادی کا تو یہ بھی عقیدہ ہوگا کہ ایک انگریز کا فر کا قتل کرنا انسان کو سیدھا جنت میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات خود انگریزی علاقہ میں بعض افغانوں نے اپنے اس عقیدہ کے مطابق بے گناہ انگریز عورتوں اور مردوں کو قتل کر کے بہشت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اب مولوی صاحب فرمادیں کہ اگر ایک افغان ایک انگریز کو صرف اس کے کفر کی وجہ سے اس لئے قتل کر دے کہ وہ تہ دل سے اس امر کا معتقد ہے کہ ایک انگریز کا فر کا قتل انسان کو جنت میں پہنچا دیتا ہے تو کیا مولوی صاحب انگریزی عدالت میں اس کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کریں گے کہ انگریزی سلطنت آزادی ضمیر کے اصول کو صحیح تسلیم کرتی ہے اس لئے وہ ایک افغان کے اس فعل کو مکمل اعتراض قرار نہیں دے سکتی۔ آخر جن لوگوں کی آزادی ضمیر اس امر کا فتویٰ دیتی ہے کہ ایک انگریز کا فر کو قتل کرنا کارِ ثواب ہے وہ اگر انگریزوں کو قتل نہ کریں تو اپنی آزادی ضمیر کی نمائش کے لئے کہاں جائیں۔ کیا ایسی دلیل پیش کرنے پر جج مولوی صاحب کی اس دلیل کو ان کے خلل دماغ کی طرف منسوب کر کے ان کو پاگل خانہ میں نہیں بھیج دے گا؟

کیا مولوی صاحب ایک ہندو کو یہ ترغیب دے سکتے ہیں کہ تم بے شک اپنے عقیدہ کے مطابق انسانی قربانی کی رسم ادا کرو میں تمہاری طرف سے جھگڑوں گا کہ ایسے شخص کو سزا دینا مذہبی آزادی کا چھیننا ہے۔ کیا مولوی صاحب ایک ہندو بیوہ کو جس کا خاوند ابھی مرا ہے اور اس کی لاش مرگھٹ کی طرف اٹھا کر لے جا رہے ہیں یہ تلقین کریں گے کہ تو ضرور اپنے خاوند کی پتا میں کود کر سستی کی رسم ادا کر۔ اگر کوئی تجھے روکے گا تو میں تیری طرف سے پریوی

کونسل تک لڑوں گا کہ ایک ہندو استری کوسٹی کی مقدس رسم کے ذریعہ اپنی وفاداری اور جان نثاری کا ثبوت دینے سے روکنا مذہبی امور میں دخل اندازی ہے جو ملکہ و کٹوریہ کے شاہی اعلان کے بالکل خلاف ہے۔

میں پھر مولوی صاحب کو یاد دلاتا ہوں کہ جس آزادی ضمیر کی قرآن شریف تعلیم دیتا ہے اور جس کی صحت کو تمام مہذب دنیا تسلیم کرتی ہے اس کا صرف یہی مطلب ہے کہ اگر ایک شخص کوئی خاص عقیدہ رکھتا ہے تو محض اس کے عقیدہ کی بنا پر اس کو سزا نہیں دینی چاہیے اور نہ اس پر کسی طرح کا جبر کرنا چاہیے۔ اسی طرح اس عقیدہ کی بناء پر اگر وہ کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود ہے دوسروں کے مال و جان و عزت پر اس کا کوئی اثر نہیں تو ایسے فعل کے لئے بھی ہمیں اسے کسی قسم کی سزا دینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہاں سمجھانا ہمارا فرض ہے اگر وہ سمجھے تو آخر الحیل المسیف پر عمل نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ خدا تعالیٰ خود اس سے پوچھ لے گا۔ کسی عقیدہ کی وجہ سے سزا دینا ہمارا کام نہیں۔ حکومت صرف اسی وقت دخل دے سکتی ہے جب وہ لوگوں کے مال یا جان یا عزت یا دوسروں کے حقوق پر حملہ کرے اور تمدن دنیا میں خلل انداز ہو۔

قتل مرتد اور حفاظتِ اسلام

مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی قتل مرتد کی تائید میں ایک بڑی بھاری دلیل یہ دیتے ہیں کہ حفاظتِ اسلام میں اس میں بڑی مدد ملے گی۔ قتل مرتد کے جواز یا وجوب کی صورت میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر مسلمان حکومتیں یہ قانون بنائیں کہ جو شخص اسلام میں سے نکل کر کوئی غیر مذہب مثلاً مسیحیت وغیرہ کو قبول کرے گا تو اس کو قتل کیا جائے گا۔ اور اس بناء پر یہ قاعدہ بھی جاری کریں کہ غیر مسلموں کو ان کے ملک میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غیر مسلم سلطنتیں بھی اسلام کے خلاف ایسا ہی

قانون جاری کریں گی اور اسلام کی اشاعت کا کام بند ہو جائے گا۔

اس اعتراض کے جواب میں مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اول تو اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم ان کو حق بجانب نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کا مذہب جھوٹا ہے اور ہمارا سچا۔ ”تاہم یہ ضرور ہے کہ وہ ایسا کر گزریں تو ہم ان کو روک بھی نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف اگر نو مسلموں کا سلسلہ رک جائے گا تو دوسری جانب پرانے مسلمانوں کا اسلام سے نکلنا بھی بند ہو جائے گا اور میں خیال کرتا ہوں کہ موجودہ دولت کی حفاظت غیر موجود دولت کی تحصیل سے اہم اور مقدم ہے۔“

معلوم ہوتا ہے مولوی صاحب نے یہ سبق ہندوؤں سے سیکھا ہے۔ ہندوؤں کو چونکہ اپنی کمزوری کا علم ہے اس لئے ان کو یہ تو امید نہیں تھی کہ میدان میں نکل کر کسی توحید پرست مذہب پر فتح پالیں گے اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ کسی غیر کو اپنے مذہب میں داخل ہی نہ کیا جاوے اور اپنی موجودہ دولت کی ہر طرح حفاظت کی جاوے اور اسی غرض کے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے چھوت چھات وغیرہ کے قواعد جاری کر دئے تاکہ کسی طرح ہماری حاصل شدہ دولت ہمارے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ مگر اسلام ہندو مذہب کی طرح نہیں ہے وہ ایک فاتح مذہب ہے اس کے ہاتھ میں سچائی کی تلوار ہے اور کسی میں طاقت نہیں کہ اس کے سامنے ٹھہر سکے۔ اس کو اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ اس خوف سے کہ کہیں اس کی دولت چھینی نہ جائے اپنے گھر کے دروازے غیروں پر بند کر دے۔ اس کو اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ غیر مذاہب کے مشنریوں سے اپنی دولت بچانے کے لئے اپنے گھر کے دروازے بند کر دے اور اپنی چار دیواری کے اندر محصور ہو کر بیٹھ جائے۔ یہ تو کمزوری کی علامت ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار ہے جس کے سامنے ایک تثلیث پرست مشنری ایک لمحہ کے لئے ٹھہر نہیں سکتا۔ پھر اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ایسا طریق اختیار کرے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو

جائے۔ وہ جو دلائل کے ساتھ غیر ممالک کو فتح کر سکتا ہے اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنے ارد گرد چار دیواری کھینچ کر گھر میں محفوظ ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ گھر سے باہر نکلے گا اور دشمنوں کو شکست پر شکست دے گا اور نئے ممالک کی تسخیر کر کے اپنے علاقہ کو وسعت دے گا۔ اور اگر اس کے علاقہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہوگا تو وہ اسی دلائل کی تلوار سے اس کو بھی شکست دے گا۔ وہ قلعہ جس میں اسلام محفوظ ہے وہ دلائل اور سچائی کا قلعہ ہے۔ اس کو اپنی حفاظت کے لئے ایسی کچی دیواروں کی ضرورت نہیں جس کو دشمن اپنے ظاہری بازو کی طاقت سے توڑ سکے۔ یہ دیوار جو مولوی صاحب اسلام کے گرد کھینچنا چاہتے ہیں یعنی غیر مذاہب کے مشنریوں کو اسلامی علاقوں میں داخل ہونے سے روک دینا یہ تو نہایت ہی بودی دیوار ہے جس کو دشمن اپنے ظاہری بازو کی قوت سے توڑ سکتا ہے بلکہ یہ دیوار تو اس سے قبل ہی ٹوٹ چکی ہے۔ اگر اسی دیوار پر اسلام کی حفاظت کا دار و مدار تھا تو اب اسلام کی خیر نہیں کیونکہ یہ دیوار تو ہر طرف سے ٹوٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ تو زمین سے پیوست ہو چکی ہے۔ یہ تو اسلام کی دولت کو نہیں بچا سکتی۔ ہندوستان میں کئی کروڑ مسلمان ہیں اب ہندوستان کی دولت کو مولوی صاحب کس طرح دیوار کے ذریعہ بچائیں گے؟ کیا مولوی صاحب کے ہاتھ میں طاقت ہے کہ ہندوستان کے ارد گرد کوئی ایسی دیوار کھینچیں کہ ہندوستان کی حدود کے اندر کوئی مشنری گھسنے نہ پائے؟ کیا مولوی صاحب کے ہاتھ میں کوئی ایسی تلوار ہے جس کے زور سے وہ ان مشنریوں کی فوجوں کو جو اس وقت ہندوستان میں غارت گری میں مصروف ہیں ہندوستان سے باہر نکال سکیں؟ کیا ایران کے ارد گرد یا مصر کے حدود پر یا شام کے ساحل پر یا عراق کے کناروں پر یا خود استنبول میں جو خلیفۃ المسلمین کا تخت گاہ رہ چکا ہے مولوی صاحب کوئی ایسی سید سکندری کھڑی کر سکتے ہیں کہ مسیحی مشنری ان علاقوں میں گھس نہ سکے اور اس طرح ہماری موجودہ دولت محفوظ رہ سکے؟ مولوی صاحب! اگر یہی دیوار تھی جو آپ کی دولت کی محافظ تھی تو یہ دیوار تو اب مسمار ہو کر خاک سے مل چکی ہے۔ اب آپ

اپنی دولت کو کہاں چھپائیں گے۔ کیا صرف افغانستان کی چار دیواری کے اندر تمام اسلامی دنیا پناہ لے سکتی ہے؟ مولوی صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا انحصار ان دیواروں پر نہیں رکھا بلکہ وہ دیوار جس کے اندر اسلام محفوظ ہے وہ صداقت کی دیوار ہے جس کو کوئی غنیم توڑ نہیں سکتا۔ اسلام کی حفاظت کے لئے کسی طاہری تلوار کی ضرورت نہیں۔ اسلام امیر امان اللہ خان کی تلوار کا محتاج نہیں۔ یہ لوگ تو خود اپنے تئیں دشمنوں سے بچا نہیں سکتے یہ اسلام کو کیا بچائیں گے۔ اسلام کا محافظ خود اس کی اپنی سچائی ہے مگر مولوی صاحبان خود اس نور سے محروم ہیں۔ ان کو اس طاقت کا علم نہیں جو اسلام میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے ان کی نظر پھر پھر آکر تلوار پر ہی جا پڑتی ہے اور انہوں نے تلوار کو ہی اسلام کا محافظ سمجھ رکھا ہے۔

مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ اگر اشاعت اسلام رکتی ہے تو رکنے دو۔ موجودہ دولت کی حفاظت مقدم ہے۔ اس لئے ہم غیر مذاہب کے مبلغین کو اسلامی ملکوں میں گھسنے نہیں دیں گے ایک اور لحاظ سے بھی غلط ٹھہرتا ہے۔ اسلام تمام دنیا کیلئے ہے اور جیسا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم موجودہ دولت کی حفاظت کریں اسی طرح ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ بیرونی دنیا میں بھی اسلام کی تبلیغ کریں۔ اس لئے کوئی ایسا حکم اسلامی حکم نہیں کہلا سکتا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بیرونی دنیا میں اشاعت اسلام کا سلسلہ بند ہو جاوے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک طرف اسلام ہمیں یہ حکم دے کہ تمام دنیا میں تبلیغ اسلام کرو اور دوسری طرف ایسا حکم دے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ تبلیغ اسلام کا سلسلہ رک جائے۔ لیکن اگر مولوی صاحب کے مشورہ پر عمل کیا جاوے تو اس کا ضروری نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف اسلام آئندہ ترقی کرنے سے رُک جائے گا بلکہ مسلمانوں کی موجودہ تعداد بھی ہندوؤں کی طرح روز بروز گھٹتی جائے گی اور اگر مولوی صاحبان کے فتاویٰ کفر و قتل مرتد پر پورے طور پر عمل کیا گیا تو مسلمان بہت جلدی دنیا سے مٹ جائیں گے۔ کیونکہ ایک طرف تو ترقی رکی ہوئی ہوگی اور دوسری طرف علماء کی

طرف سے زندیق اور کافر بنانے کا سلسلہ جاری رہ کر (جیسا کہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے) مسلمانوں کی رہی سہی تعداد کو بھی کم کرتا جائے گا۔

اُو مولوی صاحب! میں آپ کو سمجھاؤں کہ اسلام کی حفاظت کا حقیقی ذریعہ کیا ہے جس کے اختیار کرنے سے آپ اس بات پر مجبور نہیں ہوں گے کہ اسلام کی تبلیغ کرنا چھوڑ بیٹھیں۔ مسلمانوں کو سچے مسلمان بناؤ۔ غیر مذاہب کے مشنریوں کا لوہے کی تلوار سے نہیں بلکہ اسلامی صداقت کی تلوار کے ساتھ مقابلہ کرو تا وہ شکست کھا کر بھاگ جائیں اور آپ کے سامنے اپنا منہ نہ دکھاسکیں اور پھر آپ غیر اقوام میں ہر ایک ممکن ذریعہ سے تبلیغ کریں اور اسلام کا چمکتا ہوا چہرہ دکھائیں تا وہ اسلام پر دل و جان سے قربان ہو کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے فوج در فوج اسلام میں داخل ہوں۔ مگر آپ سچے ہیں آپ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آپ خود اسلام سے دُور ہو گئے ہیں اور آپ کا اسلام وہ اسلام نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے اور غیر قوموں کو زندہ اسلام کا پیارا چہرہ دکھانے کے لئے مسیح موعود کو بھیجا۔ اب انشاء اللہ یہ کام مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت کے ذریعہ ہوگا۔ وَمَا تَوْفِيقُنَا إِلَّا بِاللّٰهِ۔

قتل مرتد اور عقلمندان

حامیان قتل مرتد نے یہ امر نہایت سختی کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ قتل مرتد ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے فطرت انسانی کراہت کرتی ہے اور جس کو عقلمندان سلیم دھکے دیتی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے خود بھی صریح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ قتل مرتد کے یہ معنی ہیں کہ لوگوں پر دین کے معاملہ میں پوری سختی اور شدت کے ساتھ جبر کیا جاوے اور جبراً ایک ایسی چیز ہے جس کو نہ صرف قرآن شریف ناجائز قرار دیتا ہے بلکہ عقلمندان بھی اس کو نہایت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اس لئے ان بزرگوں نے اپنا سارا زور لگانے اور اپنی ساری قوت

خرچ کر دینے کے بعد اس امر کو اپنی ساری طاقت سے بالا پایا کہ اس کو عقلی پہلو سے درست اور صحیح ثابت کر سکیں۔ سو آخر کار تھک کر خود عقل کو ہی جواب دینے کی کوشش کی۔ مولوی شا کر حسین صاحب سہوانی ”شرعی احکام اور عقل“ کے عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں:-

”فاضل مضمون نگار کو استعجاب ہے کہ جب جبر کے ذریعہ سے کوئی مسلمان نہیں بنایا جاتا تو مسلمان رکھنے کیلئے جبر کا حکم کیونکر دیا جاسکتا ہے؟ مگر اس حقیقت واقعی کو کیا کیا جائے کہ اسلام کا صحیح اور نافذ حکم یہی ہے اور اس میں کیونکر اور کیسے کی گنجائش نہیں۔ اول تو اس حکم میں عقل سے کچھ استبعاد نہیں۔ اگر ہو بھی تو لازمی نہیں ہے کہ جملہ احکام شریعت پر ہمارا فلسفی و منطقی استدلال منطبق ہو سکے۔ یا ہم ان کی علت دریافت کرنے کا حق رکھتے ہوں۔“

مولوی ظفر علی خان صاحب اس امر کے تسلیم کرنے سے تو گریز نہیں کر سکے کہ اسلام حق و باطل کے پرکھنے کے لئے عقل کو ایک کسوٹی قرار دیتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اپنے دل میں خوب سمجھتے تھے کہ وہ قتل مرتد کے مسئلہ کو عقل کی کسوٹی سے پرکھ کر صحیح ثابت نہیں کر سکتے۔ اس لئے عقل کی بحث میں انہوں نے پوری کوشش کی ہے کہ اس معیار سے اس مسئلہ کو نہ جانچا جائے۔

مسٹر گاندھی کے اس مطالبہ کے جواب میں کہ کسی اصول موضوعہ کو عالمگیر حیثیت سے تسلیم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے اسے عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی پر کسا جائے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:-

”اس اصول سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور تمام ادیان و شرائع میں اسلام سب سے پہلا مذہب ہے جس نے حق و باطل کے امتیاز کا یہ اصول پیش کیا اور اسی پر اپنی قبولیت و عدم قبولیت کا انحصار رکھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی کیا ہوگی..... اگر ہر فرد کی مسوخ عقل ہر دین و شریعت اور ہر نظام و آئین کی صحت و عدم کی کسوٹی

بن جائے تو آج دین میں ایک نظام اور شریعت قائم نہ رہے۔ ایک بت پرست اپنے ہاتھ سے پتھر کی مورت تراشتا ہے..... پھر کیا اس بت پرست کی عقل رب المشرقیین والمغربین کے تسلیم و عدم تسلیم کا معیار بن سکتی ہے۔ ایک چوراہے ہمسایوں کے مال و متاع کا احترام ملحوظ نہیں رکھتا..... پھر کیا حدسرقہ کے لئے اس چور کی نادرست عقل کسوٹی بن سکتی ہے..... غرض کہ اس قسم کی صدہا مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کی بنا پر آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ حق و باطل کے پرکھنے والی عقل کی بھی خاص حدیں ہیں.... ایک ایسی عقل کی تلاش کرنی پڑے گی جس کے پیش نظر کائنات انسانیت کی فلاح و بہبود ہو۔ جب بنی آدم کے امن و امان اور راحت و آسائش کی حفاظت کے فرائض کو پورے طور پر محسوس کرتی ہو اور فتنہ و فساد اور بغض و عداوت کی شرائط کیوں کے سدباب میں انسانی دماغ۔ انسانی ذہنیت اور انسانی جذبات و حیاتیات سے تجاوز نہ کرتی ہو یعنی انسانوں کو انسان سمجھتی ہو ایسی ہی عقل کی بناء پر قتل مرتد کے حکم کا اندازہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس باب میں حکم بننے کیلئے اس عقل کا معیار کیوں صحیح مانا جا سکتا ہے جو کائنات انسانیت تو ایک طرف رہی اس کے ایک ٹکڑے یعنی اہل ہند کے گزشتہ چار پانچ سال کے معاملات میں خود اپنے قول کے مطابق ہمالیہ جتنی بڑی غلطیاں کر چکی ہے۔“

مندرجہ بالا اقتباس میں مولوی صاحب نے مسٹر گاندھی کے آگے ایک ایسی شرط پیش کر دی ہے جس کو نہ وہ پورا کر سکیں گے اور نہ قتل مرتد کے مسئلہ کو معقولی رنگ میں درست ثابت کرنے کی نوبت آئے گی۔ مولوی صاحب مسٹر گاندھی کو کہتے ہیں کہ اگر تم قتل مرتد کا معقولی ثبوت ہم سے چاہتے ہو تو جاؤ دنیا میں پھرو، اور روئے زمین کے مشرق و مغرب میں چکر لگاؤ اور کسی ایسی عقل کی تلاش کرو جو بنی آدم کی راحت و آسائش کے فرائض کو پورے طور پر محسوس کرتی ہو اور بغض و عداوت کی شرائط کیوں کے سدباب میں انسانی دماغ۔ انسانی ذہنیت اور انسانی جذبات و حیاتیات سے تجاوز نہ کرتی ہو۔ اور پھر اس میں یہ خوبی

ہو کہ اس نے تمام کائنات انسانیت کے عمر بھر کے معاملات میں کبھی غلطی نہ کی ہو۔ ظاہر ہے کہ نہ مسٹر گاندھی کسی ایسی عقل کو پیش کر سکیں گے اور نہ مولوی صاحب کو اس امر کی ضرورت پیش آئے گی کہ قتل مرتد کو معقولی رنگ میں صحیح ثابت کریں۔ چلو چھٹی ہوئی۔ نہ تو من تیل ہوگا نہ رادھانا چے گی۔

مولوی صاحب! اگر عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی ایسی ہی نایاب چیز ہے تو اسلام نے خود آپ کے اقرار کے بموجب حق و باطل کے امتیاز کا یہ اصول کیوں پیش کیا اور آپ کے بیان کے بموجب اسی پر اپنی قبولیت و عدم قبولیت کا انحصار کیوں رکھا؟ کیا اپنی سچائی کے جانچنے کے لئے کوئی ایسا معیار پیش کرنا جس کا حاصل ہونا ناممکنات سے ہو عمداً دنیا کو دھوکہ دینا نہیں ہے؟ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس معیار کو پیش کرنے والا دراصل اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے اور دنیا کو فریب دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے دعویٰ کی صحت کو جانچنے کے لئے ایک ایسا معیار پیش کرتا ہے جس کے ذریعہ اس کے بیان کی سچائی پر کھنا ہی ناممکن ہے۔

پھر میں مولوی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے اور ان کے ہمنوا مولوی صاحبان نے اسلام کو کیوں اختیار کر رکھا ہے، کیا اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے یا انہوں نے عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی سے اسلام کو جانچ کر دیکھ لیا ہے کہ یہ سچا دین ہے؟ اگر امر اول ان کے مسلمان رہنے کی وجہ ہے تو اس صورت میں میرا ان سے کوئی مطالبہ نہیں۔ لیکن اگر انہوں نے عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی سے اسلام کو جانچ کر دیکھ لیا ہے کہ یہ ایک سچا دین ہے تو پھر میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان سب کی عقلوں میں وہ سب صفات موجود ہیں جو مولوی صاحب نے تجویز فرمائے ہیں اور کیا ان کی عقلوں نے کبھی رائی برابر بھی کوئی غلطی نہیں کھائی۔ اگر مولوی ظفر علی خان صاحب اور ان کے ہم خیال علماء اپنی عقل کے ذریعہ اسلام کی صداقت کو جانچ سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ دوسرے لوگ اسلام کے

صرف ایک حکم کی معقولیت کو بھی اپنی عقل کے ذریعہ جانچ نہ سکیں۔

اصل بات یہ ہے کہ عقلی معیار سے کسی خاص انسان کی شہادت مراد نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی امر کے ثبوت میں ایسے دلائل پیش کئے جاتے ہیں جو انسانی عقل سے اپیل کرتے ہیں۔ ایسے دلائل اگر صحیح اور زبردست ہوں گے تو ان کا اثر ہر ایک غور کرنے والے انسان کے دل پر ضرور پڑے گا۔ خواہ اس کی عقل ہمالیہ جتنی بڑی غلطیاں کر چکی ہو۔ خواہ وہ چوری کا عادی ہو یا بت پرستی کی بلاء میں مبتلا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے یا تعصب یا ضد کی وجہ سے یا کسی اور بیرونی اثر کے ماتحت ایک امر حق کو قبول نہ کرے۔ لیکن ایک زبردست اور مضبوط دلیل کو سننے اور خالی الذہن ہو کر اس پر غور اور تدبر کرنے سے اس کا دل ضرور شہادت دے گا کہ بات تو سچی ہے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تمام عرب شرک اور بت پرستی کے گہرے سمندر میں غرق نہیں تھا؟ کیا عرب میں ڈاکہ مارنے والے اور انسانوں کو بے دریغ قتل کرنے والے انسان موجود نہ تھے؟ پھر وہ کیا چیز تھی جس نے ان کے دلوں کو فتح کر لیا اور ان کو اسلام کا عاشق اور جان نثار غلام بنا دیا؟ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے زبردست دلائل ہی تھے جنہوں نے ان کے دلوں کو یقین دلایا کہ یہ مدعی اپنے دعویٰ میں راستباز ہے۔ وہ بتوں کو پوجتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے قرآن شریف کے زبردست دلائل کو سنا تو ان کے دلوں نے شہادت دی کہ بت بے جان پتھروں سے زیادہ کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے بتوں کو توڑا اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اسلام میں داخل ہوئے۔

غرض جب مسٹر گاندھی نے مولوی صاحب سے عقلی معیار پر قتل مرتد کے حکم کو جانچنے کا مطالبہ پیش کیا تھا تو اس سے ان کی یہ مراد نہ تھی کہ وہ اس کی معقولیت کے متعلق زید یا بکر کی شہادت پیش کریں بلکہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ اس کی تائید میں ایسے دلائل پیش

کریں جن سے ہر ایک غور کرنے والا انسان یہ سمجھ سکے کہ قتل مرتد ایک نہایت ہی معقول حکم ہے۔ اگر ان دلائل سے مسٹر گاندھی کو کچھ فائدہ نہ ہوتا تو کم از کم دوسرے انصاف پسند اور غور کرنے والے انسان تو مولوی صاحب کے زبردست عقلی دلائل کو سن کر عرش عرش کراٹھتے اور اس امر کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے کہ قتل مرتد واقعی ایک نہایت ہی معقول اور پسندیدہ حکم ہے۔ مگر مولوی صاحب نے یہ راہ ہی اختیار نہیں کی بلکہ اُلٹا مسٹر گاندھی کو گالیاں دینے پر اتر آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ

”تمہاری عقل تو صرف ہندوستان کے معاملات میں ہمالیہ جتنی بڑی غلطیاں کرنے کی عادی ہے تم کس طرح اس حکم کی معقولیت کو سمجھ سکتے ہو۔ کوئی ایسی عقل پیش کرو جو تمام کائنات انسانیت کے ساتھ معاملہ رکھتی ہو اور اس نے اپنی ساری عمر میں ایک مرتبہ بھی رائی برابر بھی غلطی نہ کی ہو۔ ایسی عقل اس بات کے سمجھنے کے قابل ہوگی کہ قتل مرتد ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا حکم ہے۔“

مولوی شا کر حسین صاحب سہوانی ایڈیٹر کا مرید کے اس سوال کے جواب میں کہ جب جبر کے ذریعہ کوئی مسلمان نہیں بنایا جاتا تو مسلمان رکھنے کے لئے جبر کا حکم کیوں کر دیا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

”اس حقیقت واقعی کو کیا کیا جاوے کہ اسلام کا صحیح اور نافذ حکم یہی ہے کہ اس میں کیونکر اور کیسے کی گنجائش نہیں ہے۔“

اقول

مولوی صاحب اس بات کو بھول گئے ہیں کہ یہی امر تو تنازعہ فیہ ہے کہ آیا قتل مرتد اسلام کا صحیح حکم ہے یا نہیں؟ اور اس دعویٰ کی تائید میں کہ یہ اسلامی حکم نہیں ہے ایڈیٹر کا مرید نے آیت کریمہ **لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ** کو پیش کیا ہے۔ اب اس جرح کا یہ جواب نہیں ہو سکتا

کہ چونکہ یہ اسلام کا ایک صحیح حکم ہے اس لئے ایڈیٹر صاحب کو اس پر جرح کرنے کا اختیار نہیں۔ مولوی صاحب کے اس جواب سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ مولوی صاحب فریق مناظرہ سے نا آشنا ہیں۔ دعویٰ اور دلیل میں فرق نہیں کر سکتے اور ایک دعویٰ کو بطور دلیل کے پیش کر رہے ہیں۔

جب ایک امر کے متعلق دو فریق میں اختلاف ہو اور وہ ہر دو اس امر کے متعلق تبادلہ خیالات کر رہے ہوں تو ایک فریق دوسرے فریق کو یہ جواب نہیں دے سکتا کہ چونکہ یہ ایک مذہبی امر ہے اس لئے اس میں عقل کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایک انسان ایک مذہب کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتا ہے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اس نے عقل کی کسوٹی پر اسے جانچ کر دیکھ لیا ہے اور اس کو درست اور صحیح پایا ہے۔ ہاں میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ جب انسان ایک مذہب کو اصولی طور پر عقلی معیار کی رو سے منجانب اللہ اور صحیح قبول کر لیتا ہے تو پھر اس کے لئے ضروری نہیں کہ تمام تفصیلات کی بھی حکمت اس کو معلوم ہو۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اصولی طور پر ایک مذہب کو علیٰ وجہ البصیرت سچا یقین کرتا ہے۔ لیکن جب اسی مذہب کے دو فریق میں کوئی خاص تعلیم کے متعلق اختلاف ہو، ایک فریق ایک تعلیم کو اس مذہب کی جزو قرار دیتا ہو اور دوسرا فریق اس بات پر زور دیتا ہو کہ یہ اس مذہب کی تعلیم نہیں ہے تو ایسی صورت میں ایک فریق دوسرے فریق کو یہ جواب دے کر خاموش نہیں کر سکتا کہ یہ مذہبی امر ہے اس میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ کیونکہ دوسرا فریق اس کو مذہبی امر تسلیم نہیں کرتا۔ ایسے اختلاف کی صورت میں ضروری ہوگا کہ ہر ایک فریق اپنے دعویٰ کی تائید میں دلائل پیش کرے۔ وہ دلائل عقلی بھی ہو سکتے ہیں اور نقلی بھی اور پھر نقلی دلائل کی تفسیر میں عقل کا دخل ہوگا۔ ایک فریق ایک آیت یا ایک روایت کے ایک معنی کرتا ہے اور دوسرا فریق اسی آیت یا روایت کے اور معنی کرتا ہے۔ ایسے موقع پر عقل ہی فیصلہ کرے گی کہ کس کے معنی درست اور صحیح ہیں۔ ناظرین ہر دو فریق کے دلائل پر غور کریں

گے اور اپنی عقل خداداد کے ذریعہ ایک فریق کے حق پر ہونے اور دوسرے فریق کے باطل پر ہونے کے بارے میں اپنی رائے قائم کریں گے اور جہاں آیات و روایات کے معانی میں اختلاف ہوگا وہاں بھی اس بحث کو سننے اور پڑھنے والے لغو و فکر کے بعد خود فیصلہ کریں گے کہ کس کے معنی درست ہیں اور کس کے غلط؟

نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک چیز کا سمجھ میں نہ آنا اور بات ہے اور اس کا خلاف عقل ہونا اور چیز ہے۔ مسیحی لوگ تثلیث فی التوحید اور کفارہ کو پیش کرتے ہیں۔ کیا وہ ان عقائد کی تائید میں مولوی شا کر حسین صاحب کے الفاظ میں معترضین کو یہ جواب دے سکتے ہیں کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ جملہ مسائل دینی پر ہمارا فلسفی اور منطقی استدلال منطبق ہو سکے یا ہم ان کی علت دریافت کرنے کا حق رکھتے ہوں اور یہ کہ یہ مسائل اسرار میں سے ہیں انسانی عقل ان کی گُنہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہم مسیحیوں کو ان کی اس دلیل کے جواب میں یہ کہیں گے کہ یہ باتیں عقل سے بالا نہیں بلکہ عقل اور فطرت کے خلاف ہیں اس لئے ہم ان کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اسی طرح ہم حامیان قتل مرتد کے جواب میں یہی کہیں گے کہ قتل مرتد کا مسئلہ عقل سے بالا نہیں بلکہ یہ عقل کے خلاف ہے اس لئے ہم اس کو قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں۔ اگر اس طریق استدلال کی پیروی کی جاوے تو ہر ایک انسان ایک لغو سے لغو عقیدہ کو اپنے مذہب کی طرف منسوب کر کے یہ حجت پیش کر سکتا ہے کہ یہ دین کے اسرار میں سے ہے اس لئے اس پر جرح کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

غرض عقل کے متعلق مولوی شا کر حسین صاحب سہوانی اور ان کے ہم خیال علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ امر روز روشن کی طرح ہویدا ہوتا ہے کہ یہ صاحب عقلی معیار کے زور سے اس مسئلہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ ہاں مولوی شبیر احمد صاحب کا دعویٰ ہے کہ قتل مرتد عقل سلیم کے رو سے ضروری ہے اور اس کے لئے وہ اپنی کتاب میں ایک خاص عنوان قائم کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں:-

”قتل مرتد کے متعلق قیاس شرعی اور عقل سلیم کا کیا حکم ہے؟“

مگر اس عنوان کے ماتحت وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں ایک بھی عقلی دلیل پیش نہیں کرتے۔ صرف ایک دوسرے شخص کا قول نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن جو شہادت انہوں نے اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کی ہے اس سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ مولوی صاحب خیر سے خود ہی عقل سلیم سے عاری ہیں کیونکہ جو قول انہوں نے نقل کیا ہے وہ ان کے لئے بجائے مفید ہونے کے مضر ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محض ارتداد کی سزا قتل نہیں۔ حالانکہ مولوی صاحب کا دعویٰ ہے کہ ”صرف ارتداد اور تنہا ارتداد ہی وہ جرم ہے جس کے لئے اسلام میں قتل کی سزا مقرر کی گئی ہے۔“ مولوی صاحب اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کہ مرتد کا قتل عقل سلیم کا اقتضاء ہے حافظ ابن القیم کا مندرجہ ذیل قول نقل کرتے ہیں:-

فَامَا الْقَتْلُ فَجَعَلَهُ عِقَابًا عَظِيمًا الْجَنَائِدِ كَالْجَنَائِدِ عَلَى الْإِنْفَسِ
فَكَانَتْ عِقَابًا مِنْ جَنْسِهِ وَكَالْجَنَائِدِ عَلَى الدِّينِ بِالطَّعْنِ فِيهِ وَالْإِرْتِدَادِ
عَنْهُ وَهَذِهِ الْجَنَائِدُ أَوْلَى بِالْقَتْلِ وَكَفَّ عِدْوَانَ الْجَانِي عَلَيْهِ مِنْ كُلِّ
عِقَابٍ إِذْ بَقَاؤُهُ بَيْنَ أَظْهَرِ عِبَادِهِ مَفْسُودَةٌ لَهُمْ وَلَا خَيْرَ يَرْجَى فِي بَقَائِهِ
وَلَا مَصْلَحَةَ فَإِذَا حَبَسَ شَرُّهُ وَأَمْسَكَ لِسَانُهُ وَكَفَّ إِذَا هُ وَالتَّزْمِ
الذَّلِّ وَالصَّغَارِ وَجَرِيَانِ أَحْكَامِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ عَلَيْهِ وَإِدَاءِ الْجَزِيَّةِ لَمْ
يَكُنْ فِي بَقَائِهِ بَيْنَ أَظْهَرِ الْمُسْلِمِينَ ضَرَرٌ عَلَيْهِمْ وَالدُّنْيَا بِلَاغٍ وَمَتَاعٍ
الْبِي حِينَ:“ (اعلام الموقعين جلد ۲ صفحہ ۲۱۸)

”لیکن قتل کو سب سے بڑی ظلموں کی سزا قرار دیا ہے جیسا کہ کسی کی جان لے لینا۔ پس یہ سزا اس جرم کی جنس میں سے ہے اور جیسا کہ دین کے متعلق ظلم کرنا یعنی اس پر ظن کرنا اور اس سے ارتداد اختیار کرنا اور اس ظلم کی سزا میں قتل کرنا اور اسی طرح ظالم

کے دستِ تعدیٰ کو روکنا تمام سزاؤں کی نسبت زیادہ مناسب اور موزوں ہے کیونکہ ایسے ظالم کا لوگوں کے درمیان باقی رہنا ان کے بگاڑ کا موجب ہے اور اس کے باقی رہنے میں کسی ضیر اور نفع کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ پس اگر وہ اپنے شر کو روک لے اور اپنی زبان کو بند کر لے اور تکلیفِ دہی سے باز آجائے اور ذلت اور رسوائی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کا اپنے اوپر جاری کرنا اور جزیہ کا ادا کرنا اختیار کر لے تو مسلمانوں کے لئے اس کا ان کے درمیان باقی رہنا کسی قسم کے نقصان کا موجب نہیں ہوگا۔ پس وہ دنیا میں اپنی زندگی تک فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اپنے مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے۔“

مندرجہ بالا عبارت میں کھلے طور پر یہ امر بیان کیا گیا ہے کہ صرف ارتداد اور تہتا ارتداد کی سزا قتل نہیں۔ اگر ایک شخص اسلام سے ارتداد اختیار کرتا ہے اور کسی شرکاء ارتکاب نہیں کرتا اور اپنی زبان کو اسلام پر طعنہ زنی کرنے سے روکے رکھتا ہے تو ایسا شخص قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ ایک ذمی کی حیثیت میں اسلامی سلطنت کے ماتحت امن و امان سے زندگی بسر کر سکتا ہے اور اس کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے ذمیوں کو حاصل ہیں یعنی اسلامی سلطنت اس کے مال اور جان اور عزت کی اسی طرح حفاظت کرے گی جس طرح کہ دوسری رعایا کی حفاظت کرتی ہے۔ محض مرتد قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ وہی مرتد قتل کیا جائے گا جو طعن فی الدین کرتا ہے اور اپنے شر سے مسلمانوں کو ایذا دیتا ہے۔ مرتد اپنے ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اپنے شر اور طعن فی الدین اور ایذا المومنین کی پاداش میں موت کی سزا پائے گا۔

پس معلوم ہوا کہ نفس ارتداد مستوجب قتل نہیں۔ مرتد ہو کر ایک انسان اسلامی سلطنت کے ماتحت امن و امان سے اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ سزا صرف اس صورت میں دی جائے گی کہ وہ مرتد ہونے کے بعد طعن فی الدین کرے اور اپنے شر سے مسلمانوں کو ایذا پہنچائے۔ اب مولوی شبیر احمد صاحب خود ہی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر بتائیں

کہ حافظ ابن القیم کا قول ان کے دعویٰ کی تائید کرتا ہے یا تردید؟

مجھے مولوی صاحب کی عقل پر رہ رہ کر تعجب آتا ہے کہ انہوں نے حافظ ابن القیم کی شہادت کو کیوں پیش کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ باطل کی پیروی سے انسان کی عقل بالکل سلب ہو جاتی ہے۔ آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے اور کان بوجھل ہو جاتے ہیں اور کچھ سمجھ نہیں آتا اور بڑے بڑے علم و فضل کا دعویٰ کرنے والے حق پرستوں کے مقابل میں بچوں سے بھی زیادہ نادان ہو جاتے ہیں اور ایسی بیوقوفی کی حرکات کرتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا (الکہف: 58)

کہ ہم نے ان لوگوں کے دلوں پر یقیناً کئی پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔

مولوی شبیر احمد صاحب نے حافظ ابن القیم کے قول کی نقل کر کے صرف اپنی ہی عقل کے پردوں کا ثبوت مہیا نہیں کیا۔ بلکہ مولوی ظفر علی خان صاحب کی ایک بڑی کو بھی ساتھ ہی جھوٹا ثابت کیا ہے۔ مولوی ظفر علی خان صاحب نے لکھا تھا:-

”ابتدائے اسلام سے لے کر آج کے دن تک ایک شخص نے بھی اس بارے میں (یعنی محض ارتداد کو موجب قتل قرار دینے میں) اختلاف نہیں کیا۔“ لیکن مولوی شبیر احمد صاحب کے پیش کردہ حوالہ نے اس دعویٰ کو غلط ٹھہرایا اور ثابت کر دیا کہ اسلام میں ایسے لوگ گزرے ہیں جو اس بات کے قائل تھے کہ محض ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے اور وہ لوگ حافظ ابن القیم کے پایہ کے انسان تھے۔

آیت لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ پر ایک اور جرح

آیت لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کے متعلق ایک اور جرح یہ کی گئی ہے کہ اس آیت

کریمہ کا مفہوم بھی محل نظر ہے کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے ترجمہ میں اس آیت کا ترجمہ یوں بیان فرماتے ہیں:-

”نیست جبر کردن برائے دین هر آئینہ ظاہر شدہ است راه یابی از گمراہی.“

اس کی تشریح وہ حاشیہ میں اس طرح فرماتے ہیں:-

”یعنی حجت اسلام ظاہر شد پس گویا جبر کردن نیست اگرچہ فی الجملہ جبر باشد“

حامیانِ قتل مرتد لکھتے ہیں کہ

”اردو میں یہ مطلب اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کے آتے ہی حق اور باطل کا معیار دنیا کے سامنے آگیا اور انسان کے سامنے سچائی پیش کر دی گئی۔ اب اس کے لئے بجز اس کے چارہ نہیں کہ اس سچائی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اگر نہ کرے تو اس کی گردنِ عدوان و طغیان کے جھکانے کے لئے کچھ طریقے ایسے اختیار کرنے پڑیں گے جن پر بظاہر جبر کا گمان ہوگا۔ لیکن وہ جبر دراصل جبر نہ ہوگا۔“

حامیانِ قتل مرتد کی اصل غرض اس حوالہ کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ وہ یہ دکھائیں کہ اس آیت کریمہ کے معنوں میں اختلاف ہے اس لئے ہم اس سے اپنے حق میں کوئی استدلال نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو معنی ہم نے اس آیت کریمہ کے لئے ہیں ان کے بالکل الٹ معنی بھی اسی آیت سے نکالے گئے ہیں اور الٹ معنی کرنے والے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی شان کے آدمی ہیں لیکن حامیانِ قتل مرتد کو معلوم ہونا چاہیے کہ صرف اختلاف دکھانے سے ان کی نجات نہیں ہو سکتی۔ ان کا فرض ہے دورا ہوں میں سے ایک راہ اختیار کریں۔ یا تو وہ دلائل سے اس بات کا ثبوت دیں کہ اس آیت کے وہ معنی غلط ہیں جن سے ہم نے عدم جوازِ اکراہ فی الدین کا استدلال کیا ہے۔ یا وہ اس بات کا اقرار

کریں کہ یہ ایک مبہم آیت ہے جس سے دو متضاد مفہوم پیدا ہو سکتے ہیں اور چونکہ اس آیت کریمہ سے اکراہ فی الدین کے جواز کا مفہوم نکالنے والے حضرت شاہ ولی اللہ جیسے بزرگ انسان ہیں۔ اس لئے ہم جواز اکراہ کے مفہوم کو عدم جواز اکراہ کے مفہوم پر ترجیح دیں گے۔ لیکن حامیان قتل مرتد کی ضمیر خواہ کیسے ہی موٹے پردوں کے نیچے دبی ہوئی ہو کبھی ان کو اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ یہ کہنے کی جرأت کریں کہ یہ آیت مبہم ہے اور اس سے دو متضاد مفہوم جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں پیدا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ آیت ایسی صاف اور کھلی ہے اور اس کا مفہوم ایسا واضح اور یقین ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے سہارے کے باوجود بھی حامیان قتل مرتد اس بات کے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ وہ اس آیت کو مبہم قرار دیں اور یہ کہیں کہ اس آیت سے دو متضاد مفہوم پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی آیت سے دو ایسے معنی نکالنا جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ اور جن میں آپس میں وہی نسبت ہو جو رات کو دن سے ہے بالکل ناممکن ہے۔ ایسا خیال کرنا کہ ایک ہی آیت سے دو بالکل الٹ معنی نکل سکتے ہیں جن میں سے ایک دوسرے کی تردید کرتا ہے نعوذ باللہ خود قرآن شریف پر اعتراض کرنا ہے۔ بے شک قرآن شریف کی آیات سے ایک سے زیادہ فوائد پیدا ہو سکتے ہیں اور ایک ہی آیت مختلف معانی پر حاوی ہو سکتی ہے مگر وہ معانی ایک دوسرے کی ضد نہیں ہو سکتے۔ وہ سب معانی ایسے ہوں گے جو ایک ہی وقت میں صحیح ہوں گے اور ایک ان میں سے دوسرے معانی کا منافی نہیں ہوگا۔ مگر ایک آیت سے آپ ایسے دو معنی نہیں نکال سکتے جو آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ اگر ایک کو درست مانا جائے تو دوسرا غلط ثابت ہو۔ پس حامیان قتل مرتد یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس آیت سے دو معنی نکل سکتے ہیں۔ اکراہ فی الدین کے جواز کے معنی بھی اور عدم جواز کے معنی بھی۔ ایک ہی معنی درست ہو سکتے ہیں یا تو جواز کے معنی درست ہیں یا عدم جواز کے۔ دونوں درست نہیں ہو سکتے۔

پس آیت زیر بحث کو مبہم قرار دینے کا راستہ حامیان قتل مرتد پر بند ہے۔ اب ایک

ہی راستہ ان کے لئے کھلا ہے کہ وہ ان معنوں کو غلط ثابت کر کے دکھائیں جن کے رُو سے عدم جواز اکراہ کا استدلال کیا جاتا ہے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ صرف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت نقل کرنے اور اردو میں اس عبارت کا مفہوم بیان کر دینے پر اکتفا کیا ہے اور دو تین اور مؤیدین کا نام لکھ کر مولوی ظفر علی خان صاحب نے جنہوں نے یہ قول پیش کیا ہے جھٹ آگے لکھا ہے ”لیکن میں اس تصریح کو نظر انداز کر کے تھوڑی دیر کے لئے ”فریق ثانی“ ہی کے ترجمہ کو صحیح تسلیم کیے لیتا ہوں۔“ جو لوگ مولوی صاحب کے مضمون کو غور سے پڑھیں گے وہ ضرور اس امر کو نوٹ کریں گے کہ مولوی صاحب نے اس مضمون میں یہ روش اختیار کی ہے کہ جو بات ان کی تائید میں ہوتی ہے لیکن دراصل اپنے قلب میں اس کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ اس کو تو وہ نقل کرنے سے نہیں چوکتے لیکن اتنی احتیاط کر لیتے ہیں کہ اس دلیل کو صرف دوسرے شخص کے منہ میں ڈال کر بیان کر دیتے ہیں خود اس کی تائید کرنے سے خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ ایسا ہی انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر آیت لا اکراہ فی الدین کے متعلق رویہ اختیار کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کو خود حضرت شاہ صاحب کی تفسیر سے اتفاق نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ مولوی صاحب اور ان کے دوسرے ہم نوا مولوی صاحبان نے حضرت شاہ صاحب کی تفسیر کو درست نہیں سمجھا اور ان سب نے اصولی طور پر لا اکراہ فی الدین کے وہی معنی درست تسلیم کئے ہیں جو بالصراحت ان الفاظ سے ظاہر ہوتے ہیں یعنی یہ کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔ ہاں اس بات کے ثابت کرنے کے لئے بے سُد و کوشش کی ہے کہ یہ حکم صرف خارج از اسلام لوگوں کے لئے ہے یعنی جو لوگ ابھی اسلام میں داخل نہیں ہوئے ان کے متعلق حکم ہے کہ ان کو جبر کے ذریعہ اسلام میں داخل نہ کیا جاوے یعنی جو لوگ ایک دفعہ اسلام قبول کر لیں اور پھر اس سے ارتداد اختیار کریں ان پر یہ آیت چسپاں نہیں ہوتی۔ اس وقت میرے سامنے تین مضمون نگار ہیں۔ مولوی ظفر علی خان صاحب۔

مولوی شاکر حسین صاحب سہوانی اور مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی۔ اور تینوں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جبر کے ذریعہ کسی کو اسلام میں داخل کرنا جائز نہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر لا اکراہ فی الدین درست نہیں کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ کی تفسیر کی جو تشریح مولوی ظفر علی خان صاحب نے کی ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ اسلام میں داخل کرنے کے لئے جبر سے کام لینا چاہیئے۔ پس جس تفسیر کے ساتھ خود مولوی ظفر علی خان صاحب کو اتفاق نہیں اس کو مولوی صاحب اپنی تائید میں کیوں پیش کرتے ہیں۔ کیا اسی کا نام انصاف اور دیانتداری ہے؟

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بلند شان اور عالی مرتبہ کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ ان کی تفسیر صاف بتا رہی ہے کہ انہوں نے لا اکراہ فی الدین کی تفسیر کرنے میں ایک خاص عقیدہ کی اتباع میں تکلف سے کام لیا ہے۔ بعض مسلمانوں میں غلط فہمی سے یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ اسلام مشرکوں اور اہل الاوثان کو کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ ان کے لئے دو ہی راہیں کھلی ہیں یا اسلام قبول کریں یا تلوار۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک جبر کی راہ ہے اور آیت لا اکراہ فی الدین کے صریح خلاف ہے۔ اس لئے جن لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ مشرکین اور اہل الاوثان کے لئے جبر جائز ہے انہوں نے آیت لا اکراہ فی الدین کو اپنے اس عقیدہ کے خلاف پا کر اس کے متعلق تین مختلف راہیں اختیار کی ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو بڑی جدّ و جہد کے بعد اور اپنا بہت سا دماغ خرچ کر کے اس آیت کے حقیقی معنوں کو جو بالکل واضح اور پین تھے نظر انداز کر کے اس کی طرف ایسا مفہوم منسوب کیا جس کے متحمل اس آیت کے الفاظ ہرگز نہیں ہو سکتے تھے بلکہ یہ مفہوم آیت کریمہ کے صحیح اور اصلی معنوں کے بالکل الٹ اور خلاف تھا۔ یعنی انہوں نے اس آیت کریمہ کے یہ معنی کئے کہ دین میں زبردستی اور جبر جائز ہے۔ دین کے لئے اگر کسی پر جبر کیا جاوے تو وہ جبر نہیں کہلا سکتا۔ یہی معنی ہیں جن کو شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے اختیار

کیا۔ مگر دوسرے لوگوں نے (جو اس گروہ کے ساتھ بالکل ہم خیال اور متفق الرائے تھے اور جن کا عقیدہ بھی اس گروہ کی طرح یہی تھا کہ دین میں جبر کرنا جائز ہے) دیکھا کہ اس آیت کے کھلے کھلے اور صریح الفاظ ایسے معنوں کی اجازت نہیں دیتے اور یہ کہ اس آیت کریمہ کی طرف ایسے معنی منسوب کرنا سراسر تکلف اور بناوٹ ہے۔ اس لئے باوجودیکہ وہ اس گروہ کے ساتھ بالکل ہم عقیدہ تھے اور جبر کو بالکل جائز قرار دیتے تھے ان کی طبیعتوں نے ان معنوں کو قبول نہ کیا اور انہوں نے تسلیم کیا کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ لا اکراہ فی الدین کے بے شک یہی معنی ہیں کہ دین میں جبر نہیں ہونا چاہیے لیکن انہوں نے اپنے عقیدہ کے بچاؤ کی یہ راہ اختیار کی کہ کہہ دیا کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کے معنی بے شک یہی ہیں کہ دین میں جبر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے سوا کوئی اور معنی کرنا محض تکلف ہے مگر یہ آیت منسوخ شدہ ہے اسلام میں اب اس پر عمل نہیں۔

ان کے بعد ایک تیسرا گروہ اٹھا۔ انہوں نے بھی دوسرے گروہ کے ساتھ اس امر میں اتفاق کیا کہ بے شک یہ آیت کریمہ صاف اور واضح ہے اور اس کے یہی معنی درست ہیں کہ دین میں جبر نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک اصولی آیت ہے۔ اصول حقیقوں پر مبنی ہوتے ہیں اور حقیقتیں دائمی سچائیاں ہیں جو کبھی منسوخ نہیں ہو سکتیں اس لئے یہ قول قابل پذیرائی نہیں ہو سکتا کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ لیکن چونکہ اس تیسرے گروہ کا بھی پہلے دو گروہوں کی طرح یہی عقیدہ تھا کہ مشرکین اور اہل الاوثان کے لئے کوئی آزادی نہیں۔ ان کے لئے صرف دو ہی راہیں کھلی ہیں چاہیں تو اسلام قبول کر کے اپنی جان بچالیں چاہیں تو مسلمانوں کی تلوار کا مزہ چکھ کر واصل جہنم ہوں۔ اس لئے انہوں نے اپنے اس عجیب و غریب عقیدہ کی حفاظت کے لئے یہ تجویز نکالی کہ یہ آیت اپنے مفہوم میں عام نہیں ہے بلکہ یہ صرف اہل کتاب کے لئے خاص ہے مشرکین اور اہل الاوثان اس سے مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ فتح البیان جلد نمبر ۱ صفحہ ۳۲۰ میں لکھا ہے:-

”القول الثانی انہا لیست بمنسوخة وانما نزلت فی اهل الكتاب
خاصة و انہم لایکرون علی الاسلام اذا ادوا الجزیة بل الذین
یکرون ہم اهل الاوثان فلا یقبل منهم الا الاسلام او السیف۔“

پس یہی عقیدہ تھا کہ مشرکین اور اہل الاوثان سے سوائے اسلام یا تلوار کے اور کچھ
قبول نہ کیا جاوے اور ان کو اسلام لانے پر مجبور کیا جائے جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ
کے لئے محرک ہوا کہ وہ لا اکراہ فی الدین کے ایسے معنی اختیار کریں جن سے جبر کی
اجازت ثابت ہو۔ اس لئے انہوں نے وہ معنی اختیار کئے جو میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔
لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ معنی تکلف سے بنائے گئے ہیں۔ اگر انسان خالی الذہن ہو کر
ان الفاظ کو پڑھے گا تو ان کے یہی معنی کرے گا کہ ان الفاظ میں جبر و اکراہ کی ممانعت کی گئی
ہے۔ کسی اہل زبان سے یا ایسے شخص سے جو عربی دان کہلا سکتا ہو لا اکراہ فی الدین کے
معنی پوچھو تو وہ اس کے یہی معنی کرے گا کہ ان الفاظ میں جبر و اکراہ کی ممانعت پائی جاتی
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں سے بھی جو مشرکین کے لئے جبر جائز قرار دیتے
ہیں اکثر نے لا اکراہ فی الدین کے یہی معنی لئے ہیں کہ دین میں اکراہ نہیں ہونا چاہیے
اور اس وقت بھی جن مولوی صاحبان نے موجودہ بحث میں حصہ لیا ہے انہوں نے بھی
باوجود حضرت ولی اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو پیش کرنے کے خود ان معنوں کو
اختیار نہیں کیا بلکہ عملی طور پر وہی معنی تسلیم کئے ہیں جو اس آیت کے صاف اور کھلے کھلے معنی
ہیں۔ اور اگرچہ بہت حیلہ بازی سے کام لے کر مرتد کو اس آیت کریمہ کے دائرہ سے باہر
رکھنے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ لا اکراہ فی الدین کے معنی
یہی ہیں کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے ایک عقیدہ کے ماتحت اس آیت کی تفسیر
میں اس کے متبادر اور حقیقی معنوں کو نظر انداز کر کے ایک ایسے مفہوم کو اختیار کرنا جو تکلف

سے اس آیت کی طرف منسوب کیا گیا ہے کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس آیت کے الفاظ کافی واضح نہیں تھے اور ان میں اس امر کی گنجائش تھی کہ کوئی دوسرے معنی جو حقیقی معنوں سے بالکل متضاد تھے ان کی طرف منسوب کئے جاتے۔ اس امر کے متعلق ہمیں ذرا بھی تعجب نہیں رہتا جب ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے مفسروں نے ایک غلط عقیدہ سے متاثر ہو کر لفظ تَوْفَى کے ایسے معنی کئے جو کبھی بھی اس لفظ کی طرف منسوب نہیں کئے گئے تھے۔ لغت بلا اختلاف کہتی ہے کہ تَوْفَى اللّٰهُ زَيْدًا کے معنی سوائے قبض روح کے اور کوئی نہیں۔ قرآن شریف میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں سوائے قبض روح کے اور کوئی معنی نہیں۔ حدیث میں بھی یہی معنی ہیں۔ کلام عرب میں بھی یہی معنی ہیں۔ لیکن باوجود اس عالمگیر اتفاق کے جب یہی لفظ ایک سے زیادہ دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن شریف میں استعمال ہوا تو اپنے اس غلط عقیدہ سے متاثر ہو کر کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے لفظ تَوْفَى کے وہ معنی کئے جو دنیا جہان میں کسی نے نہیں کئے تھے۔ خود قرآن شریف میں وہی لفظ بار بار آتا ہے وہاں اس کے معنی قبض روح کے لیتے ہیں لیکن جب اسی کتاب میں وہی لفظ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت استعمال ہوتا ہے تو ان کا عقیدہ ان کو اجازت نہیں دیتا کہ اس لفظ کے وہی معنی کریں جو ہر دوسرے مقام میں کئے جاتے ہیں اس لئے وہ ایک نئے معنی اپنی طرف سے تراش کر اس لفظ کو دیتے ہیں۔ پس اس مثال کے ہوتے ہوئے اگر ایک عقیدہ کے ماتحت آیت لا اِكْرَاهَ فِى الدِّينِ كِى طرف کوئی نئے معنی منسوب کرنے کی کوشش کی گئی تو اس سے ہرگز تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

ہاں اگر یہ بزرگ حضرت مسیح موعودؑ کا زمانہ پاتے اور اس حکم و عدل کا کلام سنتے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں ایسی غلطیوں سے اسلام کو پاک کرنے کے لئے مبعوث فرمایا تو یقیناً وہ اول المؤمنین میں ہوتے اور ان کو اپنی غلط فہمیوں سے دست بردار ہونے

میں ذرہ بھی تامل نہ ہوتا۔

اس جگہ میں مولوی ظفر علی خان صاحب کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کسی بزرگ کی نسبت جو مامور نہ ہو یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ہر ایک امر دینی میں غلطیوں سے پاک تھے اور یہ ناممکن ہے کہ ان سے کوئی غلطی خواہ اجتہادی ہی کیوں نہ ہو سرزد ہو اور اس لئے جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ راست اور درست ہے **إِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ** **أَرْبَابًا (التوبة: 31)** کا اپنے آپ کو مصداق بنانا ہے۔

اگرچہ آیت زیر بحث ایسی صاف اور بین ہے کہ اس کی وضاحت کے لئے تفاسیر کے اقوال کو پیش کرنے کی کچھ بھی ضرورت نہیں اور یہ آیت کریمہ اس حاجت سے مستغنی ہے کہ اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے علماء اسلام کی تفاسیر پیش کی جائیں۔ لیکن مزید اتمام حجت کے لئے میں مناسب دیکھتا ہوں کہ اس آیت کریمہ کے متعلق بعض تفاسیر سے بھی کچھ اقتباس نقل کروں تا حامیان قتل مرتد کو موازنہ کرنے کا موقع ملے اور وہ اپنی عقل خداداد سے کام لے کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ لا اکراہ فی الدین کے یقینی اور قطعی معنی کیا ہیں۔ پہلے میں اس آیت کے شان نزول کے متعلق جو روایات ہیں وہ نقل کرتا ہوں۔ شان نزول سے بھی حامیان قتل مرتد کو اس آیت کے صحیح مفہوم کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

(۱) لباب النقول فی اسباب النزول بر حاشیہ جلالین مطبوعہ مصر

جلداول صفحہ ۵۰ میں لکھا ہے:-

”روی ابو داؤد و نسائی و ابن حبان عن ابن عباس قال كانت المرأة مقلاة فتجعل على نفسها ان عاش لها ولد ان تهوده فلما اجليت بنو النضير كان فيهم من ابناء الانصار فقالوا لاندع ابناءنا فانزل الله لا اکراہ فی الدین“

مدینہ کی عورتوں میں یہ رسم تھی کہ جس عورت کی اولاد کم ہوتی تھی تو وہ یہ نذر مانتی تھی کہ اگر اس کا بیٹا زندہ رہا تو وہ اس کو یہودی بنا دے گی۔ اور جب بنو نضیر کے متعلق جلا وطنی کا حکم ہوا تو ان میں انصار کے بیٹے بھی تھے۔ انصار نے کہا کہ ہم اپنے بیٹوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ تب یہ آیت اتری کہ لا اکراہ فی الدین۔

(۲) ”اخرج سعید بن منصور و عبد اللہ ابن حمید و ابن جریر و ابن المنذر و البیهقی عن سعید ابن جبیر فی قوله لا اکراہ فی الدین۔ قال نزلت فی الانصار خاصة قلت خاصة قال خاصة كانت المرءة منهم اذا كانت نزورة او مقالات تنذر لئن ولدت ولدا لنجعلنہ فی اليهود تلتمس بذلک طول بقاءه فجاء الاسلام و فیہم منهم۔ فلما اجلیت النضیر قالت الانصار یا رسول اللہ ابناءنا و اخواننا فیہم فسکت عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنزلت لا اکراہ فی الدین“ (ذکر منشور جلد ۱ صفحہ ۳۲۹)

سعید نے کہا کہ آیت لا اکراہ فی الدین خصوصیت کے ساتھ انصار کے بارہ میں نازل ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ کیا خصوصیت کے ساتھ انصار کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں خصوصیت کے ساتھ انہی کے بارہ میں یہ آیت اتری۔ جب کسی انصار کی عورت کی اولاد کم ہوتی تو وہ نذر مانتی تھی کہ اگر اس کے ہاں بیٹا ہو تو وہ اس کو یہودی میں داخل کر دے گی اور اس سے اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ یہ بیٹا زندہ رہے۔ جب اسلام آیا اس وقت یہودی میں انصار کی اولاد موجود تھی۔ جب بنو نضیر کو جلا وطنی کا حکم ملا تو انصار نے کہا کہ اے خدا کے رسول ہمارے بیٹے اور ہمارے بھائی یہودی میں موجود ہیں۔ آپ خاموش ہو گئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ لا اکراہ فی الدین۔

(۳) ”عن مجاہد قال کان ناس من الانصار مسترضعین فی بنی

قربطة فثبتوا على دينهم فلما جاء الاسلام اراد هلوهم ان يكرهو هم
على الاسلام فنزلت لا اكرهه في الدين

(ذَرِّ مَنْشُور جلد ۱ صفحہ ۳۲۹)

انصار کے بعض آدمیوں نے بنو قریظہ میں پرورش پائی تھی اور وہ انہی کے دین پر قائم ہو گئے تھے۔ جب اسلام آیا تو ان کے رشتہ داروں نے چاہا کہ ان کو اسلام لانے پر مجبور کریں۔ تب یہ آیت اتری لا اکرهه في الدين۔

(۴) ”عن ابن عباس في قوله لا اكرهه في الدين قال نزلت في رجل من الانصار من بنى سالم بن عوف يقال له الحصين. كان له ابنان نصرانيان وكان هو رجلاً مسلماً. فقال للنبي صلى الله عليه وسلم الا استكرههما فانهما قد ابيا الا النصرانية فانزل الله فيه ذلك“

(ذَرِّ مَنْشُور جلد ۱ صفحہ ۳۲۹)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ لا اکرهه في الدين ایک انصاری کے بارہ میں اتری جو بنو سالم بن عوف کے قبیلہ میں سے تھا اور جس کا نام حصین تھا۔ اس کے دو بیٹے نصرانی تھے اور وہ خود مسلمان تھا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا میں ان کو جبر سے مسلمان نہ بنا لوں؟ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی رہیں گے۔ تب اس امر کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔

ان تمام روایتوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیت انصار کی اولاد کے بارہ میں اتری۔ جو نصرانی یا یہودی ہو گئے تھے اور ان کے مسلمان رشتہ دار چاہتے تھے کہ جبر سے ان کو مسلمان بنا لیں اس کی ممانعت میں یہ آیت اتری۔ اب میں حامیان قتل مرتد سے پوچھتا ہوں کہ اس شان نزول کے مطابق آیت لا اکرهه في الدين کے کیا معنی ہونے چاہئیں۔ کیا یہ کہ بے شک جبر سے لوگوں کو مسلمان بنا لو۔ جبر سے اسلام میں لوگوں کو داخل کرنا جبر

نہیں کہلاتا یا یہ کہ جبر سے کسی کو اسلام میں داخل نہیں کرنا چاہیے۔

اب میں اس آیت کریمہ کے متعلق دو اور روایتیں نقل کرتا ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت کریمہ کے یہ معنی نہیں سمجھتے تھے کہ دین کے لئے جبر کرنا جائز ہے بلکہ ان کے نزدیک بھی اس آیت کریمہ کے یہی معنی تھے کہ جبر سے کسی شخص کو دین میں داخل نہیں کرنا چاہیے۔

(۱) اخرج سعيد ابن منصور وابن ابى شيبه وابن المنذر وابن ابى حاتم عن وسق الرومى قال كنت مملوكاً لعمر بن الخطاب فكان يقول لى اسلم فانك لو اسلمت استعنت بك على امانة المسلمين فانى لا استعين على امانتهم بمن ليس منهم فابيت عليه فقال لى لا اكراه فى الدين (درمنثور جلد ۱ صفحہ ۲۳۰)

وسق رومی کہتا ہے کہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس غلام تھا۔ آپ مجھے فرمایا کرتے تھے کہ تو مسلمان ہو جاتا کہ مسلمانوں کے معاملات میں جو میرے سپرد ہیں تجھ سے مدد لے سکوں۔ میں ایسے امور میں ایسے شخص سے مدد لینا نہیں چاہتا جو مسلمان نہ ہو۔ میں نے مسلمان ہونے سے انکار کیا۔ آپ نے فرمایا لا اکراه فى الدين۔

(۲) اخرج النحاس عن اسلم سمعت عمر بن الخطاب يقول لعجوز نصرانية اسلمى تسلمى. فابت. فقال عمر اللهم اشهد. ثم تلا لا اكراه فى الدين.

اسلم کہتا ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سنا وہ ایک نصرانی بڑھیا کو کہہ رہے تھے کہ مسلمان ہو جاؤ۔ خدا تعالیٰ تمہیں بچالے گا۔ اس نے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے اللہ گواہ رہ۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی لا اکراه فى الدين.

اب میں بعض مفسروں کا قول نقل کرتا ہوں اس سے بھی امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ

حامیان قتل مرتد کو نفع پہنچے گا۔ ابن کثیر اپنی تفسیر میں کہتا ہے۔

”ای لا تکرهوا احداً علی الدخول فی دین الاسلام فانه بین و واضح
جلّی دلائله و براہینہ لا یحتاج الی ان یکره احد علی الدخول فیہ
بل من هداه اللہ الی الاسلام و شرح صدره و نور بصیرتہ دخل فیہ
علی بیئہ و من اعمی اللہ قلبه و ختم علی سمعه و بصره فانه لا یفیدہ
الدخول فی الدین مکرها مقسورا و قد ذکر و ان سبب نزول ہذہ
الایۃ فی قوم من الانصار و ان کان حکمها عاماً“

(ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان صفحہ ۱۵۱)

لا اکراه فی الدین کے یہ معنی ہیں کہ کسی کو دین اسلام میں داخل ہونے کے لئے
مجبور نہ کرو کیونکہ وہ کھلا کھلا اور واضح ہے اور اس کے دلائل اور براہین روشن ہیں اور وہ اس
بات کا محتاج نہیں کہ کسی کو اس میں داخل ہونے کے لئے مجبور کیا جاوے بلکہ جس شخص کو
اللہ تعالیٰ اسلام کی طرف راہنمائی فرماتا ہے اور اس کے سینے کو کھول دیتا ہے اور اس کو نور
بصیرت عطا فرماتا ہے تو ایسا شخص علی بصیرت اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور جس کے دل کو
اللہ تعالیٰ اندھا کر دیتا ہے اور اس کے کان اور آنکھ پر مہر کر دیتا ہے تو ایسے شخص کو اگر جبر سے
اسلام میں داخل کیا جاوے تو اس سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ
آیت انصار کی ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی اگرچہ اس کا حکم عام ہے۔

حامیان قتل مرتد ابن کثیر کی تفسیر کو غور سے پڑھیں اور سچ بتائیں کہ یہ تفسیر ان کے
دل کو بھاتی ہے یا نہیں؟ اور خود ہی انصاف سے فرمائیں کہ لا اکراه فی الدین کی کون سی
تفسیر ان کو زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے؟ آیا یہ تفسیر کہ جتنا چاہو جبر کر لو اور لوگوں کو جبر سے
اسلام میں داخل کر لیا کرو۔ جبر سے اسلام منوانا جبر نہیں کہلا سکتا یا یہ تعلیم کہ اسلام اس بات کا
محتاج نہیں کہ لوگوں کو جبر سے اس میں داخل کیا جاوے اور جبر سے کسی کو اسلام میں داخل

کرنا ایک بیہودہ حرکت ہے کیونکہ ایسے اسلام لانے کا اس کو کچھ بھی فائدہ نہیں؟ نیز میں حامیانِ قتل مرتد سے یہ بھی پوچھتا ہوں کہ جو شخص اسلام قبول کرنے کے بعد پھر ارتداد اختیار کرنا چاہے ایسے آدمی کو اگر جبر سے اسلام میں رکھا جائے گا تو اس سے اس شخص کو کیا فائدہ ہوگا؟ ابن کثیر تو فرماتے ہیں کہ ایسے اسلام سے اس شخص کو کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ مولوی صاحب! آپ صاحبان کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ اب حامیانِ قتل مرتد دیکھیں کہ بحر المحيط میں کیا لکھا ہے:-

”وقيل لا يكره على الاسلام من خرج الى غيره وقال ابو مسلم والقفال معناه انه مابنى تعالى امر الايمان على الاجبار والمقسر وانما بناه على التمكن والاختيار ويدل على هذا المعنى انه لما بين دلائل التوحيد بيان شافيا. قال بعد ذلك لم يبق عذر في الكفر الا ان يقسر على الايمان ويجبر عليه وهذا ما لا يجوز في دار الدنيا التي هي دار الابتلاء اذ في القهر والاكراه على الدين بطلان معنى الابتلاء يؤكّد هذا قوله ”وَقَدَّ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْعَمِي“ یعنی ظہرت الدلائل ووضحت البينات ولم يبق بعدها الا طريق القسر والالغاء وليس بجائز لانه ينا في التكليف“ (بحر المحيط جلد ۲ صفحہ ۲۸۱، ۲۸۲)

”بعض نے لا اکراه فی الدین کے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ جو شخص اسلام سے نکل کر کوئی اور دین اختیار کرے (یعنی ارتداد اختیار کرے) تو ایسے شخص کو اسلام پر مجبور نہ کیا جاوے اور ابو مسلم اور قفال کا یہ قول ہے کہ اس آیت کریمہ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کا معاملہ جبر و اکراه پر مبنی نہیں کیا بلکہ اس کی بنیاد انسان کے اختیار اور قدرت پر رکھی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل کو خوب کھول کر بیان فرما دیا تو اب کسی کے پاس کفر پر رہنے کے لئے کوئی عذر باقی نہیں۔ اب بھی اگر وہ اسلام کو قبول نہیں کرتا تو اس کا

ایک ہی علاج ہو سکتا تھا کہ اس کو اسلام لانے پر مجبور کیا جاوے۔ لیکن اس دنیا میں ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے اور زبردستی کرنے اور جبر سے اسلام منوانے میں آزمائش کا اصول باطل ہو جاتا ہے۔ اور لا اکراہ فی الدین کے ان معنوں کی اللہ تعالیٰ کا یہ قول تائید کرتا ہے۔ قد تبین الرشد من الغیٰ یعنی دلائل ظاہر ہو گئے اور بینات واضح ہو گئیں۔ اب ایک جبر کا ہی طریق باقی تھا اور یہ جائز نہیں کیونکہ یہ انسان کے مکلف ہونے کے اصول کے منافی ہے۔“

مندرجہ بالا حوالہ سے ایک بات نئی معلوم ہوئی اور وہ یہ کہ بعض لوگوں نے لا اکراہ فی الدین کے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ اگر کوئی شخص اسلام سے ارتداد اختیار کرے تو ایسے آدمی پر جبر نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض ایسے لوگ گزرے ہیں جو آیت لا اکراہ فی الدین کے ماتحت یہ جائز نہیں سمجھتے تھے کہ کسی کو اسلام پر رکھنے کے لئے جبر کا استعمال کیا جائے اور مرتدین کو مجبور کیا جاوے کہ وہ دوبارہ اسلام میں داخل ہوں اور وہ ان لوگوں کے ساتھ متفق نہیں تھے جو قتل مرتد کی حمایت میں یہ کہتے ہیں کہ لا اکراہ فی الدین ان لوگوں کے لئے ہے جو ابھی اسلام میں داخل نہیں ہوئے اور جو لوگ اسلام میں داخل ہو جاویں ان کے لئے جبر جائز ہے۔ ایسے لوگوں کو جبر سے اسلام میں رکھا جاسکتا ہے اور اسی لئے شارح نے قتل مرتد کا حکم دے رکھا ہے۔

پس حامیان قتل مرتد کا وہ دعویٰ غلط ثابت ہوا کہ ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک ایک فرد نے بھی اس مسئلہ کے متعلق اختلاف نہیں کیا۔ حافظ ابن القیم کا قول تو خود مولوی شبیر احمد صاحب نے نہایت ہی مہربانی فرما کر مہیا فرمایا ہے اور یہ دوسرا قول بحر المحیط والے نے پیش کیا ہے۔ اب میں فتح البیان جلد اول صفحہ ۳۴۰ سے ایک عبارت نقل کر کے لا اکراہ فی الدین کی بحث کو ختم کرتا ہوں۔ صاحب فتح البیان فرماتے ہیں:-

”وقال فی الکشاف فی تفسیر هذه الآية ای لم یجبر الله امر الایمان“

على الاجبار والقسر ولكن على التمكن والاختيار ونحوه قوله
 وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرَهُ
 النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ - ای لو شاء لقسرهم على الايمان
 ولكن لم يفعل وبني الامر على الاختيار.

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں کشاف میں لکھا ہے کہ اس آیت کریمہ کے یہ معنی
 ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے امر کو جبر و اکراہ پر جاری نہیں کیا بلکہ قدرت اور اختیار پر چھوڑ
 رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے:-

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرَهُ
 النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۰﴾ (یونس: 100)

یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا
 نہیں کیا اور اس بات کو انسان کے اختیار پر چھوڑ دیا ہے۔
 اب میں خیال کرتا ہوں کہ لاکراہ فی الدین کے مفہوم کے متعلق کافی بحث ہو
 چکی ہے۔

کافی ہے سمجھنے کو اگر اہل کوئی ہے۔



حدیث اور قتلِ مُرتد

جب قرآن شریف کی آیات پبّہ سے روز روشن کی طرح یہ ثابت ہو چکا کہ کسی شخص کو محض ارتداد کے لئے قتل کرنا اسلام کی تعلیم کی صریح خلاف ورزی ہے تو اس کے بعد ضرورت نہ تھی کہ کسی اور چیز کی طرف رجوع کیا جاتا لیکن چونکہ مخالفین کو اس بات پر گھمنڈ ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ ارتداد اور محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حدیث پر بھی نظر کی جائے اور دیکھا جائے کہ یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے؟

قرآن شریف کے مقابل میں حدیث کا درجہ ۱

حامیان قتلِ مرتد کا ضمیر نہایت سختی کے ساتھ اس امر کو محسوس کر چکا ہے کہ قرآن شریف قتلِ مرتد کے عقیدہ کو دھکے دے رہا ہے اور یہ کہ قرآن شریف کی تعلیم کے سامنے قتلِ مرتد کا خیال ایک آن کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتا۔ اس لئے جب ان سے مطالبہ کیا گیا کہ جن روایات کو تم قتلِ مرتد کی تائید میں پیش کرتے ہو اور قرآن شریف کی آیات کی روشنی میں ان کو رکھو۔ تا معلوم ہو کہ ان روایات سے جو استدلال تم نے کیا ہے وہ کہاں تک درست اور صحیح ہے تو حامیان قتلِ مرتد کے اعضاء پر رعشہ طاری ہو گیا اور وہ اس مطالبہ کو سن کر بہت گھبرائے ہیں اور یہ امر ان کو موت سے سخت تر معلوم ہوا ہے کہ ان روایات کی صحت یا ان کے حقیقی معنوں کو قرآن شریف کی مدد سے دریافت کریں۔ قرآن شریف سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے حامیان قتلِ مرتد نے جو عذرات پیش کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

حاشیہ ۱۔ اس مضمون کے متعلق مفصل معلومات حاصل کرنے کے لیے ناظرین الحق مباحثہ لدھیانہ مطالعہ فرمائیں۔ اس مضمون میں بھی حضرت مسیح موعودؑ کی کتب ازالہ اوہام اور مباحثہ لدھیانہ سے اقتباس لئے گئے ہیں۔ منہ

(۱) احادیث کو قرآن شریف کے ذریعہ جانچنے کا قاعدہ دُنیا جہان سے نرالا کلیہ ہے۔ ”جو وضع“ کیا گیا ہے۔

(۲) امام بخاری جیسے بزرگ کی نسبت یہ خیال بھی دل میں لانا ایک حیرت انگیز جرأت ہے کہ امام موصوف اپنے مجموعہ میں کوئی ایسی حدیث درج کر سکتے ہیں جو قرآن شریف کے مخالف ہو۔

(۳) یہ خیال کہ جو حدیث صحت و درستی کے مقررہ اور مفید یقین معیار پر پوری اترے اس کا معارض نص قرآنی ہونا، اس کی پذیرائی کے مانع ہے۔ اہل علم کے نزدیک پر کاہ جتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔

(۴) ایک شخص ایک حدیث کو صحیح مان رہا ہے اور وہ اس کے نزدیک کسی قرآنی نص کے معارض نہیں لیکن دوسرے کا فہم و تدبر اس پر تعارض کا حکم لگا رہا ہے پھر اس اختلاف کے ہوتے ہوئے دو اویں پر حدیث کی کوئی حیثیت باقی رہ سکتی ہے؟ اگر ہر زید و بکر کے فہم ہی کو فیصلہ کا معیار مان لیا جائے تو احادیث تو درکنار خود آیات میں بھی ظاہر بینیوں کو تعارض کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔

(۵) جو حدیث محدثین کے اصول کے رو سے صحیح ثابت ہو جائے اس کا معارض قرآن ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔

ان سب عذرات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اس بات کیلئے ہرگز تیار نہیں کہ وہ اپنی پیش کردہ روایات کو قرآن شریف کی آیات کے سامنے رکھیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم نہ صرف ان روایات کو صحیح اور درست تسلیم کر لیں جو حامیان قتل مرتد نے اپنی تائید میں پیش کی ہیں بلکہ ان معنوں کو بھی صحیح یقین کر لیں جو وہ لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور قرآن شریف کا نام تک نہ لیں۔ تا ایسا نہ ہو کہ قرآن شریف کی آیات بینات ان روایات پر ایسی روشنی ڈالیں جس کے ذریعہ ان کی حقیقت ظاہر ہو جائے اور حامیان قتل مرتد کا طلسم

ٹوٹ جائے اور جو پردہ وہ لوگوں کی آنکھوں پر ڈالنا چاہتے ہیں قرآن شریف اس پردہ کو اٹھا دے اور حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے عذرات اس مشکل سے ان کو نجات نہیں دے سکتے۔

وہ گھبرا کر کہتے ہیں کہ یہ دنیا جہان سے نرالا قاعدہ ہے جو وضع کیا گیا ہے۔ مگر ان کو جاننا چاہیے اول تو یہ قاعدہ نرالا نہیں لیکن محض نرالا ہونا کسی قاعدہ کو غلط ثابت نہیں کرتا۔ اس قاعدہ کو غور سے دیکھو۔ اگر وہ قاعدہ معقول ہے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ اور اگر غیر معقول ہے تو اسے رد کر دینا چاہیے۔ صرف یہ کہہ کر کہ یہ ایک نیا معیار ہے جو پیش کیا گیا ہے آپ کسی معیار کو رد نہیں کر سکتے۔ اس معیار کو پرکھو۔ اس کا امتحان کرو۔ اگر امتحان کے بعد آپ اس معیار کو مضبوط اور یقینی پاؤ تو اس کو اختیار کرو ورنہ اس کو ترک کر دو۔ وہ معیار کیا ہے جو اس بحث میں حدیث کے پرکھنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ اس وقت آپ لوگوں نے قتل مرتد کے دعوے کے ثبوت میں کچھ حدیثیں پیش کی ہیں۔ ہم نے اس دعویٰ کی تردید میں قرآن شریف کو پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ قتل مرتد کا مسئلہ قرآن شریف کی تعلیم کے خلاف ہے اور تمہاری پیش کردہ حدیثوں کے متعلق یہ معیار پیش کیا ہے کہ ہم ان حدیثوں کو قرآن شریف پر عرض کریں گے۔ اگر ان کو قرآن شریف کے مطابق پائیں گے تو ان کو کمال خوشی سے قبول کریں گے اور اگر ان کے الفاظ میں اور قرآن شریف میں بظاہر تعارض نظر آئے گا تو ہم قرآن شریف کو چھوڑ کر حدیثوں کے ان معنوں کو صحیح تسلیم نہیں کریں گے جو قرآن شریف کی تعلیم کے صریح مخالف ہیں بلکہ ان احادیث پر غور کریں گے۔ اگر ان احادیث کی کسی طرح قرآن شریف کی تعلیم سے تطبیق ہو سکی تو ہم ان معنوں کو صحیح تسلیم کریں گے جو قرآن شریف کی تعلیم کے عین مطابق اور موافق ہیں اور ان معنوں کو ترک کر دیں گے جو قرآن شریف کے مخالف ہیں لیکن اگر ان احادیث کی تطبیق قرآن شریف سے نہ ہو سکی تو ہم مجبوراً ان احادیث کو قرآن شریف کے خلاف ہونے کی وجہ سے ترک کر دیں

گے اور قرآن شریف کو ان احادیث پر مقدم رکھیں گے۔ یہ ہے وہ معیار جو ہم نے موجودہ بحث میں امرزیر بحث کے تصفیہ کے لئے پیش کیا ہے۔ مگر حامیان قتل مرتد اس معیار کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور ان کا اس معیار کو قبول نہ کرنا اس امر کا قطعی اور یقینی ثبوت ہے کہ وہ ان روایات کو قرآن شریف کی صریح تعلیم کے خلاف دیکھتے ہیں اور اگر وہ قرآن شریف کا معیار قبول کر لیں تو انہیں ماننا پڑتا ہے کہ کسی مرتد کو محض ارتداد کے لئے قتل کرنا جائز نہیں۔ اس لئے وہ اس معیار کو ہی قبول نہیں کر سکتے اور ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم ان روایات کو انہی معنوں میں قبول کر لیں جو وہ ان روایات کی طرف منسوب کرتے ہیں اور قرآن شریف کی روشنی میں ان روایات کو نہ جانچیں۔

میں فی الحال حامیان قتل مرتد پر یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر بفرض محال اس معیار کو زوالا بھی کہا جاوے پھر بھی یہ ایک ایسا معیار ہے کہ جس کو ہر ایک مومن بشرح صدر قبول کرے گا۔ اور اگر کسی شخص کا سینہ نورا ایمان سے خالی ہے تو وہ بھی معقولی رنگ میں مجبور ہوگا کہ اس اصول کو صحیح تسلیم کرے۔ کیونکہ جو معیار ہماری طرف سے پیش کیا گیا ہے اس کی معقولیت ایسے زبردست دلائل سے ثابت ہے کہ کوئی ادنیٰ تدبیر سے کام لینے والا انسان بھی خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا اور مومن کی تو شان ہی نہیں کہ وہ اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کرے۔

پہلی دلیل جو اس معیار کی صداقت کو ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ اگر قرآن کریم وہ یقینی اور قطعی کلام الہی ہے جس میں انسان کا ایک نقطہ یا ایک شعشعہ تک دخل نہیں اور وہ اپنے الفاظ اور معانی کے ساتھ خدا تعالیٰ کا ہی کلام ہے اور کسی فرقہ اسلام کو اس کے ماننے سے چارہ نہیں۔ اس کی ایک ایک آیت اعلیٰ درجہ کا تو اثر اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ وہ وحی متلو ہے جس کے حرف حرف گئے ہوئے ہیں۔ وہ باعث اپنے اعجاز کے بھی تبدیل اور تحریف سے محفوظ ہے۔ لیکن احادیث تو انسانوں کے دخل سے بھری ہوئی ہیں جو ان میں صحیح کہلاتی ہیں

ان کا اتنا بھی مرتبہ نہیں جو ایک آیت کے مقابلہ پر ایک کروڑ ان میں سے وہ رنگ اور شان پیدا کر سکے جو اللہ جلّ شانہ کی بے مثل کلام کو حاصل ہے۔ حدیثوں میں ضعف کی وجوہات اس قدر ہیں کہ ایک دانا آدمی ان پر نظر ڈال کر ہمیشہ اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ ان کو تفویض دینے کے لئے کم از کم نص قرآنی کا کوئی اشارہ ہی ہو۔ یہ سچ ہے کہ حدیثیں صحابہؓ کی زبان سے بتوسط کئی راویوں کے مؤلفین صحاح تک پہنچتی ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ جہاں تک ممکن ہے مؤلفین صحاح نے حدیثوں کی تنقید و تفتیش میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں مگر پھر بھی ہمیں ان پر وہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے جو اللہ جلّ شانہ کی کلام پر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ کئی واسطوں سے اور معمولی انسانوں کے ہاتھوں سے دست و مال ہو کر ائمہ حدیث کو ملی ہیں نہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جمع کرنے یا ان کے لکھوانے کی طرف توجہ فرمائی نہ صحابہ کرامؓ نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور نہ خدا تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کا وعدہ فرمایا جس طرح کہ اس نے قرآن شریف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا۔ علاوہ ازیں احادیث کو جمع کرنے کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک لمبا زمانہ بعد شروع کیا گیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں کثرت سے اختلاف اور تناقض پایا جاتا ہے۔

پس جب قرآن شریف کے مقابل میں احادیث کا یہ حال ہے تو حامیان قتل مرتد ہمیں خود ہی بتلائیں کہ اگر قرآن شریف اور حدیث میں باہم تعارض اور تناقض نظر آوے تو پھر ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اور قرآن شریف اور حدیث میں سے کس کو اختیار کریں اور کس کو ترک کریں؟ ایسی صورت میں جو معیار ہم نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب قرآن شریف کی آیات اور احادیث میں ہمیں اختلاف نظر آئے تو ہمیں پہلے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں باہم تطبیق کی جائے اور احادیث کے ایسے معنے کئے جاویں جو قرآن شریف کی تعلیم کے مطابق ہوں۔ اور اگر ہم کسی طرح بھی تطبیق نہ کر سکیں تو پھر سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم قرآن شریف کو اختیار کریں اور حدیث کو

ترک کر دیں کیونکہ قرآن شریف حدیث پر مقدم اور امام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ (المرسلات: 51)

کہ وہ بتائیں تو سہی کہ اس قرآن کے بعد وہ کس کتاب پر ایمان لائیں گے۔

اس کے بعد میں قتل مرتد پر یہ امر بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ یہ طریق دنیا جہان سے نرالا ہے۔ صحیح البخاری کی کتاب الجنائز میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیث ”ان المیت يعذب ببعض بقاء اهلہ“ کو قرآن کریم کی آیت لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ کے معارض و مخالف پا کر حدیث کی یہ تاویل کر دی کہ یہ مومنوں کے متعلق نہیں بلکہ کفار کے متعلق ہے جو متعلقین کی جزء فزع پر راضی تھے بلکہ وصیت کر جاتے تھے۔ پھر بخاری میں یہ حدیث لکھی ہے کہ قَالَ هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَكُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا۔ اس حدیث کو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس کے سیدھے اور حقیقی معنی کے رو سے قبول نہیں کیا اس عذر سے کہ یہ قرآن کریم کے معارض ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتَىٰ اور ابن عمرؓ کی حدیث کو اس وجہ سے رد کر دیا ہے کہ ایسے معنی معارض قرآن ہیں۔ ایسا ہی محققوں نے بخاری کی اس حدیث کو کہ ”مَا مِنْ مَوْلُودٍ يُولَدُ إِلَّا وَالشَّيْطَانِ يَمْسُهُ حِينَ يُولَدُ فَيَسْتَهْلِلُ صَارَ خَامِنًا مَسَّ الشَّيْطَانُ آيَاهُ الْأَمْرِيْمَ وَابْنَهَا“ قرآن کریم کی ان آیات سے مخالف پا کر کہ ”إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ۔ وَإِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ۔ وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ“ اس حدیث کی یہ تاویل کر دی کہ ابن مریم اور مریم سے تمام ایسے اشخاص مراد ہیں جو ان دونوں کی صفت پر ہوں۔ جیسا کہ ابن حجر نے فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۵۹ میں لکھا ہے۔

”وقد طعن صاحب الكشاف في معنى هذا الحديث ووقف في

صحته فقال ان صح هذا الحديث فمعناه ان كل مولود يطمع

الشیطان فی اغوائه الا مریم وابنها فانهما كانا معصومین و
 کذالک من کان فی صفتهم لقوله تعالیٰ ”اَلَا عِبَادَکَ مِنْهُمْ
 الْمُخْلِصِینَ۔“

تلوٹح میں لکھا ہے۔ انما یردّ خبر الواحد من معارضة الكتاب۔ خبر واحد
 جس میں احادیث بخاری و مسلم بھی شامل ہیں بحالت معارضه کتاب اللہ ردّ کرنے کے
 لائق ہے۔

تفسیر حسینی میں زیر تفسیر آیت وَاقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَکُونُوا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ
 لکھا ہے کہ کتاب تیسیر میں شیخ محمد ابن اسلم طوسی سے نقل کیا ہے کہ ایک حدیث مجھے پہنچی
 ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو کچھ مجھ سے روایت کرو پہلے کتاب اللہ
 پر عرض کر لو۔ اگر وہ حدیث کتاب اللہ کے موافق ہو تو وہ حدیث میری طرف سے ہوگی ورنہ
 نہیں۔ سو میں نے اس حدیث کو کہ مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ قرآن سے
 مطابق کرنا چاہا اور تیس سال اس بارے میں فکر کرتا رہا۔ مجھے یہ آیت ملی و اقیموا الصلوة
 ولا تكونوا من المشرکین۔

علماء حنفیہ خبر واحد سے گو وہ بخاری ہو یا مسلم ہو قرآن کریم کے کسی حکم کو ترک نہیں
 کرتے۔ امام شافعی حدیث متواتر کو بھی جن کی تعداد بہت ہی قلیل ہے بمقابلہ آیت کا عدم
 سمجھتے ہیں۔ اور امام مالک کے نزدیک خبر واحد کے مقابلہ میں قیاس مقدم ہے۔
 پس معلوم ہوا کہ حدیث کو قرآن شریف کی کسوٹی کے ساتھ جانچنے کا اصول دنیا
 جہان میں نرالا اصول نہیں ہے بلکہ یہ وہ اصول ہے جس پر مجتہدین امت ہمیشہ عمل کرتے
 رہے ہیں۔

دوسرا عذر جو حامیان قتل مرتد نے قرآن شریف کے معیار سے گریز کرنے کے
 لئے پیش کیا ہے یہ ہے کہ ”امام بخاری جیسے بزرگ کی نسبت یہ خیال بھی دل میں لانا ایک

حیرت انگیز جرأت ہے کہ امام موصوف اپنے مجموعہ میں کوئی ایسی حدیث درج کر سکتے ہیں جو قرآن مجید کے مخالف ہو۔“

اگرچہ یہ عذر حامیان قتل مرتد نے قرآن شریف کے معیار سے بچنے کے لئے پیش کیا ہے۔ مگر اس میں انہوں نے نادانستہ قرآن شریف کو معیار بنانے کے اصول کو جس کو انہوں نے دنیا جہان سے نرالا اصول قرار دیا تھا درست تسلیم کر لیا ہے کیونکہ ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک خود صاحب بخاری نے اس محک سے احادیث کو جانچا اور صرف انہی احادیث کو اپنی صحیح میں درج کیا جن کو انہوں نے قرآن کے مطابق پایا اور وہ ہرگز کسی حدیث کو اپنی کتاب میں درج نہیں کر سکتے تھے جس کو اس محک پر جانچنے کے بعد وہ قرآن شریف کے مخالف پاتے۔ پس اگر یہ ایسا معیار ہے کہ جس کو خود مؤلف بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کو جانچنے کے لئے استعمال کیا اور صرف انہی احادیث کو درج کیا جن کو انہوں نے قرآن شریف کے موافق پایا تو پھر حامیان قتل مرتد کو اس معیار کے قبول کرنے میں کیا عذر ہے؟ اور وہ کیوں اس بات کے لئے تیار نہیں کہ ان کی پیش کردہ روایات کو اسی معیار کے رو سے جانچا جاوے؟

تیسرا عذر جو حامیان قتل مرتد نے قرآن شریف کو معیار قبول کرنے سے گریز کرنے کے لئے اختیار کرنے کے لئے پیش کیا ہے یہ ہے کہ۔

”یہ خیال کہ جو حدیث صحت و درستی کے مقررہ اور مفید یقین معیار پر پوری اترے اس کا معارض نص قرآنی ہونا اس کی پذیرائی کے مانع ہے اہل علم کے نزدیک پرکاش جتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔“

اول تو یہ کہنا کہ ”جو حدیث صحت و درستی کے مقررہ اور مفید یقین معیار پر پوری اترے“ صحیح نہیں۔ کیونکہ ”جس طریق سے احادیث کو جمع کیا گیا ہے اس طریق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ وہ طریق ظنی ہے اور ان کی نسبت یقین کا اڈا کرنا باطل

ہے۔ ائمہ حدیث جس طور سے صحیح اور غیر صحیح حدیثوں میں فرق کرتے ہیں اور جو قاعدہ تنقید احادیث انہوں نے بنایا ہوا ہے وہ تو ہر ایک پر ظاہر ہے۔ احادیث صرف راویوں کے سہارے سے اور ان کی راست گوئی کے اعتبار پر قبول کی گئی ہیں اور یہ طریق یقینی اور قطعی الثبوت نہیں۔ ان احادیث کا فی الواقع صحیح اور راست ہونا تمام راویوں کی صداقت اور نیک چلنی اور سلامت فہم اور سلامت حافظہ اور تقویٰ اور طہارت وغیرہ شرائط پر موقوف ہے۔ اور ان تمام امور کا کما حقہ اطمینان کے موافق فیصلہ ہونا اور کامل درجہ کے ثبوت پر جو حکم روایت کا رکھتا ہے پہنچنا حکم محال کا رکھتا ہے۔ اور کسی کی طاقت نہیں کہ حدیثوں کی نسبت ایسا ثبوت کامل پیش کر سکے۔ تمام ائمہ حدیثوں کے جمع کرنے میں ایک قسم کا اجتہاد کام میں لائے اور مجتہد کبھی مصیب اور کبھی خطی بھی ہوتا ہے۔“

پس حامیانِ قتل مرتد کا یہ دعویٰ کہ محدثین کے مقرر کردہ اصول احادیث کو یقین کے مرتبہ تک پہنچا دیتے ہیں غلط ہے۔

کیا حامیانِ قتل مرتد صحیح بخاری کی تمام احادیث کی نسبت یا ان احادیث کی نسبت جن کو انہوں نے اپنے دعویٰ کی تائید میں موجودہ بحث میں پیش کیا ہے حلفاً کہہ سکتے ہیں کہ ان کا لفظ لفظ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کلمات طیبات ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر نہیں ہوا؟

احادیث کے تین اقسام مقرر کئے گئے ہیں۔ ایک متواتر۔ دوم مشہور۔ سوم اُحاد۔

متواتر کی یہ تعریف لکھی ہے۔ ہو ما یرویہ قوم لایحصی عددہم ولا یتوہم تو اظہم علی الکذب لکثر تہم وعدالتہم وتباین اما کنہم ویدوم هذا الحدّ الی ان یتصل برسول اللہ صلعم (حسامی) یعنی متواتر قسم کی حدیث وہ ہے جس کے روایت کرنے والے اتنے لوگ ہوں کہ وہ شمار میں بھی نہ آسکیں اور ان کی تعداد ایسی کثیر ہو اور وہ ایسے عادل ہوں اور ان کے مکان ایک دوسرے سے اس قدر دُور

ہوں کہ یہ گمان بھی نہ ہو سکے کہ ان سب نے جھوٹ پر اتفاق کر لیا ہے اور یہی شرائط برابر ان راویوں کی جماعت میں بھی پائی جائیں جنہوں نے اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔ اس قسم کی احادیث کی متعلق کہا گیا ہے کہ یہ علم یقین کا فائدہ دیتی ہیں مگر ان کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ علاوہ ازیں اگر کوئی حدیث تواتر کے درجہ پر بھی ہو، تاہم قرآن کریم کے تواتر سے اس کو ہرگز مساوات نہیں۔

دوسری قسم احادیث کی مشہور کہلاتی ہے۔ اس کی تعریف یہ لکھی ہے: - ہو ما کان من الاحاد فی الاصل ثم انتشر فصارت ينقله قوم لا يتوهم تو اظوهم علی الکذب وهم القرن الثانی ومن بعدہم۔ یعنی دراصل مشہور حدیث بھی احاد میں سے ہی ہے مگر اس میں اور عام احادیث احاد میں یہ فرق ہے کہ یہ بعد میں یعنی قرن ثانی و قرن ثالث میں زیادہ لوگوں میں پھیل گئی اور ان بعد کے لوگوں کی تعداد ایسی کثیر ہو کہ ہم یہ گمان نہ کر سکیں کہ انہوں نے جھوٹ پر اتفاق کر لیا۔ ان احادیث کا درجہ متواتر سے کم ہے اور یہ علم یقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔ حسامی میں لکھا ہے کہ لکنہ لما کان من الاحاد فی الاصل ثبت بہ شبهة سقط بها علم الیقین یعنی چونکہ ابتدا میں یہ احادیث بھی احاد میں سے ہی تھیں اس لئے ان میں شبہ ثابت ہے اور اس شبہ کی وجہ سے یہ احادیث یقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔ احادیث کی اس قسم کی نسبت اصول شاشی میں لکھا ہے فیہ ضرب شبهة یعنی اس قسم کی احادیث میں ایک قسم کا شبہ پایا جاتا ہے۔

تیسری قسم احادیث کی احاد ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ خبر الواحد ہو ما نقله واحد عن واحد او واحد عن جماعة او جماعة عن واحد ولا عبرة للعدد اذا لم تبلغ حدّ المشهور یعنی خبر واحد وہ ہے جس کو ایک آدمی نے ایک آدمی سے یا ایک آدمی نے ایک جماعت سے یا ایک جماعت نے ایک آدمی سے نقل کیا ہو اور کثرت تعداد کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ وہ مشہور کی کثرت تعداد سے کم ہو۔ اکثر

احادیث اسی قسم میں داخل ہیں۔ یہاں تک کہ صحیح بخاری کی احادیث کا اکثر حصہ بھی احادیث کی قسم سے ہے۔ اور وہ احادیث بھی جن کو اس بحث میں پیش کیا گیا ہے اس تیسری قسم کی حدیثوں میں شامل ہیں۔ اس قسم کی نسبت اصول شاشی میں لکھا ہے۔ فیہ احتمال شبہة یعنی ان میں شبہ کا احتمال ہے۔

اس تقسیم سے صاف ظاہر ہے کہ اکثر احادیث غایت درجہ مفید ظن ہیں اور ظنی نتیجہ کی منج ہیں صرف متواتر احادیث کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ وہ مفید یقین ہیں۔ مگر اول تو ان کی تعداد بہت ہی قلیل ہے دوسرے وہ بھی ایسی یقینی نہیں جیسا کہ قرآن شریف اور وہ قرآن شریف کے مقابل میں نہیں رکھی جاسکتیں۔

اب میں حامیان قتل مرتد کے اس حقارت آمیز دعویٰ کو لیتا ہوں جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ”یہ خیال کہ جو حدیث صحت و درستی کے مقررہ اور مفید یقین معیار پر پوری اترے اس کا معارض نص قرآنی ہونا اس کی پذیرائی کے مانع ہے اہل علم کے نزدیک پرکاش جتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔“ حامیان قتل مرتد نے اپنے اس بیان میں جو قرآن شریف کی ہتک کی ہے وہ عیاں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں میں ایمانی طاقت ایسی مردہ ہو چکی ہے کہ ان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تحریر میں صرف ان لوگوں کی ہتک نہیں کرتے جو ہر حال میں قرآن شریف کو مقدم کرتے ہیں اور جن میں حضرت عمرؓ اور حضرت امام اعظم جیسے عظیم الشان انسان شامل ہیں بلکہ خود خدا تعالیٰ کے کلام کی ہتک کرتے ہیں۔ خیر۔ مجھے ان کے احساس سے یہاں کوئی کام نہیں۔ میں صرف ان کے بیان کا بطلان ظاہر کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ ائمہ ثلاثہ حامیان قتل مرتد کے نزدیک ”اہل علم“ میں شامل ہوں گے۔ آؤ۔ اب ہم دیکھیں کہ یہ بزرگ اس بارے میں کیا رویہ رکھتے ہیں؟

سنئے! امام شافعیؒ کا یہ مذہب ہے کہ اگر حدیث آیت کے مخالف ہو تو باوجود تواتر کے بھی کالعدم ہے۔ امام مالک کے نزدیک خبر واحد کے ساتھ اگر آیت قرآنی کی تصدیق نہ

ہو تو اس سے قیاس مقدم ہے۔ علماء حنیفہ خبر واحد سے گو وہ بخاری اور مسلم کی ہو قرآن کے کسی حکم کو ترک نہیں کرتے۔ علامہ تفتازانی اپنی کتاب تلویح میں لکھتے ہیں۔

”انما خبر الواحد یردّ من معارضة الكتاب واتفق اهل الحق علی ان کتاب اللہ مقدم علی کل قول فانہ کتاب اُحکمت آیاتہ لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ وقد حفظہ اللہ وعصمہ وما مسہ ایدی الناس وما اختلط فیہ شیء من اقوال المخلوقین۔“

یعنی خبر واحد اگر کتاب اللہ کے معارض ہو تو اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ اور اہل حق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کتاب اللہ ہر ایک قول پر مقدم ہے۔ کیونکہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں باطل کو کچھ دخل نہیں اور اللہ جل شانہ نے اس کی حفاظت فرمائی اور اس کو ہر ایک قسم کی غلطی کی ملاوٹ سے بچایا ہے اور انسانوں کے ہاتھوں نے اس کو نہیں چھوا۔ اور مخلوقات کے اقوال میں سے کچھ بھی کتاب اللہ میں داخل نہیں ہوا۔

اب حامیان قتل مرتد بتائیں۔ انہوں نے کہاں سے سن لیا کہ اس خیال کی اہل علم کے نزدیک پرگاہ کے برابر بھی وقعت نہیں کہ جو حدیث صحت کے مقرر کردہ کامل معیاروں پر پوری اترے اس کا معارض نص قرآنی ہونا اس کی پذیرائی کے مانع ہے۔ کیا صحیح بخاری کی احادیث جن میں سے اکثر احاد ہیں صحت کے کامل معیار پر پوری نہیں اترتیں؟ پھر کیا اہل فقہ ان کو معارض قرآن ہونے کی صورت میں رد نہیں کر دیتے؟ کیا ائمہ ثلاثہ حامیان قتل مرتد کے نزدیک اہل علم میں شامل نہیں؟ کیا علامہ تفتازانی اہل علم کے شمار میں نہیں آسکتے؟ یہ لوگ تو قرآن شریف کو صحیح حدیث پر بھی مقدم رکھتے ہیں اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جو محفوظیت قرآن شریف کی آیات کو حاصل ہے وہ کسی حدیث کو حاصل نہیں اور یہ کہ قرآن شریف کی آیات میں کسی انسان کا قول داخل نہیں ہوا اور قرآن شریف انسانی دستبرد سے بالکل محفوظ اور مامون ہے۔ مگر احادیث کا خواہ وہ صحت کے کیسے اعلیٰ معیار پر ہوں یہ حال

نہیں ہے۔

چوتھا عذر حامیان قتل مرتد نے قرآن شریف کے معیار سے گریز کرنے کے لئے یہ اختیار کیا ہے کہ ہرزید و بکر کے فہم کو فیصلہ کا معیار نہیں مانا جاسکتا۔ ایک شخص کے نزدیک ایک حدیث معارض قرآن ہوتی ہے دوسرے کے نزدیک وہ معارض قرآن نہیں ہوتی۔ اس اختلاف کی موجودگی میں دو اویں حدیث کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

چونکہ مرتد کو محض ارتداد کے لئے قتل کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو نہ صرف قرآن شریف رد کرتا ہے بلکہ عقل سلیم بھی اس کو دھکے دیتی ہے۔ اس لئے حامیان قتل مرتد جیسے قرآن شریف کے معیار سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ ایسا ہی عقل سلیم کے فتویٰ کا بھی ان کے دل میں بہت خوف بیٹھا ہوا ہے اس لئے یہ دونوں سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے بغیر چارہ نہیں۔ قرآن شریف چھوڑنے سے تو اسلام کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ اور عقل کو جواب دینے سے خود علماء بے دست و پا ہو جاتے ہیں کیونکہ اگر عقل کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ بیشک ہمارے دین کا دار و مدار سارا قرآن شریف پر ہے اور صحیح احادیث بھی ایک بیش قیمت خزانہ ہے جو ہماری روح کی غذا ہے اور دین کے سمجھنے میں ہمیں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اور بہت سی تفصیل ہیں جو ہمیں احادیث کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن شریف اور احادیث پر تدبر اور غور کرتے وقت ہمیں عقل سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ اگر عقل سے کام نہ لیا جاوے تو ایک دم بھی گزارہ نہیں ہو سکتا۔ خود احادیث صحیحہ میں اختلاف ہوتا ہے اور اس وقت ہمیں صحیح فیصلہ پر پہنچنے کے لئے عقل کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ احادیث اور آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کیلئے ہم کو عقل خدا داد سے کام لینا پڑتا ہے۔ پس عقل کو جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اگر عقل ایسی گمراہ کن چیز تھی تو ہمیں بار بار قرآن شریف کی آیات پر تدبر کرنے کی کیوں تاکید کی جاتی ہے؟ حامیان قتل مرتد پوچھتے ہیں کہ

ہم کس عقل سے معلوم کریں کہ آیت اور حدیث میں تعارض ہے یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ ہم اسی عقل سے معلوم کریں گے جس کے ذریعہ دو متعارض احادیث میں ہم تعارض معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر ہماری عقل دو متعارض احادیث میں تعارض معلوم کر سکتی ہے تو وہ حدیث اور آیت میں بھی تعارض معلوم کر سکتی ہے۔ حامیان قتل مرتد فرماتے ہیں کہ ایک شخص کی عقل کہتی ہے کہ فلاں حدیث آیت قرآنی کے متعارض ہے اور دوسرے کی عقل کہتی ہے کہ نہیں کوئی تعارض نہیں اب کس طرح فیصلہ کیا جاوے کہ کس کی عقل درست کہتی ہے اور کسی کی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا اسی طرح فیصلہ ہوگا جس طرح کہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے دلائل پیش کریں گے اور پبلک خود فیصلہ کر لے گی کہ کس کے دلائل مضبوط ہیں اور کس کے کمزور؟

پھر حامیان قتل مرتد فرماتے ہیں کہ اختلاف رائے کی وجہ سے دو اہل حدیث کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا پہلے اختلاف رائے موجود نہیں ہے؟ پھر کیا اس اختلاف کے ہوتے ہوئے دو اہل حدیث کی حیثیت زائل ہوگئی ہے؟ اگر پہلے اختلاف کی وجہ سے دو اہل حدیث کی حیثیت قائم ہے تو پھر بعد کے اختلاف سے بھی ان کی حیثیت زائل نہیں ہو سکتی۔ دو اہل حدیث تو ایک ذخیرہ ہیں جو تحقیق کے لئے بطور مصالح کے کام دیتے ہیں۔ محدثین کا خود اصول ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا بلکہ ان کے نزدیک اجتہاد کا اب بھی حق حاصل ہے۔

پس اجتہاد اور تحقیق کا باب مسدود نہیں ہوا اور احادیث کو قرآن شریف پر عرض کرنا یہ بھی ایک تحقیقات کا ذریعہ ہے۔ اس سے احادیث کا ذخیرہ بے کار نہیں ہو جاتا۔ کیا جب دو صحیح احادیث آپس میں متعارض ہوں ایک کو دوسری پر ترجیح نہیں دی جاتی؟ پھر اگر کوئی حدیث قرآن شریف کی آیات کے مخالف ہو اور قرآن شریف کو حدیث پر ترجیح دی جائے تو اس میں دو اہل حدیث کی کون سی ہتک لازم آتی ہے؟

پانچواں عذر قرآن شریف کے معیار سے گریز کرنے کے لئے مولوی صاحبان یہ پیش کرتے ہیں کہ جو حدیث محدثین کے اصول کے رو سے صحیح ثابت ہو جائے اس کا معارض قرآن ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ اس لئے کسی ایسی حدیث کو جو محدثین کی اصطلاح میں صحیح کہلاتی ہے قرآن شریف پر عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر یہ درست ہے کہ جس کو محدثین اپنی اصطلاح میں صحیح حدیث کہتے ہیں وہ قرآن شریف سے کسی صورت میں بھی معارض نہیں ہو سکتی تو پھر آپ قرآن شریف کا معیار قبول کرنے سے ڈرتے کیوں ہیں؟ پھر تو آپ کو خوشی سے اس معیار کو قبول کر لینا چاہیے تھا۔ کیونکہ آپ کے اس قول سے تو ثابت ہوتا ہے کہ صحیح حدیث کا قرآن سے موافق ہونا ضروری ہے۔ گویا آپ اس اصول کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ پس جب یہ اصول خود آپ کے نزدیک بھی درست ہے تو پھر آپ کیوں میدان میں نہیں نکلتے اور کیوں اپنی پیش کردہ روایات کو ان معنوں میں جو آپ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں قرآن شریف کے ساتھ مطابق کر کے نہیں دکھاتے؟

نیز حامیان قتل مرتد کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ جس حدیث کا نام محدثین نے اپنے قواعد کے رو سے صحیح رکھا ہے اس کا معارض قرآن ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ جب صحیح کہلانے والی احادیث خود آپس میں متعارض ہیں تو قرآن شریف سے کیوں متعارض نہیں ہو سکتیں۔ حامیان قتل مرتد پہلے ان کا باہمی تعارض دور کریں اس کے بعد یہ دعویٰ پیش کریں کہ ان کا معارض قرآن ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ ان صحیح کہلانے والی احادیث میں خود باہم اس قدر اختلاف ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کا تعارض دور نہیں کر سکے اور ان کی جمع کی ہوئی احادیث میں جو صحیح سمجھی جاتی ہیں اختلاف اور تعارض موجود ہے۔ اور ان احادیث میں باہمی سخت تعارض کے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا کہ ان کا معارض قرآن ہونا قطعاً ناممکن ہے ایک بڑے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

غرض اس بات میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن شریف بہر حال احادیث پر مقدم ہے۔ قرآن شریف کا ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ یقینی اور قطعی ہے اور اس میں انسان کا ذرا بھی دخل نہیں۔ اور اکثر درجہ احادیث غایت درجہ ظنی ہیں اور انسان کی دست برد سے خالی نہیں۔ پس قرآن شریف کا حق ہے کہ اسے حکم بنایا جاوے۔ اور اگر کوئی حدیث قرآن کی صریح تعلیم کے خلاف ہو تو اول تو ہمیں اس حدیث کو ایسے مفہوم میں لینا چاہیے جو قرآن شریف کے مخالف نہ ہو۔ اور اگر کوئی صورت تطبیق کی نہ ہو تو پھر ہمیں قرآن شریف کو حدیث پر مقدم رکھنا چاہیے نہ کہ اس حدیث کو جو کہ قرآن شریف کے صریح مخالف ہو۔ اس لئے موجودہ بحث میں پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ آیا مرتد کا محض ارتداد کے لئے قتل کرنا قرآن شریف کی تعلیم کے مطابق ہے یا اس کے خلاف ہے؟ اگر قرآن شریف سے قطعی اور یقینی طور پر یہ امر ثابت ہو جائے کہ کسی شخص کو محض اس لئے قتل کر دینا کہ اس نے اسلام کو ترک کر کے کوئی اور مذہب اختیار کر لیا ہے اسلام کی تعلیم کے موافق اور مطابق ہے اور قرآن شریف کی تعلیم کی یہی روح ہے کہ ایسے شخص کو قتل کر دینا چاہیے جو اسلام لا کر پھر ارتداد اختیار کرتا ہے تو ہمیں بسر و چشم اس عقیدہ کو قبول کرنا چاہیے اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ لیکن اگر قرآن کریم سے یہ ثابت ہو کہ مرتد کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل کرنا ایک ظلم ہے تو پھر بہر حال قرآن شریف کو مقدم کرنا ہوگا اور اگر کوئی روایت قرآن شریف کے صریح خلاف ہو تو اسے مجبوراً ترک کرنا پڑے گا۔

عدم قتل مرتد کا ثبوت حدیث سے

اس کے بعد میں نہایت خوشی سے اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ جیسا قرآن شریف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کو محض ارتداد کے لئے قتل کرنا جائز نہیں اسی طرح احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مرتد کو محض ارتداد کے لئے قتل

نہیں کرایا۔ اور یہ کہ ارتداد کی سزا قتل نہ تھی اور مرتد کے لئے کوئی شرعی سزا مقرر نہیں۔ یہ دعویٰ ہے جس کے ساتھ میں بفضلہ تعالیٰ حدیث کے مضمون کو شروع کرتا ہوں اس دعویٰ کا ثبوت حسب ذیل ہے:-

پہلا ثبوت۔ صحیح بخاری میں مندرجہ ذیل واقعہ اس امر کا فیصلہ کر دیتا ہے کہ مرتد کیلئے محض ارتداد کے واسطے کوئی شرعی حد مقرر نہ تھی۔ اس حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

”عن جابر بن عبد اللہ ان اعرابیا بايع رسول الله صلى الله عليه وسلم على الاسلام فاصاب الاعرابى وعث بالمدينة ف جاء الاعرابى الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله اقلنى بيعتى فأبى رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم جاء فقال اقلنى بيعتى فأبى فقال اقلنى بيعتى ثم جاءه فقال اقلنى بيعتى فأبى فخرج الاعرابى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ”انما المدينة كالكبير تنفى خبثها وتنصع طيبها“

(فتح الباری جلد 13 صفحہ 173 و بخاری ہندی صفحہ 1070)

یعنی جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اسلام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ اس کے بعد اعرابی کو مدینہ میں بخار ہو گیا۔ پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ میری بیعت مجھے واپس دے دیں۔ پھر وہ دوبارہ آیا اور کہنے لگا کہ میری بیعت مجھے واپس دے دیں۔ آپ نے انکار فرمایا۔ پھر وہ اعرابی مدینہ سے چلا گیا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے وہ میل کو نکال دیتا ہے اور اصل پاکیزہ چیز کو خالص کر دیتا ہے۔

اب یہ ارتداد کا واقعہ ہے جو مدینہ میں واقع ہوا۔ ایک شخص اسلام لانے کے بعد

مرد ہو گیا مگر اس کو قتل کی سزا نہیں دی گئی۔ اب کہاں ہیں حامیان قتل مرتد؟ وہ بتائیں کہ اگر اسلام میں ارتداد کے لئے قتل کی حد مقرر تھی تو پھر اس مرتد کو کیوں قتل نہ کیا گیا؟ اس پر کیوں شرعی حد جاری نہ کی گئی؟ کیا امیر امان اللہ خان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت زیادہ دینی غیرت ہے؟ کیا امیر کابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت شرعی حدود کا زیادہ نافذ کرنے والا ہے؟ پھر کیا وجہ کہ اس مرتد کو جس نے آپ کے سامنے مدینہ میں ارتداد کیا قتل نہ کیا گیا؟ اس شخص کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بار بار آنا بھی ظاہر کرتا ہے کہ مرتد کے لئے قتل کی سزا مقرر نہ تھی۔ ورنہ وہ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ آتا بلکہ کوشش کرتا کہ بلا اطلاع چپکے سے نکل جائے اور کسی پر ظاہر نہ کرتا کہ وہ ارتداد اختیار کرنا چاہتا ہے۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ مرتد کی سزا قتل، ارتداد اور روکنے کے لئے شریعت اسلام میں مقرر کی گئی ہے اور اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ لوگوں کو اسلام پر رہنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں اس کو متنبہ نہ کیا؟ اور کیوں یہ نہ کہا کہ یاد رکھو! کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اگر تم ارتداد اختیار کرو گے تو تمہیں قتل کیا جائے گا؟ اور جب کہ وہ بار بار ارتداد کا ارادہ ظاہر کرتا تھا اور خوف تھا کہ وہ مرتد ہو کر چلا جائے گا تو ایسی صورت میں کیوں اس پر پہرہ مقرر نہ کیا گیا تا اگر وہ مرتد ہو کر جانے لگے تو اس کو پکڑ لیا جاوے اور اس پر شرعی حد جاری کی جاوے؟ کیوں صحابہؓ نے اس کو یہ نہ کہا کہ میاں! اگر جان کی خیر چاہتے ہو تو ارتداد کا نام نہ لو کیونکہ اس شہر میں تو یہ قاعدہ جاری ہے کہ جو شخص اسلام لا کر پھر ارتداد اختیار کرتا ہے اس کو فوراً قتل کر دیا جاتا ہے؟

پس اس اعرابی کا بار بار ارتداد کا اظہار کرنا اور اس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بار بار جانا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو ارتداد کے نتیجے سے متنبہ نہ کرنا اور نہ صحابہؓ کا اس کو قتل کا حکم سنانا اور آخر کار اس کا بغیر کسی قسم کے تعرض کے مدینہ سے نکل جانا،

یہ سب امور صاف طور پر اس امر کے شاہدین ہیں کہ اسلام میں مرتد کے لئے کوئی شرعی حد مقرر نہ تھی۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے نکل جانے پر ایک طرح کی خوشی کا اظہار کرنا اور فرمانا کہ مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے جو میل کچیل کو پاکیزہ جوہر سے جدا کر دیتا ہے صاف ظاہر کرتا ہے کہ آپ اس اصول کے مخالف تھے کہ کسی کو جبر سے اسلام پر رکھا جاوے اور لوگوں کو جبری ذرائع اختیار کر کے ارتداد سے روکا جائے۔ بلکہ اگر ناپاک انسان مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جاتا تو آپ اس پر ناخوش نہیں ہوتے تھے۔ اور آپ یہ کوشش نہیں فرماتے تھے کہ اس کو اس کی مرضی کے خلاف جبراً اسلام میں رکھا جاوے بلکہ ایسے شخص کا چلا جانا آپ کے نزدیک گویا خس کم جہاں پاک کا مصداق تھا۔ اگر آپ کا یہ اصول ہوتا کہ جو شخص ایک دفعہ اسلام میں داخل ہو جائے اس کو ہر ممکن ذریعہ سے اسلام میں رہنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ اور اگر وہ کسی طرح بھی نہ مانے تو اس کو قتل کیا جاوے تا اس کی مثال دوسروں کے لئے عبرت ہو۔ تو چاہیے تھا کہ آپ اس اعرابی کے جانے پر خفا ہوتے اور صحابہؓ کو ڈانٹتے کہ تم نے اس کو کیوں جانے دیا؟ کیوں اس کو پکڑ کر قتل کی دھمکی نہ دی؟ اور چاہیے تھا کہ آپ صحابہؓ کو حکم دیتے کہ دوڑو! اور جہاں ہو اس خبیث کو پکڑ لاؤ تا اس کو قتل کی سزا دی جائے۔ مگر آپ نے ایسا نہ کیا بلکہ دوسرے الفاظ میں یہ فرمایا کہ اچھا ہو اوہ چلا گیا۔ وہ اس قابل نہ تھا کہ مسلمانوں میں رہے۔ خدا تعالیٰ نے خود اس کو اپنے ہاتھ سے ہم سے جدا کر دیا ہے۔

غرض اس اعرابی کی مثال ایک قطعی اور یقینی ثبوت اس امر کا ہے کہ مرتد کے لئے کوئی شرعی سزا مقرر نہ تھی اور مسلمانوں میں قطعاً یہ طریق جاری نہ تھا کہ وہ ہر ایک مرتد کو محض اس کے ارتداد کی وجہ سے قتل کر دیتے۔

دوسرا ثبوت اس امر کا کہ مرتد کے لئے کوئی شرعی حد مقرر نہ تھی وہ شرائط ہیں جن

کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام حدیبیہ میں مشرکین مکہ کے ساتھ صلح کی۔ صلح حدیبیہ کی حدیث میں لکھا ہے۔

”صالح النبي صلى الله عليه وسلم المشركين يوم الحديبية علي
ثلاثة اشياء. علي من اتاه من المشركين رده اليهم ومن اتاهم من
المسلمين لم يرده.“ (بخاری مطبوعہ مصر جلد 2 صفحہ 76)

براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن مشرکین کے ساتھ تین باتوں پر صلح کی۔ پہلی شرط یہ تھی کہ اگر مشرکین سے کوئی شخص مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے تو آپؐ اس کو مشرکین کی طرف واپس کر دیں گے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص مرتد ہو کر مشرکین کی طرف چلا جائے تو مشرکین اس کو آپؐ کی طرف واپس نہیں کریں گے۔

اس صلح نامہ کی دوسری شرط سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ مرتد کے لئے کوئی شرعی حد مقرر نہ تھی کیونکہ اگر ارتداد کے لئے شریعت اسلام میں یہ سزا مقرر ہوتی کہ اس کو قتل کیا جائے تو شرعی حد کے معاملہ میں کبھی مشرکین کی بات قبول نہ فرماتے۔ اس صلح کی نسبت خود خدا تعالیٰ شہادت دیتا ہے کہ اس کے شرائط تقویٰ پر مبنی تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ الْحَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ
سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ
بِهَا وَأَٰهْلَٰهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٢٧﴾ (الفج: 27)

اس وقت کو یاد کرو جبکہ کافروں نے اپنے دلوں میں ایسی جنبہ داری کی روح پھونکی جو جاہلیت کی جنبہ داری کی روح تھی۔ اس پر اللہ نے اپنی طرف سے نازل ہونے والی سکینت اپنے رسول کے دل پر اور مومنوں کے دل پر اتار دی اور تقویٰ کے طریق پر ان کے قدم کو مضبوط کر دیا اور وہی اس کے زیادہ مستحق تھے اور اس کے اہل تھے اور اللہ ہر

ایک چیز کو جانتا ہے۔

پس آپ کا اس امر کو منظور فرمالینا کہ اگر کوئی شخص مسلمانوں میں سے مرتد ہو کر مشرکین کی طرف چلا جائے گا تو اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ مرتدین کے لئے کوئی شرعی حد مقرر نہ تھی۔ ورنہ آپ فرماتے کہ یہ شرعی حد کا معاملہ ہے اور میں شرعی حکم کے خلاف تمہارے ساتھ معاہدہ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ شرعی حدود کے اجراء کے معاملہ میں آپ ایسے مضبوط تھے کہ اس کے خلاف آپ کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ شرعی مجرموں کے متعلق آپ کوئی ایسی شرط منظور فرماتے جو شرعی احکام کے نفاذ میں روک ہو۔ اگر کوئی شخص یہ عذر کرے کہ ایسا شخص مکہ میں جا کر شرعی حدود کے دائرہ سے نکل جاتا تھا کیونکہ وہ اسلامی علاقہ سے نکل کر دشمن کے علاقہ میں چلا جاتا تھا تو یہ عذر درست نہیں ہے۔ کیونکہ دشمن کا ملک وہ اس وقت کہلا سکتا تھا جب تک کہ صلح نہیں ہوئی تھی۔ مصالحت کے بعد وہ علاقہ دشمن کا علاقہ نہیں کہلا سکتا تھا۔ ایسا عذر کرنے والا مجھے انصاف سے بتائے کہ اگر مشرکین مکہ کسی اور شرعی مجرم کی نسبت یہ شرط کرتے کہ اگر وہ ہمارے علاقہ میں آجائے تو اس پر شرعی حد جاری نہ کی جائے۔ تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وجہ سے اس شرط کو منظور فرما لیتے کہ ایسا مجرم دشمن کے علاقہ میں چلا جانے کی وجہ سے اسلامی احکام کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے اس لئے ایسی شرط منظور کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک انصاف پسند یہی کہے گا کہ آپ کسی اور شرعی مجرم کے متعلق ایسی شرط ہرگز قبول نہ فرماتے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے مرتد کے متعلق ایسی شرط منظور فرمائی؟ اگر ارتداد کے لئے بھی ایسی ہی شرعی حد مقرر ہوتی جیسی کہ مثلاً قتل یا سرقہ یا زنا کے لئے حد مقرر ہے تو آپ کبھی صلح نامہ کی دوسری شرط منظور نہ فرماتے۔ پس آپ کا اس شرط کو قبول کر لینا اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ارتداد شرعی جرم نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس کے لئے کوئی شرعی حد مقرر نہ تھی۔

تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ صحابہؓ کو یہ صلح بہت دو بھر معلوم ہوئی کیونکہ اس میں وہ اپنی سبکی سمجھتے تھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس صلح کی شرائط پر اعتراض کیا۔ اور اگر شریعت اسلام میں یہ بھی حکم ہوتا کہ مرتد پر قتل کی حد جاری کی جائے تو جہاں صحابہؓ نے اپنے دوسرے اعتراض پیش کئے وہ یہ بھی عرض کرتے کہ مرتد کے لئے تو شریعت اسلام کا یہ حکم ہے کہ اس پر قتل کی حد جاری کی جائے اس کے متعلق آپؐ کیوں ایسی شرط منظور فرماتے ہیں؟ مگر انہوں نے ایسا اعتراض نہیں کیا جس سے ظاہر ہے کہ شریعت اسلام میں مرتد کے لئے کوئی شرعی حد مقرر نہ تھی۔

تیسرا ثبوت۔ تیسرا ثبوت اس امر کا اسلام میں مرتد کے لئے قتل کی سزا مقرر نہ تھی وہ مکالمہ ہے جو ابوسفیان اور ہرقل کے درمیان مقام ایلیا میں ان ایام میں ہوا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے مابین صلح ہو چکی تھی یعنی صلح حدیبیہ کے بعد۔ ابوسفیان خود اس سوال و جواب کا ذکر کرتا ہے جو ہرقل قیصر روم اور اس کے مابین واقع ہوا وہ کہتا ہے کہ جب ہرقل نے مجھے اپنے دربار میں بلایا تو میرے ساتھیوں کو میرے پیچھے کھڑا کر دیا اور ان کو کہا کہ میں اس شخص کے بارے میں جو تمہارے ملک میں نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تمہارے اس ساتھی (ابوسفیان) سے کچھ سوال کروں گا۔ اگر یہ شخص اپنے جواب میں کوئی بات خلاف واقعہ بیان کرے تو تم اس کی فوراً تردید کر دینا۔ ابوسفیان کہتا ہے کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ اگر میں جھوٹ کہوں گا تو میرے ساتھی میری تردید کر دیں گے اور اس طرح مجھے اس بادشاہ کے دربار میں شرمندہ ہونا پڑے گا تو میں اپنے جوابات میں ضرور جھوٹ سے کام لیتا۔ اور میں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے جوابات میں کوئی ایسی بات بھی ملا دوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو۔ مگر مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا۔ سوائے ایک بات کے اور وہ یہ تھی کہ جب اس نے مجھ سے سوال کیا کہ یہ نبی اپنے عہد میں کیسا ہے؟ تو میں نے جواب دیا کہ اب تک تو اس نے ہمارے ساتھ کوئی عہد شکنی نہیں

کی۔ ہاں اب ایک تازہ معاہدہ اس سے ہوا ہے دیکھئے اب وہ کیسا معاملہ کرتا ہے؟ اپنے عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔ ابوسفیان کہتا ہے کہ صرف یہ الفاظ تھے جو میں اپنے جوابات میں اپنی طرف سے بڑھا سکا۔ اور کوئی موقع مجھے ایسا نہ ملا کہ میں کوئی ایسی بات کہہ سکوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پڑے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جو سوالات ہر قتلِ قیصر روم نے اپنے دربار میں ابوسفیان سے کئے ان میں ایک سوال ارتداد کے متعلق بھی تھا۔ ہر قتل نے ابوسفیان سے سوال کیا کہ لوگ اس نبی کا دین قبول کرنے کے بعد مرتد ہوتے ہیں یا نہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ اب اگر یہ واقعہ ہے کہ ارتداد کے روکنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ ہر ایک شخص جو اسلام لانے کے بعد ارتداد اختیار کرے اس کو قتل کر دو تو ابوسفیان ضرور اس امر کا ذکر ہر قتل سے کرتا۔ وہ تو اس تاڑ میں لگا ہوا تھا کہ کوئی مفید مطلب بات مجھے مل جائے تو میں اسے بیان کروں۔ بھلا وہ ایسے موقع کو کیوں اپنے ہاتھ سے جانے دیتا۔ وہ ضرور کہتا کہ ہاں صاحب! مرتد تو نہیں ہوتے مگر اس کی یہ وجہ ہے کہ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ جو شخص اس کے دین سے ارتداد اختیار کرے گا اس کو قتل کیا جائے گا۔

پس ہر قتلِ قیصر روم کے ساتھ ابوسفیان کا تاریخی مکالمہ بھی اس امر کی ایک قوی دلیل ہے کہ ارتداد کے لئے مرتدین کو قتل کرنے کا کوئی حکم اسلام میں جاری نہ تھا۔

چوتھا ثبوت۔ میں خدا تعالیٰ کا ہزار شکر کرتا ہوں کہ اس نے اپنے فضل اور رحم سے اس دعویٰ کے پاش پاش کرنے کے لئے اسلام میں مرتد کے لئے قتل کے لئے شرعی حد مقرر کی گئی ہے ایک ایسا حربہ عطا فرمایا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کاری حربہ خیال میں لانا بھی مشکل ہے۔ یہ ایسا تیز حربہ ہے کہ اس کے سامنے قتلِ مرتد کا عقیدہ ایک طرفۃ العین کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتا۔

ان زبردست دلائل میں سے ایک دلیل جو اس غلط عقیدہ کو اس طرح اڑا دیتی ہے

جس طرح کہ ایک تنکا تیز ہوا کے سامنے اڑ جاتا ہے میں ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ اور ناظرین کو معلوم ہوگا کہ کس طرح وہ واقعہ جس کو میں ابھی بیان کروں گا روز روشن کی طرح اس امر کو ثابت کر دیتا ہے اور اس میں ذرہ بھی شک نہیں رہتا کہ ارتداد کے لئے اسلام میں کوئی شرعی حد مقرر نہیں کی گئی۔

یہ واقعہ عبداللہ بن ابی سرح کا ہے۔ وہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب وحی تھا مرتد ہو کر کفار سے جا ملا۔ فتح مکہ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو معافی دے دی سوائے چند آدمیوں کے جن کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی۔ ان چند آدمیوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کا حکم دیا۔ ان میں عبداللہ بن ابی سرح کا نام بھی تھا۔ یہ حضرت عثمان بن عفانؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کو اپنے ہاں پناہ دے دی اور وہ ان کے گھر میں چھپا رہا۔ جب امن ہو گیا تو حضرت عثمانؓ نے اس کی سفارش کی۔ ان کی سفارش پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک خاموش رہے۔ اس کے بعد آپؐ نے اس کو معاف کر دیا۔

جب عبداللہ بن ابی سرح چلا گیا تو آپؐ نے صحابہؓ کو فرمایا کہ جب میں نے معافی دینے میں دیر کی تھی تو تم نے اس کو قتل کیوں نہ کر دیا؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ آپؐ اشارہ فرما دیتے تو ہم اس کو قتل کر دیتے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ”وان النبی لا ینبغی ان تکون لہ خائنة الاعین“ یعنی یہ نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ آنکھوں کی خیانت سے کام لے۔ تفسیر کبیر میں عبداللہ بن ابی سرح کی نسبت لکھا ہے۔

”فلما کان یوم الفتح امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقتلہ
فاستجار لہ عثمان فأجارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم انه
اسلم وحسن اسلامہ“

(تفسیر کبیر لفظ الدین رازی جلد 5 صفحہ 527)

یعنی فتح کے دن آپ نے عبداللہ بن ابی سرح کے قتل کا حکم دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پناہ دے دی اور معاف کر دیا۔

روح المعانی جلد ۴ صفحہ ۴۸۴ پر لکھا ہے۔

”کان یکتب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فازلہ الشیطن فلقح
بالکفار فامر بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یقتل یوم فتح مکة
فاستجارلہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فاجارہ النبی صلی اللہ
علیہ وسلم.“

یعنی وہ پہلے کاتبِ وحی تھا۔ پھر شیطان نے اس کو بہکا دیا اور وہ کافروں سے جا ملا۔ فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پناہ دے دی۔

اب عبداللہ بن ابی سرح کا واقعہ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں ارتداد کے لئے کوئی شرعی حد مقرر نہیں کی گئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سرح کے قتل کا حکم اس لئے نہیں دیا تھا کہ وہ مرتد تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ایک پولیٹیکل مجرم تھا۔ کیونکہ (۱) حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا عبداللہ بن ابی سرح کو اپنے گھر میں پناہ دینا بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس کو پولیٹیکل جرم کی وجہ سے قتل کا حکم دیا گیا تھا نہ ارتداد کی وجہ سے۔ کیونکہ اگر قتل کے حکم کی وجہ ارتداد ہوتا اور ارتداد کے لئے قتل شرعی حد ہوتی تو حضرت عثمانؓ کبھی اس کو شرعی حد سے بچانے کے لئے کوشش نہ کرتے۔

کیا ناظرین خیال کر سکتے ہیں کہ مثلاً ایک شخص زنا کا ارتکاب کرتا یا سرقہ کا مرتکب ہوتا تو حضرت عثمانؓ ایسے شخص کو شرعی حد سے بچانے کے لئے اپنے ہاں پناہ دیتے؟ ہرگز نہیں۔ پس اگر عبداللہ بن ابی سرح کو ارتداد کی وجہ سے قتل کا حکم دیا گیا تھا اور ارتداد کیلئے

شرعی حد قتل مقرر تھی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسا انسان کبھی ایسے شخص کو شرعی حد سے بچانے کے لئے اپنے گھر میں پناہ نہ دیتا اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ سفارش نہ کرتے کہ اس مرتد پر شرعی حد جاری نہ کی جائے۔

(۲) اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو اپنے ہاں پناہ دی جو ایک شرعی حد کا سزاوار ہو چکا تھا اور اس کو شرعی حد سے بچانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کی سفارش کی۔ تو یہ کبھی بھی گمان میں نہیں آ سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شرعی حد کے متعلق کسی کی بھی سفارش قبول فرماتے۔ یہ ایک ثابت شدہ اور یقینی امر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شرعی حد کے نفاذ کے وقت کسی کی بھی سفارش نہیں سنتے تھے اور اگر کوئی شخص کسی ایسے مجرم کی سفارش کرتا جس پر شریعت کی حد وارد ہوتی تو ایسے سفارش کرنے والے پر بھی آپ ناراض ہوتے۔ اس مخزومی عورت کا واقعہ یاد کرو جس نے چوری کا ارتکاب کیا۔ میں یہاں اس واقعہ کو حضرت عائشہؓ کے الفاظ میں صحیح بخاری سے نقل کرتا ہوں:-

”عن عائشة ان قريشا اهتمتهم المرأة المخزومية التي سرقت قالوا من يكلم رسول الله صلى الله عليه وسلم و من يجترئ اليه الا اسامة ابن زيد حب رسول الله صلى الله عليه وسلم فكلم رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال أتشفع في حد من حدود الله ثم قام فخطب فقال ايها الناس انما ضلل من قبلكم انهم كانوا اذا سرق الشريف تركوه واذا سرق الضعيف فيهم اقاموا عليه الحد و آيم الله لو ان فاطمة بنت محمد (صلى الله عليه وسلم) سرقت لقطعتم يدها.“

(بخاری ہندی صفحہ 1003)

یعنی قریش کو اس مخزومی عورت کی وجہ سے بہت فکر ہوا جس نے چوری کی تھی۔ انہوں

نے آپس میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کون بات کر سکتا ہے اور کس کو آپ سے گفتگو کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے سوائے اسامہ بن زید کے جس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت ہے۔ پس حضرت اسامہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں سفارش کی۔ آپ نے فرمایا اُتشفع فی حدّ من حدود اللہ کیا تو خدا تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتا ہے؟ پھر آپ کھڑے ہوئے۔ آپ نے ایک تقریر فرمائی۔ اور سب صحابہؓ کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے لوگو! تم سے پہلی امتیں اس لئے گمراہ ہو گئیں کہ جب کوئی شریف خاندان کا آدمی ان میں سے چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر شرعی حد جاری کرتے۔ خدا تعالیٰ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

اس واقعہ سے ناظرین نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شرعی حدود کے معاملہ میں کیا رویہ تھا۔ کیا ناظرین ایک طرفۃ العین کے لئے بھی گمان کر سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ یا کسی اور شخص کی سفارش پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی شرعی حد کو ترک کر سکتے تھے؟ اگر عبداللہ بن ابی سرح پر بوجہ ارتداد کوئی شرعی حد وارد ہو سکتی تھی تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ آپ حضرت عثمانؓ کی سفارش کا لحاظ کر کے اس کو معاف کر دیتے۔ لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی سفارش پر دیر تک آپ خاموش رہے اور اس خیال پر کہ صحابہؓ میں سے کوئی شخص اسے تلوار کی گھاٹ اتار دے گا۔ اگر عبداللہ بن ابی سرح ایک شرعی حد کا مستوجب تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ضرورت تھی کہ اس طرح خاموشی اختیار کرتے اور صحابہؓ کا انتظار فرماتے کہ ان میں سے کوئی شخص عبداللہ بن ابی سرح کو قتل کرتا؟ ایسی صورت میں آپ حضرت عثمانؓ کو وہی جواب دیتے جو آپ نے اسامہؓ کو دیا تھا۔ اُتشفع فی حدّ من حدود اللہ یعنی کیا تو حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتا ہے؟ آپ اس قسم کی سفارشوں کو سخت کراہت کی نظر سے

دیکھتے تھے اور آپؐ نے مخزومی عورت کے واقعہ میں صحابہؓ کے سامنے اس مضمون پر ایک خاص تقریر فرمائی اور ان کو متنبہ کیا کہ شرعی حدود کے اجراء میں کسی شخص کے ساتھ رعایت کرنا ہلاکت کی راہ ہے اس سے ہمیشہ بچتے رہو۔ تم سے پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی یہی طریق اختیار کر کے ہلاک ہو جاؤ۔

پس جس امر سے آپؐ نے لوگوں کو ایسی سختی سے ڈرایا یہ کس طرح گمان میں آسکتا ہے کہ آپؐ نے خود وہی کام کیا؟ اور نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نسبت یہ گمان ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایسی جرأت کی کہ ایک شرعی مجرم کو شریعت کی حد سے بچانے کے لئے اپنے گھر میں کئی دن تک چھپائے رکھا اور پھر اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی کہ اس پر شرعی حد جاری نہ کی جائے۔ پس حضرت عثمانؓ کا عبداللہ بن ابی سرح کو اپنے ہاں پناہ دینا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا باوجود ناپسندیدگی کے محض عثمانؓ کی پاس خاطر اس کو معاف کر دینا صاف ظاہر کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سرح کے قتل کا حکم اس کے ارتداد کی سزا میں نہیں دیا تھا اس کے متعلق بھی اس حکم کی اسی قسم کی وجوہات تھیں جو اس کے ساتھ کے دوسرے دس بارہ آدمیوں کی صورت میں تھیں۔ آپؐ نے صرف عبداللہ بن ابی سرح کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ ان کے ساتھ بعض اور آدمی بھی تھے جن کے متعلق آپؐ نے ایسا ہی حکم دیا تھا مگر ان میں سے صرف چار ہی مارے گئے باقی سب کو عبداللہ بن ابی سرح کی طرح معافی دے دی گئی۔ میں ان کی فہرست ذیل میں نقل کرتا ہوں تا ناظرین کو معلوم ہو کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے متعلق قتل کا حکم ارتداد کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ان کے دوسرے جرموں کی وجہ سے تھا۔

(۱) ابن خطل - مسلمان ہونے کے بعد ایک صحابی کو قتل کر کے بھاگ آیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہا کرتا تھا اور اپنی لونڈیوں سے آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہلوا کر لوگوں کو سنوایا کرتا تھا۔ مسلمانوں کو ہر طرح دکھ دیتا تھا۔ اس کو قتل کیا گیا۔ (شرح زرقانی علی مواہب اللدنیہ جلد 2 صفحہ 322)

(۳۲) ابن خطل کی دولونڈیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہہ کر لوگوں میں مشہور کیا کرتی تھیں۔ (ایضاً جلد 2 صفحہ 314) ایک نے معافی حاصل کرنی کو قتل کر دیا گیا۔

(۴) عکرمہ بن ابی جہیل۔ اپنے باپ کی زندگی میں اور اس کے بعد مسلمانوں سے لڑتا رہا۔ فتح مکہ کے وقت مسلمانوں پر حملہ کیا۔ فتح مکہ کے بعد اطاعت اختیار نہ کی بلکہ بھاگ گیا۔ اس کی بیوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے لئے معافی حاصل کی۔ (۵) حویرث بن نقید۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت ہجو کیا کرتا تھا اور اشعار بناتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو لڑکیوں فاطمہ اور ام کلثوم کو حضرت عباسؓ اپنے ساتھ مدینہ لے جا رہے تھے۔ حویرث بن نقید نے اونٹ کو نیزہ مار کر لڑکیوں کو نیچے گرا دیا۔ ہبار بن الاسود جس نے حضرت زینبؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ کو نیزہ مار کر حضرت زینبؓ کو زمین پر گرایا اس کے ساتھ یہ بھی شریک تھا۔ حویرث کو قتل کیا گیا۔

(شرح زرقانی علی مواہب اللدنیہ جلد 2 صفحہ 315)

(۶) مقیس بن صبابہ۔ یہ شخص ایک انصاری کو قتل کر کے بھاگ آیا تھا اور مرتد ہو گیا تھا۔ اس کو قتل کیا گیا۔

(۷) ہبار بن الاسود۔ اس نے حضرت زینبؓ کو ہجرت کے وقت اونٹ سے ایک چٹان پر گرایا جس کی وجہ سے ان کا اسقاط ہو گیا۔ اس کو بعد میں معاف کر دیا گیا۔ (۸) کعب بن زہیر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اشعار میں ہجو کرتا تھا۔ اس کو بعد میں معافی دے دی گئی۔

(۹) ہندہ بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان۔ جس نے حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا۔ کلیجہ

نکال کر دانتوں میں چبایا اور ان کے بدن کے ٹکڑوں کے ہار بنا کر بازوؤں اور پاؤں پر پہنے۔ اس کو بھی بعد میں معافی دے دی گئی۔

(۱۰) وحشی بن حرب۔ ہندہ بنت عتبہ کا غلام۔ اس نے ہندہ کے کہنے پر حضرت حمزہؓ کو شہید کیا۔ اس کو بھی معافی دے دی گئی۔

مندرجہ بالا فہرست سے ناظرین دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارتداد کے لئے قتل کا حکم دیا۔ اس فہرست میں دو مرتد بھی شامل ہیں مگر ارتداد کے جرم کی وجہ سے ان کی نسبت قتل کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ ان کے دوسرے جرموں کی وجہ سے۔ اور یہ سب مفسد لوگ تھے۔ بعض ان میں سے قاتل تھے۔ بعض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت عناد رکھنے والے اور لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہجو آمیز شعروں کے ذریعہ اکسانے والے تھے۔ یہ سب لوگ اپنے رویہ سے واجب القتل تھے۔ مگر پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال رحم دلی سے اکثر کو معاف کر دیا۔ صرف چار کو قتل کیا جن میں سے دو قاتل تھے۔ تیسری ایک مفسدہ عورت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہجو کے شعر کہہ کر لوگوں کو اکساتی تھی۔ چوتھا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرنے والا۔ لوگوں میں شر پھیلانے والا اور مفسد تھا۔ اور اس نے دو دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکیوں کو ہجرت کے وقت اونٹ سے گرانے کا ارتکاب کیا۔ ان چاروں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور مختلف موقعوں پر صحابہؓ کے ہاتھوں سے قتل کئے گئے۔ اگر ان کو بھی معافی مانگنے کا موقع مل جاتا تو ممکن تھا کہ اگر سب کو نہیں تو کم از کم بعض کو ان میں سے اسی طرح معافی مل جاتی جس طرح کہ ان کے باقی ساتھیوں کو مل گئی تھی۔

دو آدمیوں کی نسبت لکھا ہے کہ ام ہانی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر عرض کی کہ میں نے ان کو پناہ دی ہے مگر علیؓ ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ

جس کو امّ ہانی نے پناہ دی میں بھی اس کو پناہ دیتا ہوں۔ پس چار ہی بد قسمت تھے جو اس موقع پر قتل کئے گئے اور کسی کو ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا۔

پانچواں ثبوت۔ اس امر کا پانچواں ثبوت کہ اسلام میں محض ارتداد کیلئے کوئی شرعی حد مقرر نہیں کی گئی، خود وہ روایات ہیں جن کو قتل مرتد کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان تمام روایات پر جب یکجائی طور پر نظر کی جاتی ہے تو ان سے بھی یہی امر ثابت ہوتا ہے کہ محض ارتداد کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی فرد واحد کو بھی قتل تو الگ رہا کوئی اور سزا بھی نہیں دی۔ اب میں ذیل میں ان روایات کو نقل کرتا ہوں۔ جن کو قتل مرتد کی حمایت کرنے والے مولوی صاحب نے پیش کیا ہے۔

(۱) ”عن ابی قلابة عن انس قال قدم اناس من عكل او عربنة فاجتووا المدينة فامرهم النبي صلعم بلقاح وان يشربوا من ابوالها والبانها فانطلقوا فلما صحوا قتلوا راعی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واستاقوا النعم فجاء الخبر فی اول النهار فبعث فی اثارهم فلما ارتفع النهار حی بهم فقطع ایدیهم وارجلهم وسمرت اعینهم والقوا فی الحرّة“.

(بخاری۔ ترمذی۔ کتاب الطہارۃ۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ کتاب الحجارة۔ بتقارب الالفاظ)

(۲) ”حدثنا ابو النعمان محمد بن الفضل حدثنا حماد بن زید عن ایوب عن عكرمة قال أتى علی بن زنادقة فاحرقهم فبلغ ذلك ابن عباس فقال لو كنت انا لم احرقهم لنهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ”لا تعدبوا بعذاب الله“ ولقتلتهم لقول رسول الله صلى الله عليه وسلم ”من بدل دينه فاقتلوه“.

(بخاری جلد 4۔ کتاب استتابة المرتدين)

(۳) ”مالک عن زید بن اسلم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال، ”من غیر دینہ فاضربوا عنقه“ (موطا)

(۴) عن ابن عمر ان عثمان قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول لا یحلّ دم امرئ مسلم الا باحدی ثلاث - رجل زنی بعد احصانه فعليه الرّجم او قتل عمدًا فعليه القود أو ارتدّ بعد اسلامه فعليه القتل“ (نسائی) نسائی کی ایک روایت میں ہے ”کفر بعد اسلامہ“

(۵) ”عن مسروق عن عبد اللہ (ابن مسعود) قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحلّ دم رجل مسلم یشہد ان لا اله الا اللہ وانّی رسول اللہ الا باحدی ثلاث - الثیب الزانی والنفس بالنفس والتارک لدینہ المفارق للجماعة“ (ابوداؤد مسلم - ترمذی - ابن ماجہ)

ایک روایت میں ہے ”والمارق لدینہ الفارق للجماعة“

(۶) ”من خالف دینہ دین الاسلام فاضربوا عنقه“ (طبرانی)

یہ وہ احادیث ہیں جن کو حامیان قتل مرتد نے پیش کیا ہے۔ ان میں سے بعض احادیث دوسرے الفاظ کے ساتھ بھی آتی ہیں مگر چونکہ ان دوسری احادیث سے پیش کردہ احادیث پر روشنی پڑتی تھی اور ان کے صحیح معنی سمجھنے میں مدد ملتی تھی اس لئے ان احادیث کا نقل کرنا خلاف مصلحت سمجھ کر ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس بحث میں ان کا پیش کرنا ضروری ہے اس لئے میں ان کو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) ”عن عائشة قالت، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحلّ دم امرئ مسلم یشہد ان لا اله الا اللہ وانّ محمدًا رسول اللہ الا فی احدی ثلاث، رجل زنی بعد احسان فانہ یرجم، ورجل خرج محاربًا اللہ ورسوله، فانہ یقتل او یصلب او ینفی او یقتل نفسًا فیقتل بها“

(ابوداؤد۔ کتاب الحدود۔ باب الحکم فی من ارتدّ)

(۲) ”عن عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا يحل دم امرئ مسلم الا باحْدَى ثلث خصالٍ زان محصن، يرجم او رجل قتل رجلا متعمداً فيقتل او رجل يخرج من الاسلام فيحارب الله عزوجل ورسوله فيقتل او يصلب او ينفى من الارض“.

(نسائی . كتاب المحاربة . باب الصلب)

(۳) ”حدثنى ابو قلابة (فى حديث طويل) فوالله ما قتل رسول الله صلى الله عليه وسلم احداً قطُّ الا فى احدى ثلاث خصال - رجل قتل بجريرة نفسه فقتل او رجل زنى بعد احصان او رجل حارب الله ورسوله وارتد من الاسلام“.

(بخارى . كتاب الديات . باب القسامة)

(۴) ”حدثنى سلمان ابو رجاء مولى ابى قلابة عن ابى قلابة... فقال (عمر بن عبدالعزيز) ما تقول يا عبد الله بن زيد قلت ما علمت نفسا حل قتلها فى الاسلام الا رجل زنى بعد احصان او قتل نفسا بغير نفس او حارب الله ورسوله صلى الله عليه وسلم“.

(صحيح بخارى . كتاب التفسير . باب انما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله الآية)

جو احاديث او پر نقل کی گئی ہیں ان میں سے ایک فعلی حدیث ہے جس میں ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے۔ ایک حدیث ایسی ہے جس میں ایک صحابی قسم کھا کر بیان کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین قسم کے لوگوں کو قتل کروایا ہے۔ اس کے سوا کسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل نہیں کیا گیا۔ ایک اور حدیث میں بھی اسی مضمون کی شہادت ہے۔ باقی قولی احادیث ہیں۔

اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی احکام کو صرف زبانی طور پر ہی بیان نہیں فرمایا بلکہ شریعت اسلامی کے تمام حدود کو خود عملی طور پر نافذ بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے حالات پیدا کر دئے جبکہ ان شرعی احکام اور حدود کے جاری کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرح آپؐ نے نہ صرف شرعی حدود کا زبانی طور پر اعلان کیا بلکہ عملاً ان کو جاری کر کے بھی دکھا دیا۔ اور اس طرح دونوں پہلوؤں سے یعنی قولی و عملی طور پر آپؐ نے شریعت کی تکمیل فرمادی۔ اب ہمارے لئے یہ نہایت خوشی کا مقام ہے کہ موجودہ بحث میں مخالفین کی طرف سے صرف قولی روایات ہی نقل نہیں کی گئیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو بھی اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے جبکہ مرتدین کو قتل کرنے کا موقع پیش آیا اور یہی واقعہ ہمارے درمیان اور فریق ثانی کے درمیان اس بحث کا فیصلہ کر دے گا۔ مخالفین کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام میں ارتداد اور تنہا ارتداد کی شرعی سزا مقرر کی گئی ہے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ ارتداد کی سزا صرف جہنم ہے۔ محض ارتداد کے لئے اس دنیا میں شریعت اسلام نے کوئی سزا مقرر نہیں کی۔ آؤ اب ہم اسی مثال کو دیکھیں جس کو قتل مرتد کے حامیوں نے اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عملی مثال سے مخالفین کا دعویٰ ثابت ہو جائے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ان کے اس دعویٰ کو ثابت کر دے کہ شریعت اسلام میں محض ارتداد اور تنہا ارتداد کی سزا قتل مقرر کی گئی ہے تو ہم اس غلطی کا اقرار کر لیں گے لیکن اگر اس مثال سے جس کو انہوں نے خود اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کیا ہے ہمارے ہی دعویٰ کی تائید ہوئی کہ ارتداد اور تنہا ارتداد کے لئے شریعت اسلام میں کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی اور کبھی کسی مرتد کو قتل کیا گیا تو ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے کسی دوسرے جرم کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ تو پھر حاکم میان قتل مرتد پر واجب اور لازم ہو گا کہ وہ بھی اپنی غلطی کا اقرار

کریں اور اس بات کا اعلان کریں کہ اسلام میں محض ارتداد کے لئے قتل کی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی ایک بھی ایسا ثابت شدہ واقعہ نہیں جبکہ کسی مرتد کو محض ارتداد کے لئے قتل کی یا اور کسی قسم کی سزا دی گئی ہو بلکہ اگر کسی مرتد کو سزا دی گئی تو وہ اس کے ارتداد کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس کے دوسرے جرموں کی وجہ سے تھی۔ جس واقعہ کو قتل مرتد کے دعویداروں نے اپنی حمایت میں پیش کیا ہے وہ صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں موجود ہے اور وہ اس حدیث میں مذکور ہے جو مندرجہ بالا فہرست میں نمبر (۱) میں دی گئی ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

”ابی قلابہؓ انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ عکل یا عریہ قبیلہ کے کچھ آدمی آئے۔ مدینہ کی آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ شیردار اونٹنیوں میں جا کر رہیں اور ان کا دودھ اور پیشاب پیئیں۔ وہ اونٹنیوں میں جا کر رہنے لگے۔ جب وہ تندرست ہو گئے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹ ہانک کر لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دن کے ابتدائی حصہ میں اس واقعہ کی خبر پہنچی۔ آپ نے ان کے پیچھے آدمی بھیجے اور جب سورج اونچا ہو گیا ان کو پکڑ کر لے آئے۔ آپ نے ان کے ہاتھ اور پاؤں کٹوا دئے اور ان کی آنکھوں میں گرم لوہے کی سلائی پھیری گئی اور ان کو پتھر ملی زمین میں پھینک دیا گیا۔“

اب میں ناظرین کے آگے اس حدیث کے الفاظ رکھتا ہوں اور انہی سے انصاف چاہتا ہوں۔ وہ اس حدیث کے الفاظ کو پڑھیں اور بتائیں کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر ہے کیا ان سے صرف ارتداد کا جرم سرزد ہوا تھا یا انہوں نے کچھ اور بھی کیا تھا؟ وہ بار بار اس حدیث کو پڑھیں اور مجھے بتائیں کہ ان کو کیوں سزا دی گئی؟ حدیث ہمیں کیا بتلاتی ہے؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے اس لئے آدمی دوڑائے تھے کہ وہ اسلام سے

منحرف ہو گئے تھے اور اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ ان کو پکڑ کر ارتداد کی عبرتناک سزا دی جائے تا آئندہ کوئی شخص اسلام قبول کرنے کے بعد ارتداد کا خیال نہ کرے؟ یا اس لئے ان کے پیچھے آدمی بھیجے تھے کہ انہوں نے ایسی شرارت کی کہ اس کو سُن کر بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ بیمار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر احسان کیا۔ شیردار اونٹنیاں دیں کہ وہ ان کا دودھ پیئیں مگر وہ ایسے خبیث باطن اور بدمعاش تھے کہ انہوں نے اس احسان کا یہ بدلہ دیا کہ جب تندرست ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آدمیوں کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو لے کر بھاگ گئے۔ میں نہیں سمجھ سکتا اس سے بدتر کیا شرارت ہو سکتی ہے؟ حیوانوں پر بھی احسان کا اثر ہوتا ہے۔ بھیڑیوں اور درندوں پر بھی احسان کرو وہ بھی احسان کا احساس رکھتے ہیں کتے بھی اپنے محسن کے لئے جان قربان کر دیتے ہیں۔ جنگل کے درندے اور ہوا کے پرندے بھی احسان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ جن کا حدیث مذکورہ بالا میں ذکر ہے انسانیت کے تمام احساسات سے ہی خالی نہ تھے بلکہ درندوں سے بھی بدتر ثابت ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف ایک انسان کو قتل کیا اور ڈاکہ مارا بلکہ اپنے محسن کا کھلم کھلا مقابلہ کیا اور حاربوا اللہ ورسولہ کا اپنے تئیں مصداق ثابت کیا۔ اس لئے وہ اس قابل تھے کہ ان کو حسب فوائے آیت کریمہ

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَلِكَ لَهُمْ جِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ

(المائدة: 34)

یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور فساد کی غرض سے ملک میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں ان کی مناسب سزا یہی ہے کہ ان میں سے ایک ایک کو قتل کیا جائے یا صلیب پر لٹکا کر مارا جائے یا ان کے ہاتھ اور ان

کے پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں ملک سے نکال دیا جائے۔ اگر یہ سزا ملتی تو ان کے لئے دنیا میں رسوائی کا موجب ہوتی اور آخرت میں بھی ان کے لئے بہت بڑا عذاب مقدر ہے۔

قتل کی سزا ایک عبرتناک رنگ میں دی جاتی۔ مگر حامیانِ قتل مرتد کی رائے ہے کہ ان کا فعل اس قابل نہ تھا کہ ان کو ایسی سخت سزا دی جاتی۔ ان کو ایسی عبرتناک سزا دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسلام لا کر پھر مرتد ہو گئے تھے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر سخت غصہ آیا۔

واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ عکل کے لوگوں کو یہ سخت سزا اس لئے نہیں دی گئی تھی کہ انہوں نے ارتداد اختیار کیا تھا بلکہ اس سختی کی اصل وجہ ان کے جرائم کی وحشیانہ کیفیت تھی۔ مگر حامیانِ قتل مرتد اس سختی کو ان کے ارتداد کی طرف منسوب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تنگ طرف اور تنگ خیال مُلا کی شکل میں پیش کرتے ہیں کہ آپ (نعوذ باللہ) اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی شخص آپ کے مذہب کو ایک دفعہ قبول کر کے پھر اس کو ترک کر دے۔ اس وجہ سے آپ کا غضب عکل کے لوگوں کے خلاف بھڑکا اور آپ نے سادہ قتل پر اکتفا نہ کیا بلکہ سخت عذاب دے کر ان کو مارا اور سخت عذاب دینے کی اصل وجہ ان کا ارتداد ہی تھا۔

افسوس ہے ان لوگوں پر کہ کس طرح یہ لوگ اپنے نفسانی جذبات کی پیروی کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قابلِ اعتراض پیرایہ میں پیش کرنے سے باز نہیں آتے۔ جس وحشیانہ رنگ میں عکل کے لوگوں نے ان جرائم کا ارتکاب کیا وہ ہر ایک انصاف پسند انسان کے نزدیک ان کو اس عبرتناک سزا کا مستحق بنانے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے اور اس امر کی ہرگز ضرورت نہیں کہ ان کی سختی کو ان کے ارتداد کی طرف منسوب کیا جائے۔ لیکن اگر حامیانِ قتل مرتد کو اس سے تسلی نہیں ہوتی تو میں عکل کے

لوگوں کے متعلق کچھ مزید جواب ذیل میں درج کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان حوالجات کے بعد لوگوں کو شفی ہو جائے گی۔

(۱) ابو داؤد میں آیا ہے کہ انہوں نے صرف ایک چرواہے کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ وہ چرواہے کئی تھے جنہیں قتل کیا گیا۔

(۲) مسلم، ترمذی، نسائی اور دارقطنی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے۔

انما سَمَل النبي صلى الله عليه وسلم أعين أولئك لأنهم سَمَلوا أعين الرعاة. یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی آنکھوں میں اس لئے گرم لوہے کی سلائیاں پھروائی تھی کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہوں سے یہی سلوک کیا تھا اور ان کی آنکھوں میں گرم لوہے کی سلائیاں پھیری تھیں۔

(۳) ابو داؤد کے حاشیہ پر بحوالہ لمعات لکھا ہے۔

انما فعل صلعم قصاصاً لأنهم كذالك فعلوا بالرعاة فانه قد روى انهم سملوا أعين الرعاة وقطعوا أيديهم وارجلهم وغرزوا الشوك في ألسنتهم وأعينهم حتى ماتوا.

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ان سے سلوک کیا وہ قصاص کے طور پر کیا کیونکہ یہ روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری تھیں، ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو کاٹا تھا اور ان کی زبانوں اور آنکھوں میں کانٹے گاڑے تھے یہاں تک کہ وہ اس عذاب کو سہتے سہتے مر گئے۔

(۴) روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۱۲۸ پر لکھا ہے۔

”وقيل هم العرنيون الذين اغاروا على السرح واخذوا يسارا راعي رسول الله صلى الله عليه وسلم ومثلوا به فقطعوا يديه ورجليه وغرزوا الشوك في لسانه وعينه حتى مات“۔

کہا گیا ہے کہ وہ عربی لوگ تھے جنہوں نے چرنے والے اونٹوں پر ڈاکہ مارا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہے یسار کو پکڑا اور قتل کرنے سے پہلے اس کا مثلہ کیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ ڈالے اور اس کی زبان میں اور اس کی دونوں آنکھوں میں کانٹے گاڑے یہاں تک کہ وہ اس تکلیف کی وجہ سے مر گیا۔

ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے چار فعل سرزد ہوئے۔ (۱) قطع ایدی۔ (۲) قطع رجل۔ (۳) سمل اعین۔ (۴) غزاشوک۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سزا دیتے وقت تین سزائیں دیں یعنی ہاتھوں کا کاٹنا۔ پاؤں کا کاٹنا۔ آنکھوں میں سلائی پھیرنا۔ ان کے چوتھے فعل کی سزا نہیں دی گئی یعنی ان کی زبانوں میں کانٹے نہیں گاڑے گئے۔ تعجب ہے کہ حامیانِ قتل مرتد کھڑے تو اس لئے ہوئے تھے کہ ثابت کریں کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے لیکن ثبوت میں ایسے لوگوں کی مثال پیش کی جنہوں نے ایک جرم کا نہیں بلکہ کئی جرموں کا ارتکاب کیا اور ارتکاب بھی نہایت ہی وحشیانہ طور پر۔ کسی روایت میں یہ درج نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ ان کو ارتداد کی وجہ سے سزا دی جاتی ہے۔ نہ حضرت انسؓ جو اس واقعہ کے راوی ہیں بیان کرتے ہیں کہ ان کو ارتداد کی وجہ سے سزا دی گئی یا اس سزا میں ان کے ارتداد کا کچھ دخل تھا۔ بلکہ روایت سے ظاہر ہے کہ ان کو ان کے وحشیانہ جرائم کی سزا دی گئی۔ تاریخ واقعہ سے تو ہمارا دعویٰ ثابت ہوتا ہے نہ کہ حامیانِ قتل مرتد کا۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی فرد کو بھی محض ارتداد کی وجہ سے کوئی سزا نہیں دی۔ اگر دی ہے تو ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ دیگر وجوہات سے۔ اور جو واقعہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے اس سے ہمارے ہی دعویٰ کی تائید ہوتی ہے نہ کہ حامیانِ قتل مرتد کی۔ کیونکہ یہاں جن لوگوں کو قتل کیا گیا ان کے وہ جرائم صراحت کے ساتھ مذکور ہیں جن کی وجہ سے ان کو سزا دی گئی۔ پس یہ واقعہ ہماری تائید میں ہے نہ حامیانِ قتل مرتد کی تائید میں۔

دوسرا تاریخی واقعہ جو قتل مرتد کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے وہ ابن نخل کا واقعہ ہے جس کو فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل کیا گیا۔ افسوس کہ صرف مرتد کا لفظ دیکھ لیا جاتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ آیا وہ صرف ارتداد کا ہی مرتکب ہوا تھا یا کوئی اور جرم بھی اس سے سرزد ہوا تھا۔ اسی ابن نخل کی نسبت مواہب اللدنیہ میں لکھا ہے۔

”وَأَمَّا امر بقتل ابن خطل لأنه كان مسلماً فبعثه صلى الله عليه وسلم مصدقاً وبعث معه رجل من الانصار و كان معه مولى يخدمه و كان مسلماً فنزل منزلاً فامر المولى ان يذبح تيساً و يضع له طعاماً و نام فاستيقظ و لم يصنع له شيئاً فعدا عليه فقتله ثم ارتد مشرکاً و كانت له فتيتان تغنيان بهجاء رسول الله صلى الله عليه وسلم.“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن نخل کے قتل کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ مسلمان تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے بھیجا اور اس کے ساتھ ایک انصاری کو بھی بھیجا گیا اور اس کے ساتھ ایک آزاد شدہ غلام تھا جو اس کی خدمت کرتا تھا اور وہ مسلمان تھا۔ وہ ایک منزل پر اتر اور غلام کو حکم دیا کہ ایک بکرا ذبح کرے اور اس کے لئے کھانا تیار کرے۔ یہ کہہ کر سو گیا۔ جب جاگا تو ابھی تک غلام نے کوئی کام نہیں کیا تھا پس اس نے اس پر حملہ کیا اور اس کو قتل کر دیا اور پھر مرتد ہو کر مشرک ہو گیا۔ اور اس کے پاس دو لوٹڈیاں تھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کے شعر گایا کرتی تھیں۔ یہ ہیں حالات ابن نخل کے۔ اب مولوی صاحبان خود ہی فرمادیں کہ کیا اس کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے؟ اس واقعہ نے تو ہمارے ہی دعویٰ کی تصدیق کی ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے اور یہ کہ اگر کسی مرتد کو قتل کیا گیا تو اسے ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے دوسرے جرموں کی وجہ سے۔

تیسرا تاریخی واقعہ جس کو قتل مرتد کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے وہ مقیس بن صباہ کا واقعہ ہے جس کو فتح مکہ کے موقع پر قتل کیا گیا اس کی نسبت زرقانی مواہب اللدنیہ کی شرح میں لکھتا ہے۔

”کان أسلم ثم اتى على انصاريّ فقتله و كان الأنصاري قتل اخاه هشاماً خطأ في غزوة ذي قرد ظنّه من العدوّ فجاء مقيس فأخذ الدية ثم قتل الانصاريّ ثم ارتدّ ورجع الي قريش“.

یہ مسلمان ہو پھر جا کر ایک انصاری کو قتل کر دیا اس انصاری نے غلطی سے اس کے بھائی ہشام کو غزوہ ذی قرد میں دشمن سمجھ کر قتل کر دیا تھا۔ مقیس نے پہلے دیت لے لی اس کے بعد اس کو قتل کر دیا پھر مرتد ہو کر قریش کے ساتھ جا کر شامل ہو گیا۔ اب حامیان قتل مرتد خود ہی انصاف کے ساتھ فیصلہ فرماویں کہ اگر بالفرض یہ شخص مرتد نہ ہوتا تو کیا اس کو چھوڑ دیا جاتا؟ کیا اس کا جرم اس قابل نہ تھا کہ اس کو قتل کی سزا دی جاتی؟ ایک صحابی نے غلطی سے اس کے بھائی کو ایک لڑائی میں دشمن سمجھ کر قتل کر دیا اور اس کا خون بہا ادا کر دیا مگر اس نے دیت لینے کے بعد پھر اس صحابی کو قتل کر دیا جیسا کہ زمانہ ہڈا میں ریاست کا بے نے پہلے اپنے مقتول سپاہی کے عوض میں سلطنت اٹلی سے دیت لے لی پھر دیت لینے کے بعد سلطنت اٹلی کے آدمی کو قتل بھی کر دیا چنانچہ اپنے اس فعل کی پاداش ان کو بھگتنی پڑی۔ غرض مقیس بن صباہ کے واقعہ سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے بلکہ اس سے ہمارے ہی دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی اور جن مرتدین کو قتل کیا گیا ان کو ارتداد کی سزا میں قتل نہیں کیا گیا بلکہ ان کے دیگر جرائم کی وجہ سے ان کو قتل کی سزا دی گئی۔ عکلیٰ یا عرینے کے لوگوں اور ابن نطل اور مقیس ابن صباہ کے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ارتداد کی وجہ ان کے اپنے جرائم تھے۔ وہ ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے جن کی یقینی سزا قتل تھی اس لئے ان جرائم

کے ارتکاب کے بعد وہ دشمنوں سے جا ملے۔ یہی ان کا ارتداد تھا انہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا اور اس کے بعد مسلمانوں کے دشمنوں میں جا کر شامل ہو گئے یا شامل ہونے کی کوشش کی۔ ان کے اس فعل کا نام مؤرخین نے ارتداد رکھا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اگر ارتداد اسی چیز کا نام ہے تو ہمیں اس امر سے ذرا بھی اختلاف نہیں کہ ایسے مرتد کی سزا بے شک قتل ہے۔ ایک شخص پہلے مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہے وہاں قتل کا جرم کر کے وہ دشمن کے لشکر کی طرف بھاگتا ہے اور آئندہ وہ ہر موقع پر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے اور موقع پا کر مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے تیار ہے اور مسلمانوں کا کھلم کھلا دشمن ہے ایسا مرتد بے شک قابل ہے کہ اس کو قتل کیا جاوے لیکن اگر یہ کہا جاوے کہ ایک شخص شیطانی وسوسوں کا شکار ہو کر اسلام سے منحرف ہوتا ہے اور کوئی اور دین اپنے لئے اختیار کرتا ہے مگر اختلاف رائے سے بڑھ کر اس کو اسلام کے ساتھ کوئی مخالفت نہیں ایسے مرتد کی سزا بھی اسلام میں قتل مقرر کی گئی ہے تو ہم ایسے عقیدہ کی بڑے زور کے ساتھ مخالفت کریں گے کیونکہ یہ عقیدہ سراسر باطل اور جھوٹ ہے اور اسلام کے پاک دین کو بدنام کرنے والا ہے اور ہم ڈنکے کی چوٹ کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ارتداد اور تنہا ارتداد کے لئے کسی کو قتل کی سزا دی ہو۔ اس باطل عقیدہ کے حامی بے شک ایڑیوں تک زور لگائیں وہ اسلامی تاریخ سے ایک بھی ایسا ثابت شدہ واقعہ پیش نہیں کر سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو محض اس لئے قتل کی سزا دی کہ وہ شیطانی وسوسوں کا شکار ہو کر اسلام سے مرتد ہو گیا اور اختلاف رائے سے بڑھ کر اس کو اسلام کے ساتھ کوئی مخالفت نہیں تھی۔ حامیانِ قتلِ مرتد اپنے تمام اعوان و اکابر کے ساتھ مل کر جس قدر چاہیں تاریخ اسلام کے اوراق کی ورق گردانی کریں ان کو ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی جس سے یہ امر قطعی اور حتمی طور پر پایہ ثبوت تک پہنچ جائے کہ آپ نے کبھی کسی ایسے شخص کو قتل کرایا جس سے سادہ ارتداد کے سوا اور کوئی شر نہ سرزد

ہوا اور نہ اس سے متوقع تھا۔ اس تلاش میں ان کو ایسی مثالیں تو ضرور ملیں گی جب کہ آپؐ نے مرتدین کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ان سے کسی قسم کا تعارض نہ کیا۔ اور ایسے مرتدین کی مثالیں بھی ان کو ملیں گی جبکہ آپؐ نے بعض مرتدین کو قتل کرایا مگر نہ ان کے ارتداد کی وجہ سے بلکہ ان کے دوسرے جرائم کی وجہ سے لیکن ان کو ایک بھی ایسی مثال نہ ملے گی جس سے یقینی طور پر یہ ثابت ہو کہ آپؐ نے کسی ایک فرد واحد کو بھی اس لئے قتل کی سزا دی ہو کہ اس نے محض ارتداد کا ارتکاب کیا اور اس کے وجود سے اور کسی قسم کا خطرہ اسلام کو اور مسلمانوں کو نہیں تھا۔ یہ میری طرف سے ایک چیلنج ہے اگر حامیان قتل مرتد میں طاقت ہے تو اٹھیں اور میرے اس چیلنج کو قبول کریں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر وہ کیوں اپنے خیالات باطلہ کی بناء پر اسلام جیسے پاکیزہ دین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مبارک وجود کو بدنام کر رہے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت گیارہ بارہ آدمیوں کے قتل کا حکم دیا جن میں سے تین مرتد تھے لیکن ان کے قتل کے حکم کی یہ وجہ نہ تھی کہ وہ مرتد تھے بلکہ اس حکم کی وجہ ان کی دوسری شرارتیں تھیں۔ ان مرتدین اور ایک چوتھے شخص جویرث کے قتل کے حکم کا ذکر کرتے ہوئے زرقانی لکھتا ہے۔

”خصّہم بالذکر لشدة ما وقع منهم اذی الاسلام واهله“

(صفحہ 321 جلد 2)

یعنی (جیسا کہ ایک روایت میں ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چار شخصوں کا خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ ان کی طرف سے اسلام کو اور مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچی تھی۔ پس معلوم ہوا کہ جب دوسروں کے ساتھ ان تین مرتدین کے قتل کا حکم دیا گیا تو اس کی وجہ ان کا ارتداد نہ تھا بلکہ اس حکم کی یہ وجہ تھی کہ ان کی طرف سے اسلام کو اور مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ بہت تکلیف اور دکھ پہنچ چکا تھا۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ وہم ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سرح کو اس لئے معاف کیا کہ وہ تائب ہو کر دوبارہ اسلام میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ مگر یہ عذر بالکل غلط ہے کیونکہ اول تو آپؐ نے ان تینوں میں سے کسی کو یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ تائب ہو کر اپنی جان بچالے۔ اگر آپؐ ایسا موقع دیتے تو یقیناً تینوں بڑی خوشی سے ایسے موقع سے فائدہ اٹھاتے۔ پس آپؐ کا ان کے متعلق قطعی حکم نافذ کرنا استتابہ کی طرف رجوع نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ ارتداد ان کا جرم نہ تھا بلکہ جیسا کہ زرقانی نے لکھا ہے ان کا جرم یہ تھا کہ ان تینوں نے بھی اسلام کو اور اہل اسلام کو اسی طرح تکلیف اور دکھ دیا تھا جیسا کہ حویرث نے جس کو آپؐ نے ان کے ساتھ شامل کیا۔ دوسری اگر آپؐ نے اس کی توبہ کی وجہ سے معاف کیا تھا تو پھر آپؐ معافی دینے سے پہلے بہت دیر تک کیوں خاموش رہے؟ اور آپؐ کیوں اس امر کا انتظار فرماتے رہے کہ آپؐ کے صحابہؓ میں سے کوئی شخص اٹھے اور اس کا سر تلوار سے کاٹ دے؟ آپؐ کو چاہیے تھا کہ فوراً اس کو معاف کر دیتے۔ اور اگر کوئی صحابی اس کو قتل کرنے کیلئے اٹھتا تو اس پر سخت ناراض ہوتے (جیسا کہ ایسے موقعوں پر آپؐ ہمیشہ قتل کرنے والوں پر سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے) نہ یہ کہ خود انتظار فرماتے کہ کوئی صحابی اس کو قتل کر دے۔ آپؐ نے قتل کا حکم صرف ارتداد کی وجہ سے دیا تھا اور اُس سے اور کوئی شرط نہیں ہوئی تھی تو پھر تو چاہیے تھا کہ آپؐ اُس کے تائب ہونے پر فوراً اُس کو معاف کر دیتے اور اگر کوئی صحابی اسے قتل کرنا چاہتا بھی تو اُس پر سخت ناراض ہوتے نہ یہ کہ آپؐ بہت دیر تک خاموش رہتے اور اس امر کی انتظار میں رہتے کہ کوئی صحابی اُٹھے اور اسے قتل کر دے۔

اگر عبداللہ بن ابی سرح اور اُس کے ساتھیوں سے صرف ارتداد کا ہی ظہور ہوا تھا اور یوں وہ بالکل بے قصور تھے تو پھر تو چاہیے تھا کہ حسبِ قول حامیانِ قتلِ مرتد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو یہ حکم دیتے کہ ان کو توبہ کیلئے ترغیب دی جائے اور اسلام کی خوبیوں کی ان کو تلقین کی جائے اور ان کو بتایا جائے کہ اگر تم دوبارہ اسلام میں داخل نہیں ہو گے تو تمہیں قتل کیا

جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ بغیر کسی شرط کے اُن کے متعلق قتل کا حکم جاری کیا گیا۔ پس معلوم ہوا کہ ان کا جرم جس کی وجہ سے اُن کے متعلق ایسا حکم نافذ کیا گیا ارتداد نہ تھا بلکہ وہ اپنے دوسرے افعال اور رویہ کی وجہ سے مستوجب قتل ہو چکے تھے۔ اور عبداللہ بن ابی سرح کو اس لئے معاف نہیں کیا گیا کہ وہ تائب ہو کر آیا تھا بلکہ اس لئے کہ حضرت عثمانؓ نے اُس کو پناہ دی تھی اور اُس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی کی درخواست کی تھی۔ جیسا کہ لکھا ہے۔

فاستجار له عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فاجاره النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (روح المعانی جلد 4 صفحہ 484)

عبداللہ بن ابی سرح کی ایک شرارت کا روایات کی رو سے قرآن شریف میں بھی ذکر ہے۔ کیونکہ آیت سنا نزل مثل ما انزل اللہ کا شان نزول یہی عبداللہ بن ابی سرح بتایا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھتا تھا اور اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت اور حقارت کو ملک میں پھیلاتا تھا اور اسلامی حکومت کے خلاف ایچی ٹیشن کرتا تھا۔

حامیان قتل مرتد اس بات سے تو عاجز آگئے ہیں کہ کوئی ثابت شدہ تاریخی واقعہ ایسا پیش کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ارتداد کی وجہ سے کسی کو قتل کروایا۔ مگر مرتد کیا نہ کرتا۔ ڈوبنے والا انسان ایک تنکے پر بھی ہاتھ مارتا ہے کہ شائد اسی کے سہارے سے وہ غرق ہونے سے بچ جائے۔ چنانچہ موجودہ صورت میں بھی حامیان قتل مرتد نے بھی ایسا ہی اضطراب دکھایا ہے اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے جو چیز بھی سامنے آئی ہے اُس پر ہاتھ مارا ہے اور یہ نہیں دیکھا کہ وہ اس قابل ہے بھی یا نہیں کہ ان کے لئے کسی سہارے کا موجب ہو سکے۔ کسی مرد کے متعلق تو ان کو ضعیف سے ضعیف روایت بھی نہیں ملی جس میں یہ بیان کیا گیا ہو کہ محض ارتداد کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو قتل کی

سزادی۔ ایک دونا قابل اعتبار روایات کسی بے نام و نشان عورت کے متعلق حامیان قتل کو کہیں سے مل گئی ہیں اور انہی کو غنیمت سمجھا ہے اور بغیر چھان بین کے صرف رعب ڈالنے کے لئے ان کو پیش کر دیا ہے۔ وہ روایات یہ ہیں۔

اول: عن جابر قال ارتدت امرأة عن الاسلام فأمر النبي صلعم ان يعرضوا عليها الاسلام فان اسلمت والآ قتلت فعرض عليها الاسلام فأبت ان تسلم فقتلت.

دوم: عن عائشة قالت ارتدت امرأة يوم احد فأمر النبي صلعم ان تُستاب فان عادت والآ قتلت.

ان روایات کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ دونوں روایات ضعیف الاسناد ہیں۔

لان فی حدیث جابر عبداللہ بن اذینہ جرحہ ابن حبان وقال لایجوز الاحتجاج به بحال و قال الدار قطنی فی المؤتلف والمختلف متروک.

رواه ابن عدی فی کاملہ وقال عبداللہ بن اذینہ منکر الحدیث

(حاشیہ ہدایہ صفحہ 354)۔ مطبع نولکشور محشی بحاشیہ مولوی محمد حسن سنبلوی

وفی حدیث عائشۃ محمد بن عبد الملک الانصاری قال عبداللہ

بن احمد عن ابیہ انی قد رأیت هذا وکان اعمی یضع الحدیث

ویکذب وقال البخاری منکر الحدیث وقال النسائی متروک.

(حاشیہ ہدایہ جلد 2 صفحہ 355)

یعنی پہلی حدیث کے راویوں کے سلسلہ میں عبداللہ بن اذینہ ہے جس پر ابن حبان نے جرح کی ہے اور کہا ہے کہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں کہ ایسی حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کیا جائے جس کے راویوں کے سلسلہ میں عبداللہ بن اذینہ ہو اور دارقطنی نے اس کو الموتلف اور المختلف میں عبداللہ بن اذینہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ متروک ہے۔ ابن عدی نے

اپنی کتاب کامل میں اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے عبداللہ بن اذینہ منکر الحدیث ہے اور جو حدیث حضرت عائشہ کی طرف منسوب کر کے بیان کی گئی ہے اُس کے راویوں کے سلسلہ میں محمد بن عبد الملک انصاری ہے اور اس کے متعلق عبداللہ بن احمد نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ اُس نے کہا کہ میں نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ اندھا تھا اور حدیثیں خود گڑھا کرتا تھا اور جھوٹ بولا کرتا تھا اور بخاری نے اس کو منکر الحدیث قرار دیا ہے اور نسائی نے اس کو متروک کہا ہے۔ (حاشیہ ہدایہ جلد 2 صفحہ 355)

اب یہ حال ہے ان روایات کا جن کو قرآن شریف کی تعلیم کو رد کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی روایات کا پیش کرنا ہی ظاہر کرتا ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھ میں کوئی مضبوط چیز نہیں۔ اس لئے ایسے چھوٹے ہتھیاروں پر اتر آئے ہیں۔

اس کے مقابل میں بخاری کی حدیث کو دیکھو جس میں ایک صحابی قسم کھا کر کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (۱) محارب (۲) زاتی محسن (۳) قاتل نفس کے سوا کسی شخص کو قتل نہیں کروایا۔ یہ حدیث میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ پھر تعلق المغنی شرح دارقطنی صفحہ 339 میں لکھا ہے

ونقل ابن طلاع فى الأحكام أنه لم ينقل عن النبى صلعم انه قتل مرتدة۔

یعنی ابن طلاع نے احکام میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ مروی نہیں کہ آپ نے کبھی کسی مرتد عورت کو قتل کروایا ہو اور جن مردوں کی نسبت ایسا بیان کیا گیا ہے اُن کی نسبت میں ثابت کر چکا ہوں کہ ان کو انداد کے لئے نہیں بلکہ اُن کے دوسرے جرموں کی وجہ سے قتل کیا گیا۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ جابر کی ایک روایت میں اُس مرتد کا نام بھی بیان کیا گیا ہے کہ اُس کا نام امّ مروان تھا۔ اور اس امّ مروان کی نسبت مبسوط

جلد 10 صفحہ 110 میں لکھا ہے۔

فانّ امّ مروان كانت تقاتل وتحرض على القتال و كانت مطاعة فيهم.
یعنی امّ مروان مسلمانوں کے ساتھ جنگ کیا کرتی تھی اور دوسرے لوگوں کو جنگ کے لئے اُکسایا کرتی تھی اور وہ اپنی قوم کی لیڈر تھی۔ پس اگر ہم مان بھی لیں کہ امّ مروان کو قتل کیا گیا تو اُس کو ارتداد کیلئے قتل نہیں کیا گیا بلکہ اس لئے کہ وہ محاربہ تھی۔

اب ناظرین نے دیکھ لیا کہ قتل مرتد کے حامی تاریخ اسلام سے ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے جس میں یہ ثابت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مرتد مرد یا مرتدہ عورت کو محض ارتداد کے لئے قتل کیا ہو۔ بلکہ اگر کسی مرتد یا مرتدہ کو قتل کیا ہے تو اُس کو ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کیا بلکہ اس لئے قتل کیا کہ وہ محارب تھے۔ غرض اس میدان سے تو قتل مرتد کے حامی خائب و خاسر لوٹتے ہیں اور فتح کا جھنڈا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اب ہم دوسرے میدان میں اترتے ہیں یعنی قولی حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اس میدان میں بھی وہ ہماری اسی طرح (بلکہ اس سے بھی بڑھ کر) یاوری فرماوے جس طرح کہ اس وقت تک وہ اپنے فضل و رحم سے ہماری دستگیری فرماتا رہا ہے۔

قولی احادیث کے متعلق یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ہمارے مخالفوں نے اس مضمون کی تمام احادیث کو یکجائی طور پر نہیں لیا بلکہ صرف ایک حصہ نقل کیا ہے اور دوسرا حصہ نظر انداز کر دیا ہے اور اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ دوسری احادیث اُن کی نظر سے مخفی تھیں۔ بلکہ اس لئے کہ اُن کے نقل کرنے سے حقیقت منکشف ہو جاتی تھی اور حقیقت کا انکشاف اُن کا تمام تانا بانا دارہم برہم کر دیتا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ تصویر کا ایک رُخ ناظرین کو دکھائیں اور دوسرا رُخ اُن کی آنکھوں سے اوجھل کر دیں تاکہ وہ تصویر کا صحیح نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے نہ لاسکیں۔

قتل مرتد کے متعلق قولی احادیث کو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ ان تمام احادیث

میں جو جو الفاظ راویوں نے استعمال کئے ہیں ان کی فہرست میں ذیل میں درج کرتا ہوں
تاناظرین اُس ساری فہرست پر یکجائی نظر ڈال کر خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے کیسے مرتدین کے متعلق قتل کا حکم دیا۔ وہ فہرست یہ ہے۔

(۱) من بدل دینہ. (۲) من خالف دینہ دین الاسلام (۳) من غیر دینہ
(۴) ارتد عن الاسلام (۵) کفر بعد الاسلام (۶) المارق لدینہ الفارق
للجماعة (۷) رجل خرج محارباً لله ورسوله (۸) رجل يخرج من
الاسلام فيحارب الله عزوجل ورسوله (۹) رجل حارب الله
ورسوله وارتد عن الاسلام (۱۰) حارب الله ورسوله صلى الله
عليه وسلم (۱۱) التارک لدینہ المارق للجماعة.

مندرجہ بالا فہرست میں بعض احادیث میں تو صرف کفر بعد اسلام یا تبدیلی اسلام یا
تبدیلی دین یا ارتداد کا لفظ بیان کیا گیا ہے اور بعض میں ان الفاظ کے ساتھ مزید شرط
بڑھائی گئی ہے۔ کسی حدیث میں الفارق للجماعة کے الفاظ بڑھائے ہیں۔ کسی میں
حارب اللہ ورسولہ کے الفاظ بڑھائے ہیں۔ کسی میں صرف حارب اللہ ورسولہ
کے الفاظ ہیں اور صحیح بخاری کی حدیث ہے۔ کسی میں خالف دین الاسلام کے الفاظ
ہیں۔ مگر جب ہم حامیان قتل مرتد کی پیش کردہ فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا
ہے کہ انہوں نے نہایت احتیاط سے ان احادیث کو نظر انداز کر دیا ہے جن میں محاربہ کا ذکر ہے
حالانکہ یہ احادیث صحیح بخاری میں موجود ہیں اور ان کی نظر سے مخفی نہیں تھیں۔ ان کا ان احادیث
کو قطعاً نظر انداز کر دینا صاف ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے اس بحث میں دیانتداری سے کام نہیں
لیا۔ بلکہ ان احادیث کو اپنے مطلب کے مخالف ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا ہے۔

حامیان قتل مرتد کی اس دیانتداری کی طرف اشارہ کرنے کے بعد میں اب ان
احادیث کی طرف رجوع کرتا ہوں اور ناظرین کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ ان سب پر

یکجائی نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر ان سب احادیث میں صرف کفر بعد اسلام یا تبدیلی دین یا ارتداد کا ہی ذکر ہوتا اور کسی صحیح حدیث میں کوئی شرط نہ ہوتی مثلاً الفارق للجماعة کے الفاظ یا خالف دین الاسلام یا خرج محارباً للہ ورسولہ یا ینخرج من الاسلام فیحارب اللہ عزوجل ورسولہ یا حارب اللہ ورسولہ۔

اور حالات بھی اس قسم کے ہوتے کہ اُس زمانہ میں ایک شخص کا ارتداد صرف تبدیلی دین تک ہی محدود ہوتا اور اُس کے وجود سے اور کسی قسم کا خطرہ متوقع نہ ہو سکتا تب ہم اس بات کو تسلیم کر لیتے کہ بے شک ان احادیث سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ محض ارتداد کی سزا قتل ہے اور پھر اس حالت میں قرآن شریف کی کھلی کھلی تعلیم کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ دیکھتے کہ آیا قتل کا کوئی ایسا مفہوم ہو سکتا ہے جو قرآن شریف کی تعلیم کے مخالف نہ ہو۔ مگر یہاں تو صورت ہی دگرگوں ہے۔ اگر بعض احادیث میں محض ارتداد کا ذکر ہے تو اُس کے ساتھ دوسری احادیث میں جو صحیح بخاری اور دوسری کتب صحاح میں موجود ہیں اور اُن میں ارتداد کے ساتھ محاربہ کی شرط موجود ہے۔ کسی میں الفارق للجماعة یا المفسد للجماعة کے الفاظ ہیں۔ کسی میں خالف دین الاسلام کے الفاظ ہیں۔ کسی میں صرف حارب اللہ ورسولہ کے ہی الفاظ ہیں۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ اگر ایک امر کے متعلق دو قسم کی روایات ہوں بعض روایات میں قید ہو اور بعض میں قید کا ذکر نہ ہو تو ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کے فیصلہ کے لئے میں خود اپنی طرف سے کوئی قاعدہ پیش نہیں کرتا بلکہ وہی قاعدہ پیش کرتا ہوں جو علماء اسلام میں مسلم چلا آتا ہے۔ اس امر کے فیصلہ کے لئے اصول فقہ کا ایک مسلم قاعدہ ہے جو میں ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ نور الانوار میں لکھا ہے۔

وعندنا لا یحمل المطلق علی المقید وان کانا فی حادثة واحدة
لامکان العمل بهما الا ان یکونا فی حکم واحد مثل صوم فی قوله

تعالیٰ فمن لم يجد فصيام ثلاثة ايام فان قراءة العامة مطلقة و قراءة ابن مسعود رضی اللہ عنہ فصيام ثلاثة ايام متتابعات مقيدة بالتتابع والقراءتان بمنزلة الايتان في حق المعاملة فيجب ههنا ان تقيد قراءة العامة ايضا بالتتابع لان الحكم وهو الصوم لا يقبل وصفين متضادين فاذا ثبت تقيدہ بطل اطلاقہ .

(نور الانوار شرح المنار تحت كشف الاسرار شرح المصنف على المنار في الاصول جلد 1 صفحہ 378 مطبوعہ مصر)

ترجمہ: یہ کہ ہمارے نزدیک مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جاتا اگرچہ حادثہ ایک ہو۔ لیکن اگر حکم ایک ہو جیسا کہ قرآن کریم میں کفارہ یمین کے تین روزوں کا ذکر آیا کہ اس میں عام قراءت مطلق ہے جس کے ساتھ کوئی قید نہیں لگی ہوئی کہ وہ روزے یکے بعد دیگرے مسلسل ہوں۔ یا کہ درمیان میں وقفہ بھی آجانا جائز ہے۔ مگر حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں یکے بعد دیگرے مسلسل بغیر وقفہ کے ان روزوں کے رکھنے کا ذکر آیا ہے اس واسطے عام قراءت کو اس دوسری قراءت کے ساتھ جو حضرت عبداللہ بن مسعود کی ہے مقید کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ روزہ رکھنے کا یہ حکم ان دو متضاد صفتوں کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا کہ وہی تین روزے پئے درپے بلا وقفہ بھی رکھے جائیں اور وقفہ کرنا بھی اس میں جائز ہو۔

اب حامیان قتل مرتد اس مسلمہ اصول کو ان روایات پر چسپاں کر کے دیکھیں جو قتل مرتد کے بارے میں دو اہل حدیث میں موجود ہیں اور بتائیں کہ اس اصول کے رو سے ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔ کیا ان روایات کو لینا چاہیے جن میں کسی قید کا ذکر نہیں یا ان روایات کی پیروی کرنی چاہیے جن میں محاربہ کی شرط موجود ہے۔ پس ان احادیث سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ کیا یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہر ایک مرتد کے قتل کا حکم نہیں بلکہ صرف ایسے مرتد کا جو محارب بھی ہو۔ خالص سونا وہ ہوتا ہے جو کسوٹی پر پرکھنے سے خالص ثابت ہو۔ اس نتیجہ کو

بھی جس کسوٹی پر چا ہو پرکھ کر دیکھ لو یہ ہر رنگ میں صحیح اور درست ثابت ہوگا۔ اس نتیجہ کی صحت کی پہلی کسوٹی یہ ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بالکل مطابق ہے۔ تاریخ اسلام سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک مرتد کو قتل کی سزا نہیں دی بلکہ صرف ایسے مرتدین کو قتل کی سزا دی جو محارب تھے جیسے عکل یا عرینہ کے لوگ، ابن نطل، مقیس بن صبابہ۔ پس یہ نتیجہ اس لئے درست ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے عین مطابق ہے۔ اس نتیجہ کی صحت کی دوسری کسوٹی یہ ہے کہ یہ قرآن شریف کی عام تعلیم اور روح کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ جیسا میں مفصل طور پر ثابت کر چکا ہوں کسی شخص کو محض ارتداد کے لئے قتل کرنا قرآن شریف کی تمام تعلیم کے خلاف ہے۔ اس نتیجہ کی صحت کی تیسری کسوٹی یہ ہے کہ اگر مرتد کے قتل کے لئے محارب کی شرط کو لازم ٹھہرایا جائے تو یہ حکم قرآن شریف کی ایک صریح آیت کے ماتحت آجاتا ہے۔ جو اس کے صحیح ہونے کا ایک یقینی ثبوت ہے۔ اور ہمیں حامیان قتل مرتد کی طرح یہ نہیں کہنا پڑتا کہ قرآن شریف اس مسئلہ پر ساکت ہے اور وہ آیت جس سے مرتد کا محارب ہونے کی وجہ سے قتل ثابت ہوتا ہے یہ ہے۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا
 أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ

أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (المائدة: 34) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور فساد کی غرض سے ملک میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں۔ ان کی مناسب سزا یہی ہے کہ ان میں سے ایک ایک کو قتل کیا جائے یا صلیب پر لٹکا کر مارا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں۔ یا انہیں ملک سے نکال دیا جائے۔

اور یہ کہ قرآن شریف کے رو سے محارب کسے کہتے ہیں اس کے لئے ہمیں کسی لمبی بحث کی

ضرورت نہیں۔ قرآن شریف نے خود اس کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ ایک محارب کا ذکر کرتا ہے۔ اس مثال سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ محارب کا کیا مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضَرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِينًا بَيْنَ
الْمُؤْمِنِينَ وَارْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ
وَيَخْلُقْنَ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْاِحْسٰى (التوبة: 107)

اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد نقصان پہنچانے اور کفر کی تبلیغ کرنے اور مومنوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے بنائی ہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکا ہے اس کے لئے کمین گاہ مہیا کرنے کے لئے۔ وہ ضرور قسم کھائیں گے کہ اس مسجد کے بنانے سے ہمارا ارادہ صرف نیکی کرنا تھا۔

تاریخ سے ثابت ہے جس شخص کا آیت کریمہ میں ذکر ہے اور جس کو من حارب اللہ ورسولہ کا خطاب دیا گیا ہے وہ ابو عامر راہب تھا۔ درمنثور جلد ۳ صفحہ ۶۲۶ میں لکھا ہے۔
عن مجاہد فی قوله والذین اتخذوا مسجدًا قال المنافقون وفی
قوله وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ قال لابی عامر الراہب.
یہابی عامر راہب کیسا شخص تھا۔ اس کے لئے بحر محیط جلد 5 صفحہ 98 کی مندرجہ ذیل
عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

وحرصهم ابو عمرو والفسق علی بنائہ حین نزل الشام ہاربا من
وقعة حنین فراسلہم فی بنائہ وقال ابنوا لی مسجدا فانی ذاہب الی
قیصراتی بجند من الروم فاخرج محمداً و اصحابہ.
”ابو عمرو و فاسق جب حنین کی لڑائی کے بعد بھاگ کر شام گیا تو اُس نے مدینہ کے
منافقوں کو اس مسجد کے بنانے کی ترغیب دی اور اس کے متعلق اُن سے خط و کتابت کی

اور کہا کہ میرے لئے ایک مسجد بناؤ۔ میں قیصر کے پاس جاتا ہوں اور روم سے ایک لشکر لاکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کو نکال دوں گا۔“

پس ابو عامر کی مثال سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ محارب سے یہ مراد نہیں کہ ایک شخص اسلام کو ترک کر دے اور مسلمانوں سے کوئی سروکار نہ رکھے اور نہ کسی مسلمان کو اذیت پہنچائے بلکہ محارب سے مراد ایسا شخص ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جائے اور اُن کی تخریب کے درپے ہو۔ پس ایسا شخص قرآن شریف کے حکم مطابق تین سزاؤں میں سے ایک سزا کا مستحق ہے۔ اُسے قتل کیا جاوے یا صلیب دیا جاوے یا اُس ملک میں سے اُسے نکال دیا جاوے۔ حالات اور جرم کی کیفیت کے مطابق اُس کو سزا دی جاوے۔

حامیان قتل مرتد کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ نفس ارتداد ہی کا نام محاربہ ہے یعنی جو شخص اسلام لانے کے بعد پھر کفر اختیار کرتا ہے وہ خواہ کسی مسلمان کو اذیت نہ پہنچائے اور ایک بے ضرر انسان کی طرح زندگی بسر کرے پھر بھی وہ محارب ہی کہلائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر محض ارتداد یعنی اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرنا محاربہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ عام کفر کو محاربہ نہ کہا جاوے۔ مرتد بھی ارتداد کے بعد ایک کافر کی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور دونوں کفر کے لحاظ سے ایک ہی حالت میں ہو جاتے ہیں۔ پس اگر محض مرتد محارب ہے تو عام کافر بھی محارب ہے کیونکہ موجودہ صورت میں دونوں مساوی ہیں۔ دونوں کفر کی حالت میں ہیں اور دونوں مسلمانوں کو کسی قسم کی اذیت نہیں پہنچاتے بلکہ اُن کے ساتھ صلح کی حالت میں رہنا چاہتے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو اُس کے کفر کی وجہ سے قتل کیا جائے اور دوسرے کو قتل نہ کیا جاوے۔ محض ارتداد کو محاربہ قرار دینا ایک زبردستی ہے۔ جب تک اُس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو محاربہ کہلا سکے اس کو محارب نہیں کہہ سکتے۔ بحر الحیط میں لکھا ہے و قول ابن عباس، المحاربة هُنا الشرث و قول عروة الارتداد غير

صحیح عند الجمهور۔ یعنی حضرت ابن عباس کا یہ قول کہ اس آیت کریمہ میں محاربہ سے مراد شرک ہے اور عروہ کا یہ قول کہ اس آیت کریمہ میں محاربہ سے مراد ارتداد ہے جمہور کے نزدیک صحیح نہیں۔ (بحر المحيط جلد 3 صفحہ 471)

بندہ کی رائے میں حامیان قتل مرتد کے اس قول کی تردید میں کہ محاربہ سے مراد محض ارتداد ہے بحر المحيط کی مندرجہ بالا عبارت ہی کافی ہے۔

احادیث متعلق قتل مرتد کو یکجا نئی نظر سے دیکھنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے یعنی یہ کہ صرف ایسے مرتد کے قتل کا حکم ہے جو محارب ہو اس نتیجہ کی صحت کی چوتھی کسوٹی یہ ہے کہ قرآن شریف کی اس آیت کریمہ کی تفسیر کہ **وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ** (الانعام: ۱۵۲) اُن احادیث کے ذریعہ کی جاتی ہے جن میں تین قسم کے لوگوں کے قتل کا حکم ہے اور جن کو میں اوپر نقل کر چکا ہوں اور اس آیت کریمہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ خود بھی کرتا ہے جبکہ فرماتا ہے **مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا** (المائدہ: ۳۳) یہ دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ بالحق سے کیا مطلب ہے یعنی دوہی صورتوں میں کسی انسان کا قتل کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ کسی انسان کو قصاص میں قتل کیا جاوے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس درجہ کے فساد کا مرتکب ہو جو اُس کو قتل کا مستوجب بناوے اور ظاہر ہے کہ محض ارتداد ایسا فساد نہیں کہلا سکتا جو کسی کو مستوجب قتل بناوے۔ کیونکہ اگر محض ارتداد ہی انسان کو مستوجب قتل بنا دیتا ہو تو پھر ایک کافر بھی مستوجب قتل ٹھہرتا ہے کیونکہ دونوں کفر کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ ایک مرتد اُسی صورت میں فساد کا مرتکب کہلا سکتا ہے جبکہ وہ محارب ہو جیسا کہ بعض احادیث میں تصریح کے ساتھ اس شرط کا ذکر کیا گیا ہے۔ پس قرآن شریف کا جواز قتل کو صرف دو صورتوں میں محصور کر دینا یعنی ایک قصاص کی صورت اور دوسری فساد فی الارض کی صورت ظاہر کرتا ہے کہ وہی مرتد واجب القتل ٹھہر سکتا

ہے جو محارب ہو اور جو نتیجہِ احادیث کو یکجائی نظر سے دیکھنے پر نکالا گیا ہے وہی نتیجہ صحیح اور درست ہے۔ اس جگہ یہ امر بھی ذکر کر دینے کے قابل ہے کہ آیت کریمہ **لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ** کی آیت ہے۔ اور مفسرین **بِالْحَقِّ** کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول نقل کرتے ہیں جس میں تین قسم کے لوگوں کے قتل کا ذکر ہے اور جن میں سے ایک مرتد محارب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مرتد محارب کے قتل کا حکم گویا مکہ میں ہی نازل ہو چکا تھا۔ اس لئے جن مرتدین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قتل نہیں کیا۔ ان کی نسبت یہ عذر نہیں ہو سکتا کہ ابھی قتل مرتد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

اس نتیجہ کی صحت کی پانچویں کسوٹی یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ مرتدہ کو قتل نہ کیا جاوے۔

روی ابو حنیفة عن عاصم عن ابی رزین عن ابن عباس لا تقتل

النساء اذا هن ارتددن (یعنی شرح بخاری جلد 11 صفحہ 232)

اگر محض ارتداد قتل کا موجب ہوتا تو عورت و مرد دونوں مساوی سمجھے جانے چاہئے تھے کیونکہ ارتداد میں دونوں یکساں ہیں۔ عورت کو قتل سے مستثنیٰ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ محض ارتداد کی سزا قتل نہیں بلکہ قتل کی سزا محارب ہونے کی وجہ سے دی جاتی تھی اور چونکہ عورتیں عموماً محارب نہیں ہوتیں اس لئے ان کو قتل سے مستثنیٰ کیا گیا ہے جس طرح عام جنگ کی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو مستثنیٰ فرمایا۔ آپ جب کسی لشکر کو لڑائی کے لئے روانہ فرماتے تو رخصت کرتے وقت آپ فرماتے:-

اغزوا بسم اللہ فی سبیل اللہ تقتلون من کفر باللہ لا تغلوا ولا

تغدروا ولا تمشلوا ولا تقتلوا ولیدوا ولا امرءة.

(مؤطا امام مالک کتاب الجہاد۔ باب النهی عن قتل النساء والولدان فی الغزو)

یعنی خدا تعالیٰ کے نام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرو۔ خیانت نہ کرو۔ نہ بد عہدی کرو۔ نہ کسی مقتول کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان وغیرہ کا ٹواؤ اور نہ کسی بچے کو قتل کرو اور نہ کسی عورت کو قتل کرو۔

پس مرتدہ عورت کو نہ قتل کرنے کا حکم بھی ظاہر کرتا ہے کہ یہاں بھی وہی صورت ہے جو عام جنگ میں ہوتی ہے اور مرتدہ کو اس لئے مستثنیٰ کیا ہے کہ وہ محارب نہیں ہو سکتی۔ پس ثابت ہوا کہ صرف مرتد محارب کو قتل کرنے کا حکم ہے نہ عام مرتدین کو۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص حدیث مندرجہ بالا پر ابوحنیفہؒ کے متفرد ہونے کا اعتراض کرے تو غلط ہے کیونکہ اس حدیث کو عبدالرزاق نے الشوری عن عاصم کے طریق سے بیان کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق۔ کتاب القصاص) (۲) دارقطنی نے بھی اس حدیث کو ابی مالک النخعی عن عاصم کے طریق سے نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب الحدود صفحہ 338)

(۳) دارقطنی نے اس حدیث کو شبیبہ عن عاصم کے طریق سے بیان کیا ہے۔ (کتاب الحدود صفحہ 338)

(۴) نیز ابن ابی شیبہ نے اسی حدیث کو روایت کیا ہے عن وکیع عن ابی حنیفہ۔ (تعلیق المغنی شرح دارقطنی صفحہ 338)

نتیجہ مذکورہ بالا کی صحت کی چھٹی کسوٹی یہ ہے کہ جیسے قتل مرتد کے متعلق بعض احادیث موجود ہیں جن کے ساتھ محاربہ کی شرط ہے ایسا ہی بعض ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن میں مرتد کے قتل کی ممانعت کی گئی ہے۔ عبدالرزاق نے مختلف احادیث عدم قتل مرتد کے بارہ میں عطاءء حسن۔ اور ابراہیم نخعی سے نقل کی ہیں (دیکھو ہدایہ حاشیہ جلد 2 صفحہ 354 باب فی احکام المرتدین)۔ اور ابراہیم نخعی جو ایک مشہور فقیہ ہیں بعض دیگر علماء کی طرح قتل مرتد کے مخالف ہیں۔

پس جب دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں تو ان میں تطبیق کی راہ یہی ہے کہ قتل مرتد کو اُس شرط کے ساتھ مشروط کیا جائے جو بعض احادیث میں صراحۃً موجود ہے یعنی محارب ہونے کی شرط۔ میں ناظرین کی توجہ کو ان احادیث کی طرف خصوصیت کے ساتھ پھیرتا ہوں جو عبد الرزاق نے عدم قتل مرتد کے بارے میں نقل کی ہیں۔ کیونکہ یہ احادیث حامیان قتل مرتد کے اس دعویٰ کو پاش پاش کر دیتی ہیں جو کہتے ہیں کہ احادیث میں ہر ایک مرتد کے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب احادیث پر بھی یکجائی نظر ڈالی جائے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ محض ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے بلکہ صرف ایسے مرتدین کے قتل کا حکم ہے جو محارب ہوں اور اُن کے لئے قتل کی سزا ارتداد کی وجہ سے مقرر نہیں کی گئی بلکہ محارب ہونے کی وجہ سے۔ اور تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل درآمد بھی اُسی کے مطابق تھا اور یہی راہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اب بھی اگر کوئی شخص اپنے اسی اسرار پر قائم رہے کہ محض ارتداد اور تنہا ارتداد کی سزا قتل ہے تو ایسا شخص انصاف سے کام نہیں لیتا بلکہ ضد سے کام لیتا ہے اور ایسے شخص کو ہم حوالہ خدا کرتے ہیں۔ حق کھل جانے کے بعد بھی جو شخص اس غلط عقیدہ پر قائم رہتا ہے تو وہ عمداً اسلام کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرتا ہے۔

ہم پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ہم قرآن شریف کو مقدم ٹھہرا کر اور اُس کو معیار صحت قرار دے کر دو اہل حدیث کی ہتک کرتے ہیں۔ ہم دو اہل حدیث کی ہتک نہیں کرتے بلکہ اُن کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دیکھو یہ دو اہل حدیث ہی کی برکت ہے کہ ہم نے حدیث کے میدان میں بھی مدعیان قتل مرتد کو شکست دی۔ جن ہتھیاروں سے ہم نے اس میدان میں مولوی صاحبان کو شکست دی ہے وہ اسی اسلحہ خانہ سے ہمیں میسر ہوئے ہیں جو مدونین حدیث نے ہمارے لئے تیار کر رکھا ہے۔ پس ہم ان محدثین کا تہ دل سے شکریہ

ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس قدر محنت اور تکلیف اٹھا کر احادیث کی چھان بین کی اور ان کو مدون کیا۔ آج انہی کی محنت اور جانفشانی کے طفیل ہم حامیان قتل مرتد پر فتح حاصل کر رہے ہیں۔ اگر یہ بزرگ ہمارے لئے یہ تھیاری نہ چھوڑ جاتے تو ہم مولوی صاحبان کی غلطی کا حدیث کے ذریعہ کس طرح ازالہ کرتے۔ اگر دو اوین حدیث میں یہ الفاظ آج موجود نہ ہوتے کہ رجل خرج محارباً لله ورسوله اور رجل يخرج من الاسلام

فيحارب الله عز وجل ورسوله اور رجل حارب الله ورسوله وارتد عن الاسلام۔ اور حارب الله ورسوله صلى الله عليه وسلم۔ اور التارث لدينه

المفارق للجماعة اور المارق لدينه الفارق للجماعة اور لا تقتل النساء

اذا هن ارتددن اور اگر عدم قتل مرتد کے متعلق احادیث موجود نہ ہوتیں اور اگر ایسے مرتدین کے واقعات موجود نہ ہوتے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود قدرت کے قتل نہ کیا۔ اگر صلح حدیبیہ کی شرائط احادیث میں موجود نہ ہوتیں جن کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد کیا کہ اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے گا تو اس کا مطالبہ نہ کیا جائے گا۔ اگر احادیث میں عبداللہ بن ابی سرح مرتد کی حضرت عثمانؓ کی سفارش پر معافی کا ذکر نہ ہوتا۔ اگر احادیث سے یہ ثابت نہ ہوتا کہ جن مرتدین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کروایا ان کو ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے جرائم کی وجہ سے قتل کروایا۔

اگر یہ سب زبردست دلائل آج ہمیں دو اوین حدیث میں لکھے ہوئے نہ ملتے تو ہم کس طرح مرتد کے دعویداروں پر خود ان احادیث کے ذریعہ ان کی غلطی واضح کر سکتے۔ پس ہم دو اوین حدیث کو نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ذریعہ ہمیں اس بحث میں بہت مدد ملی ہے۔

اسی طرح ہم دو اوین فقہ کو بھی نہایت ادب اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان فقہاء کے ہم شکر گزار ہیں جنہوں نے تحقیق حق کے لئے نہایت ہی قیمتی اصول قائم کئے

ہیں۔ دیکھئے ان بزرگوں کے قائم کردہ اصول سے ہمیں کیسی مدد ملی۔ دو اوین حدیث میں قتل مرتد کے متعلق ہمیں دو قسم کی احادیث ملیں ایک وہ جن میں ارتداد کا ذکر تھا یعنی ایسے الفاظ تھے کہ من بدّل دینہ۔ من غیر دینہ۔ ارتدّ عن الاسلام۔ کفر بعد الاسلام اور دوسری وہ جن میں ارتداد کے ساتھ محاربہ کی بھی شرط تھی۔ اب ان دو قسم کی احادیث کے متعلق فیصلہ کرنے میں فقہاء نے ہمیں کیسا زین اصول بتایا کہ ایسی صورت میں جن احادیث کے ساتھ شرط مذکور نہیں ہے وہاں بھی شرط کا وجود قرار دینا چاہیے اور مطلق کو مقید کے تابع کرنا چاہیے۔ دیکھو ہمیں فقہاء کے اس مسلمہ اصول سے کیسی مدد ملی اور کس طرح تمام احادیث کے متعلق صحیح فیصلہ کی راہ ہم پر کھولی گئی جو ہر ایک طالب حق کو تسلی بخشی ہے اور قرآن شریف کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ پس خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جیسا قرآن کے میدان میں قتل مرتد کے دعویداروں نے ہزیمت اٹھائی ایسا ہی احادیث کے میدان میں بھی اُن کو خدا تعالیٰ کے فضل سے ہزیمت ہی اٹھانی پڑی اور ہم اُن تمام ائمہ حدیث و فقہ کے لئے دعا کرتے ہیں جن کی مدد سے ہمیں یہ فتح نصیب ہوئی۔ اللّٰهُم اغفر لهم و ارحمهم و ادخلهم فی عبادت المقربین۔

اب میں حامیان قتل مرتد کی خدمت میں ایک اور عرض کرتا ہوں۔ اگر اُن کو باوجود ان تمام شہادتوں کے جو میں نے اوپر پیش کی ہیں اسی بات پر اصرار ہے کہ ارتداد کے لئے بلا کسی شرط کے قتل کی سزا دینی چاہیے تو میں ان کو ایک راہ بتاتا ہوں۔ اگر وہ اُس راہ پر چلیں گے تو ان کا حدیث من بدله دینہ فاقتلوه پر عمل بھی ہو جائے گا اور اُن کو اس بات کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی کہ تمام قرآن شریف کو منسوخ قرار دیں۔ اور وہ راہ یہ ہے کہ قتل کے معنی صرف جان سے مار ڈالنا نہیں ہیں بلکہ اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ کالمقتول قرار دینا اور مردوں میں شمار کرنا۔ حضرت عمر نے سقیفہ کے دن سعد کی نسبت جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ فرمایا اقتلوا سعدًا

قتله اللہ یہاں اقتلوا کے معنی یہ کئے گئے ہیں ای اجعلوه کمن قتل واحسبوه کمن مات وھلک ولا تعتدّ وابعثہدہ ولا تعرجوا علی قولہ (اقرب الموارد ونہایۃ لابن الاثیر) اسی طرح حضرت عمر نے فرمایا من دعا الی امارۃ نفسہ او غیرہ من المسلمین فاقتلوه۔ یہاں بھی فاقتلوه کے یہ معنی کئے گئے ہیں ای اجعلوه کمن قتل ومات بان لا تقبلوا الہ قولاً وتقیموا الہ دعویۃ (نہایۃ لابن الاثیر) اسی طرح ایک اور حدیث ہے اذا بویع لخیفتین فاقتلوا لاخر منہا یہاں بھی اقتلوا کے یہ معنی کئے گئے ہیں ای ابطلوا دعوتہ واجعلوه کمن مات۔ (اقرب الموارد ونہایۃ لابن الاثیر)

پس اگر ہمارے مخالف مولوی صاحبان کو اسی بات پر اصرار ہے کہ باقی تمام امور کو بالکل نظر انداز کر دیں اور الفاظ من بدل دینہ فاقتلوا پر عمل کریں اور ان الفاظ میں کسی قسم کی شرط داخل کرنا گناہ سمجھیں۔ یہاں تک کہ استنباہ کی شرط کو بھی ان الفاظ کی پیروی کر کے چھوڑ دیں (حالانکہ استنباہ کی شرط باوجود ان الفاظ میں مذکور نہ ہونے کے اُن کے نزدیک مسلمہ ہے اور یہ امر ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ استنباہ کی شرط کو تو وہ اس حدیث کے الفاظ میں اپنی طرف سے بڑھانا جائز قرار دیتے ہیں مگر محاربہ کی شرط جو قتل مرتد کی دوسری احادیث میں صراحۃً موجود ہے اور قرآن شریف کی آیت کی رو سے ضروری ہے اس کا بڑھانا حرام سمجھتے ہیں) تو اُن کے لئے دوسری راہ کھلی ہے کہ فاقتلوه کے وہ معنی لے لیں جو احادیث مندرجہ بالا میں قتل کے لئے کئے گئے ہیں۔ اس طرح اُن کا اس حدیث پر بھی عمل ہو جائے گا اور قرآن شریف کو بھی کالعدم قرار نہیں دینا پڑے گا۔

قتل مرتد اور صحابہؓ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حامیان قتل مرتد نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

سوانح میں ایسی مثالوں کی تلاش کی ہے جن سے یہ ثابت ہو کہ صحابہ بھی لوگوں کو محض ارتداد کی سزا میں قتل کر دیا کرتے تھے اور نہایت خوشی کی بات ہے کہ جیسا کہ ابھی انشاء اللہ تعالیٰ ناظرین پر روشن ہو جائے گا اس کوشش میں بھی اُن کو ایسی ہی تلخ ناکامی حاصل ہوئی ہے جیسی کہ قرآن شریف اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرہ میں۔

میں ذیل میں وہ مثالیں نقل کرتا ہوں جو ان لوگوں نے صحابہ کے سوانح سے پیش کی ہیں۔

- (۱) حضرت ابوبکر نے مرتدین کے ساتھ جنگ کی۔
- (۲) مسیلمہ کذاب کے ساتھ جنگ کی گئی۔
- (۳) طلحہ مدعی نبوت کے ساتھ جنگ ہوا۔
- (۴) حضرت ابوبکر کے زمانہ میں ام قرفہ کو بوجہ ارتداد قتل کیا گیا۔
- (۵) حضرت علی نے زنادقہ کو جلادیا۔
- (۶) حضرت علی نے خوارج کے ساتھ جنگ کی۔
- (۷) حضرت معاذ نے ایک مرتد یہودی کو قتل کرایا۔

صحابہ کے متعلق بحث کرنے سے پہلے میں حامیان قتل مرتد سے ایک سوال کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ سوال یہ ہے کہ جن دواوین حدیث و فقہ پر وہ لوگ اس قدر زور دیتے ہیں اُن کا کسی صحابی کے قول یا فعل کے متعلق کیا فتویٰ ہے۔ کیا کسی صحابی کا قول یا فعل شریعت اسلام میں منفقہ طور پر حجت شرعیہ سمجھا گیا ہے۔ اس کے متعلق میں کسی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتا صرف ان علماء سے پوچھتا ہوں کہ وہ خود بتائیں کہ اُن کے دواوین مسلمہ و مقبولہ میں صحابی کے قول یا فعل کے متعلق کیا فتویٰ دیا گیا ہے۔ اگر ان دواوین سے منفقہ طور پر یہ ثابت ہو کہ ہر ایک صحابی کا ہر ایک قول اور ہر ایک فعل حجت شرعی ہے تب تو صحابہ کے افعال و اقوال کی بحث ایک نہایت ضروری بحث سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر ان دواوین کے

متفقہ فتویٰ سے ایسا ثابت نہ ہو تو پھر یہ بحث ہمارے علماء کے لئے چنداں مفید نہ ہوگی۔ کیونکہ اگر بفرض محال وہ یہ ثابت بھی کر سکیں کہ کسی صحابی کا عمل اور قول قتل مرتد کی تائید میں ہے تو اس کا وہ قول یا فعل حجت نہیں سمجھا جائے گا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے متعلق دو اوین حدیث و فقہ کا کیا فتویٰ ہے۔ سو واضح ہو کہ اہلحدیث کے نزدیک صحابی کا قول یا فعل کوئی حجت نہیں۔ جیسا کہ اصول حدیث کے رسالہ موسومہ بہ مختصر الجرجانی میں السید الشریف الجرجانی نے تحریر فرمایا ہے۔

”مازوی عن الصحابی من قول او فعل متصلاً کان او منقطعاً لیس بحجة علی الاصح“۔

اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قول یا فعل صحابی قطعاً کوئی حجت نہیں۔ کتاب کشف الاسرار شرح المنار جو اصول فقہ کی ایک مستند کتاب ہے اُس کی جلد 2 صفحہ 99 پر لکھا ہے۔

وانما قلدنا الانبياء عليهم السلام لانا عرفنا عصمتهم عن الكذب
والخطأ بدلالة المعجزة فاتبعناهم لقيام دلالة العصمة وقد فقدت
هذه الدلالة في غيرهم فلا يجب اتباعهم ولهذا قال الشافعي لا
نقلد الصحابي لان قول الصحابي ليس بحجة اذ لو كان قوله حجة
فدعا الناس الى قوله كالنبي عليه السلام.

یعنی ہم انبیاء علیہم السلام کی اس لئے تقلید کرتے ہیں کہ ہم نے اُن کے معجزات کے ذریعہ پہچان لیا ہے کہ وہ کذب اور خطا سے محفوظ تھے۔ پس ہم اُن کے معصوم ہونے کی وجہ سے اُن کی اتباع کرتے ہیں اور یہ بات دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ پس اُن کا اتباع واجب نہیں اور یہی وجہ ہے کہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ہم صحابی کی تقلید نہیں کرتے کیونکہ صحابی کا قول حجت نہیں۔ کیونکہ اگر صحابی کا قول حجت ہوتا تو وہ اپنے قول کی طرف

لوگوں کو اسی طرح دعوت دیتا جس طرح کہ نبی علیہ السلام اپنے قول کی طرف دعوت دیتا ہے۔ پھر اسی کتاب کے صفحہ ۱۰۰ پر لکھا ہے:-

وروی عن عمر ڪتب الی شریح ان اقض بكتاب اللہ ثم بسنة
رسول اللہ ثم برأیك ولم یقل بقولی.

یعنی حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے شریح کو لکھا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ فیصلہ کرنا اس کے بعد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور اُس کے بعد اپنی رائے کے ساتھ اور یہ نہیں فرمایا کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میرے قول کے ساتھ فیصلہ کر۔

اور احناف کے نزدیک جو امر قیاس سے معلوم ہوتا ہے اُس میں صحابی کی تقلید ہرگز ضروری نہیں۔ اور قتل مرتد ایک ایسا مسئلہ ہے جو قیاس کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہم قرآن شریف کی آیات سے یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اسلام میں قتل مرتد جائز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ قرآن شریف کی کئی آیات کے صریح خلاف ہے۔ پس جو امر قرآن شریف سے قیاس کیا جاسکتا ہے اُس میں فقہ حنفیہ بھی صحابی کے قول یا فعل کو ضروری قرار نہیں دیتی اور جن امور میں صحابی کی تقلید کا جواز بیان کیا گیا ہے اُن میں بھی اس جواز کی بنیاد یہ ٹھہرائی گئی ہے کہ احتمال ہے کہ اُس صحابی نے یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ اور اس میں بھی خود حنفی مذہب کے علماء صحابی کی تقلید واجب قرار نہیں دیتے۔ تمہارا شمار شرح نور الانوار میں لکھا ہے:-

وفیه علی ما افاد بحر العلوم ان احتمال السماع لیس بموجب
والقیاس حجة شرعیة موجبة للعمل فكیف یتروك بمجرد
الاحتمال۔

یعنی علامہ بحر العلوم نے اس بارہ میں یہ مفید بات کہی ہے کہ یہ احتمال کہ صحابی نے

آنحضرتؐ سے یہ سنا ہوگا اس بات کو واجب نہیں کرتا کہ صحابی کے قول کی تقلید کی جائے۔ کیونکہ قیاس ایک شرعی حجت ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ پس ایسی چیز کو جس پر عمل کرنا واجب اور ضروری ہے محض اس احتمال سے کہ شاید صحابی نے سنا ہو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ قمر الاقمار کا فاضل مصنف لکھتا ہے:-

ولو كان ما قاله الصحابي مسموعا من الرسول صلى الله عليه وسلم لرفعه الى النبي صلى الله عليه وسلم..... ولما لم يرفعه علم انه من اجتهاده واجتهاد غيره متساويان في احتمال الخطأ لعدم عصمته فلا يكون حجة وهذا فيما يدرك بالقياس واما ما فيما لا يدرك بالقياس فيجوز ان الصحابي انما افتى به بخبر ظنه دليلا ولا يكون كذلك فمع جواز ان لا يكون دليلا كيف يلزم غيره فلا يكون حجة۔

یعنی صحابی جو بات کہتا ہے اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہوتی تو وہ اس بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کرتا۔ اور جب اُس نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے اجتہاد سے ایسا کہتا ہے اور صحابی اور غیر صحابی کا اجتہاد اس امر میں برابر ہے کہ دونوں میں خطا کا احتمال ہے کیونکہ وہ معصوم نہیں۔ پس اُس کا قول حجت نہیں۔ یہ ایسے امور کے متعلق ہے جو قیاس سے معلوم ہو سکتے ہیں اور جو امر قیاس سے معلوم نہیں ہو سکتا اُس میں ممکن ہے کہ صحابی نے اُس بات کا فتویٰ ایسی خبر کی بنا پر دیا ہو جس کو اُس نے دلیل خیال کر لیا حالانکہ وہ دلیل نہ ہو۔ پس جب یہ ممکن ہے کہ جس چیز کو اُس نے دلیل خیال کیا ہے وہ حقیقت میں دلیل نہ ہو تو اس صورت میں اُس بات کا ماننا کسی دوسرے پر کیونکر لازمی ہو سکتا ہے۔

نور الانوار میں لکھا ہے۔

وقال الشافعي رحمه الله لا يقلد احد منهم سواء كان مدرگا
بالقياس او لا لان الصحابة كان يخالف بعضهم بعضاً وليس احدهم
اولى من الاخر فتعين البطلان.

یعنی شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی صحابی کی تقلید ضروری نہیں۔ خواہ وہ امور ایسے
ہوں جو قیاس کے ذریعہ معلوم ہو سکتے ہوں یا ایسے ہوں جو قیاس کے ذریعہ معلوم نہ ہو
سکتے ہوں کیونکہ صحابہ کا خود ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف ہوا کرتا تھا۔ اور اس معاملہ
میں ایک کو دوسرے پر کوئی ترجیح نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ان کی تقلید لازمی نہیں ہے۔
مندرجہ بالا حوالجات اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ دواوین فقہ و
حدیث کا اس امر پر اتفاق نہیں ہے کہ صحابی کا قول یا فعل حجت شرعیہ ہے۔ اس لئے اگر
مولوی صاحبان یہ ثابت بھی کر دیتے کہ کسی صحابی کا قول یا فعل اس امر کی تائید کرتا ہے کہ
مرتد کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل کر دیا جائے تب بھی خود انہی کے مسلمہ دواوین کے رُوسے
ان کی غرض پوری نہیں ہو سکتی تھی لیکن موجودہ بحث میں اعمال صحابہ کی جو مثالیں حامیان قتل
مرتد نے اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کی ہیں جب ان پر واقعات کی روشنی میں نظر کی
جائے تو وہ مثالیں حامیان قتل مرتد کی تائید نہیں کرتیں بلکہ تردید کرتی ہیں۔

قتل مرتد کے دعویداروں نے اپنے زعم میں سب سے زیادہ زبردست مثال جو اپنے
دعویٰ کی تائید میں پیش کی ہے وہ اُس ارتداد کی مثال ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
وفات کے وقت وقوع میں آیا۔ ان کے نزدیک حضرت ابو بکرؓ کا اپنے عہد خلافت کے
مرتدین کے ساتھ جنگ کرنا اس امر کا قطعی اور یقینی ثبوت ہے کہ اسلام میں محض ارتداد
کی سزا قتل ہے۔

ہمارے بھولے بھالے مولوی صاحبان عرب کے قبائل کی طبیعت سے بالکل
ناواقف ہیں۔ وہ ارتداد کے لفظ کو سن کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مرتدین بالکل بے ضرر لوگ

تھے۔ اُن کا اس سے زیادہ کوئی قصور نہ تھا کہ وہ زکوٰۃ خلیفہ وقت کو ادا کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور نمازیں پڑھنا چھوڑ بیٹھے تھے۔ اس سے زیادہ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ نہ وہ مسلمانوں سے لڑتے تھے اور نہ کسی کو کوئی گزند پہنچاتے تھے۔ اُن کو حکومت اسلامی سے کوئی پر خاش نہ تھی بلکہ وہ خلیفہ وقت کے تابعدار اور معاون و مددگار تھے اور اسلامی حکومت کے ماتحت وہ امن اور فرمانبرداری سے زندگی بسر کرنے کے خواہاں تھے۔ پس اگر اُن کا کوئی قصور تھا تو یہی تھا کہ زکوٰۃ اور نماز کو وہ ضروری نہ سمجھتے تھے۔ اگر مولوی صاحبان کا ایسا خیال ہے تو یہ ان کا بھولا پن ہے۔ وہ اُس زمانہ کے تمدن اور اُن لوگوں کے طرز سے بے خبر ہیں۔ اُن کے ارتداد کے یہ معنی نہ تھے کہ اُن کو صرف مذہبی اختلاف تھا اور نہ اپنی ملکی زندگی میں وہ اس سلطنت اسلامی کے خیر خواہ اور تابعدار تھے جس کی رعایا ہونے کا وہ مدینہ میں اپنے نمائندوں اور وفود کے ذریعہ اعلان کر چکے تھے۔ بلکہ اُن کے ارتداد کے عملی رنگ میں یہ معنی تھے کہ اُنہوں نے اس سلطنت اسلامی جس کی ماتحتی کا جو ا وہ اپنی گردنوں پر رکھ چکے تھے بغاوت اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ ارتداد کے ساتھ ہی اُنہوں نے اسلام کے خلاف تلوار اٹھالی اور جو لوگ اُن میں سے اسلام پر قائم رہے اُن کو قتل کیا اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے لشکر جمع کرنے شروع کر دیئے۔ اسلامی سلطنت سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور خود دار السلطنت اسلامیہ پر حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کیا اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہا۔ اگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے ساتھ جنگ کیا اور اُن کو تلوار کے ساتھ زیر کیا اور باغیوں کی سرکوبی کی تو اس سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اگر ملک میں امن تھا اور مرتدین کو صرف مذہبی اختلاف تھا اور بغاوت کا کوئی ارادہ نہ تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت اُسامہ بن زید کے لشکر کی روانگی کے وقت عمائد مہاجرین و انصار حضرت صدیق اکبرؓ کی خدمت باہرکت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ایسے خطرہ کے وقت میں اس لشکر کا روانہ کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر وہ ارتداد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قبائل عرب میں نمودار ہوا بالکل ایک بے ضرر تحریک تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے روانگی سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجا اور مع لشکر واپس آنے کی اجازت مانگی اور وجہ پیش کی کہ

ان معی وجوه الناس وجلتهم ولا امن على خليفة رسول الله و حرم رسول الله و المسلمين ان يتخطفهم المشركون .

یعنی میرے ساتھ بڑے بڑے آدمی ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مشرکین خلیفہ وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم محترم اور دوسرے مسلمانوں پر حملہ نہ کر دیں۔

میرے خیال میں حامیان قتل مرتد کو اس امر کے یقین دلانے کا کہ وہ مرتدین کی جماعت جن کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے قتال کیا ایک بے ضرر جماعت نہ تھی۔ سہل ترین طریق یہ ہے کہ ان مرتدین کے حالات میں سے کچھ صفحہ تاریخ سے نقل کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا جائے تا ان کو معلوم ہو کہ یہ لوگ بے ضرر بڑے نہ تھے جیسا مولوی صاحبان نے اپنی سادگی سے سمجھ رکھا ہے بلکہ وہ خونخوار بھیڑیے اور وحشی درندے تھے اور اگر ان کے خلاف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تلوار اٹھائی تو اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام میں محض ارتداد اور تہارتداد کی سزا قتل ہے۔ (۱) جیسا کہ خوف کیا گیا تھا۔ لشکر اسامہ کی روانگی کے بعد مدینہ کے قرب وجوار کے مرتدین نے مدینہ پر حملہ کیا اور کئی دن تک محاصرہ کئے ہوئے پڑے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہی تھوڑے سے آدمیوں کو جو لشکر اسامہ سے بچ رہے تھے ساتھ لے کر محاصرین پر حملہ کر کے ان کو منتشر کیا۔

طبری میں لکھا ہے:-

و كان اول من صادم عبس وذبيان عاجلوه فقاتلهم قبل رجوع

أسامة. (طبری جلد 4 صفحہ 1872)

یعنی سب سے پہلے جن قبیلوں نے مدینہ پر حملہ کیا وہ عبس و ذبیان تھے۔ انہوں نے پہلے حضرت ابوبکرؓ پر حملہ کیا اور اُسامہ کی واپسی سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے ان کے ساتھ جنگ کی۔

ابن خلدون نے لکھا ہے فعاجلتہ عبس و ذبیان و نزل اخرون (بنو اسد۔ فزارہ۔ غطفان۔ طی۔ ثعلبہ۔ بنو کنانہ وغیرہم۔ تاریخ طبری جلد 4 صفحہ 1873 الی صفحہ 1876) بذی القصبہ (ابن خلدون جلد 2 صفحہ ۶۵) یعنی عبس و ذبیان قبیلوں نے پہلے حضرت ابوبکرؓ پر حملہ کیا اور دوسری قومیں یعنی بنو اسد۔ فزارہ۔ غطفان۔ طی۔ ثعلبہ۔ بنو کنانہ وغیرہم ذی القصبہ میں آکر جمع ہو گئے۔
خمیس میں لکھا ہے:-

واقبل خارجة بن حصن بن حذيفة ابن بدر فكان ممن ارتد في خيل
من قومه الى المدينة يريد ان يخذل الناس عن الجزوج او يصيب
عزة فيغير فاغار على ابي بكر ومن معه وهم غافلون .

(تاریخ خمیس جلد 2 صفحہ 204 مطبوعہ 1283ھ)

یعنی خارجه بن حصن جو مرتدین میں سے تھا اپنی قوم کے کچھ سوار لے کر مدینہ کی طرف بڑھا تا کہ صحابہؓ کے نکلنے سے قبل ہی غفلت میں چھاپہ مارے اس لئے اُس نے حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھ کے مسلمانوں پر چھاپہ مارا جب کہ مسلمان بے خبر تھے۔
بعض مرتدین نے مدینہ میں وفود بھیجے تا نماز و زکوٰۃ میں معافی مل جائے اور جب حضرت ابوبکرؓ نے صاف جواب دے دیا اُن لوگوں نے مدینہ پر حملہ کیا۔ ادھر حضرت ابوبکرؓ نے اُن وفود کے چلے جانے کے بعد مسلمانان مدینہ کو اکٹھا کر کے یوں خطاب کیا۔

ان الارض كافرة وقد رأى وفدهم منكم قلة وانكم لا تدرن ائلا
تؤتون ام نهاراً وادناهم منكم على بريد وقد كان القوم مائلون ان

لقبل منهم ونوادعهم وقد ابينا عليهم ونبذنا اليهم عهدهم
فاستعدوا واعدو فما لبثوا الا ثلاثا حتى طرقوا المدينة غارة مع
الليل واخلفوا بعضهم بذي حُسي ليكونوا لهم رداً-

(تاریخ طبری جلد 4 صفحہ 1875)

یعنی تمام ملک اب کافر ہے اور اُن کے وفد نے تمہاری قلت تعداد کو دیکھ لیا ہے۔ تمہیں
معلوم نہیں کہ رات کے وقت ان پر حملہ کریں یا دن کو اور اُن میں سے قریب ترین لوگ تم
سے ایک منزل کے فاصلہ پر ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم اُن کی بات قبول کر کے اُن سے
معاہدہ کر لیں۔ اور ہم نے اس سے انکار کیا۔ پس تم اُن کے حملہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔
اور تین دن ہی گزرے تھے کہ اُنہوں نے رات کے وقت مدینہ پر آ کر چھاپہ مارا اور
ایک جماعت کو ذی حُسی میں چھوڑ آئے تا وہ اُن کے مددگار ہوں۔

حامیان قتل مرتد نوٹ کریں کہ یہ چھاپہ مارنے والی جماعت وہی لوگ تھے جو زکوٰۃ
معاف کرانے کے لئے مدینہ آئے تھے۔ جب درخواست نامنظور ہوئی تو تین دن کے اندر
مدینہ پر حملہ کر دیا۔

مندرجہ بالا حوالجات سے ناظرین نے دیکھ لیا ہے کہ مرتدین نے مسلمانوں پر حملہ
کرنے میں پیشدستی کی اور اُن کو قلیل اور کمزور دیکھ کر سمجھا کہ ہم مدینہ کو فتح کر لیں گے اور
اسلامی سلطنت کے پایہ تخت پر قابض ہو جائیں گے۔ مگر خدا تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے
مطابق خلیفہ وقت کی تائید کی اور دشمنوں کو خائب و خاسر لوٹا دیا۔

مرتدین نے صرف مدینہ ہی پر حملے نہیں کئے تھے بلکہ انہوں نے مرتد ہوتے ہی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد معاً اُن صادق الایمان مسلمانوں کو بھی تہ تیغ
کر دیا جو ان قوموں میں بستے تھے اور جو باوجود اپنی قوم کے مرتد ہو جانے کے اسلام پر قائم
رہے تھے چنانچہ ابن خلدون میں لکھا ہے:-

فوئب بنو ذبیان وعبس علی من فیہم من المسلمین و فعل ذالک

غیر ہم من المرتدین . (ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۶۶)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنتے ہی بنو ذبیان اور عبس نے لوگوں پر حملہ کر دیا جو ان میں مسلمان تھے۔ اور یہ کام صرف بنو ذبیان اور عبس نے ہی نہ کیا بلکہ ان کے سوا جو دوسری مرتد قومیں تھیں انہوں نے بھی اسی طرح ان مسلمانوں کو قتل کر دیا جو ان میں آباد تھے۔

طبری نے لکھا ہے:-

فوئب بنو ذبیان وعبس علی من فیہم من المسلمین وقتلوہم کل

قتلہ و فعل من وراء ہم فعلہم . (تاریخ طبری جلد 4 صفحہ 1877)

یعنی جو نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پہنچی بنو ذبیان اور عبس ان مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے جو ان میں رہتے تھے اور ان کو ہر ایک طریق سے قتل کیا اور جو قومیں ان کے علاوہ بستی تھیں انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ”یعنی انہوں نے بھی ایسے لوگوں کو قتل کر دیا جو اسلام پر قائم رہے۔

اب حامیان قتل مرتد فرمائیں کہ کیا ان لوگوں کا جرم صرف یہی تھا کہ انہوں نے ارتداد اختیار کیا اور کیا ان لوگوں کے واقعات سے ان کا یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں محض ارتداد اور تنہا ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اگر ان لوگوں کا جرم محض ارتداد نہ تھا بلکہ انہوں نے کھلم کھلا بغاوت اختیار کی اور مسلمانوں کو قتل کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹادیں اور اسلامی سلطنت کو جڑ سے اکھیڑ ڈالیں اور اسلام کو نابود کریں۔ تو پھر اے حامیان قتل مرتد کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ آپ ایسے لوگوں کی مثال پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں محض ارتداد اور تنہا ارتداد کی سزا قتل ہے۔ کیا ایسی مثالوں کے پیش کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں کوئی ثبوت نہیں اس

لئے واہیات باتیں پیش کر رہے ہو۔ کچھ تو اپنی مولویت کے نام کی شرم کرنی چاہیے۔
 میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ پیشتر اس کے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایسی قوموں
 کی گوشمالی کے لئے لشکر مختلف اطراف میں روانہ کریں ان میں سے بعض نے بغیر حضرت
 ابو بکرؓ کے حملہ کے خود بخود مدینہ پر حملہ کیا۔ اس سے ناظرین ان مرتدین کے ارادوں کا
 اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن دو وجہوں سے عام طور پر مرتدین مدینہ پر چڑھائی کرنے سے
 رُکے رہے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ جن اقوام نے مدینہ پر حملہ کیا اُن پر حضرت ابو بکرؓ اور آپ
 کے ساتھیوں نے نہایت شجاعت اور دلیری سے حملہ کر کے اُن کو منتشر کر دیا۔ اس سے
 دوسری قوموں پر مسلمانوں کا رُعب قائم ہو گیا۔ دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
 وفات پر معاً لشکر اُسامہ کے روانہ ہو جانے سے یہ ایک بڑا بھاری فائدہ پہنچا کہ عرب کی
 اقوام نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کی طاقت بہت زبردست اور قوی ہے تب ہی تو
 انہوں نے عرب کے مرتدین کی کچھ پرواہ نہیں کی اور بلا کسی خوف کے ایک بھاری لشکر ملک
 شام کی طرف روانہ کر دیا ہے۔

صاحب تاریخ اکامل لکھتے ہیں۔

وكان انفاذ جيش اسامة اعظم الامور نفعاً للمسلمين فان العرب

قالوا لو لم يكن بهم قوة لما ارسلوا هذا الجيش فكفوا عن كثير

ما كانوا يريدون ان يفعلوه. (تاریخ اکامل جلد 2 صفحہ 139)

یعنی لشکر اُسامہ کے بھیجا جانے سے مسلمانوں کو بہت ہی بڑا فائدہ پہنچا کیونکہ عرب
 قوموں نے کہا کہ اگر مسلمانوں میں طاقت اور قوت نہ ہوتی تو وہ ایسے وقت میں اس
 لشکر کو روانہ نہ کرتے۔ پس اس خیال سے وہ اپنے بہت سے ہمدردوں سے رُک گئے۔
 اس حوالہ سے بھی صاف ظاہر ہے کہ تمام مرتد قبائل مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔
 اور صرف اس وجہ سے رُک گئے کہ لشکر اُسامہ کی روانگی سے انہوں نے نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں

میں بہت بڑی طاقت اور قوت ہے۔ اگر ناظرین تفصیل وار ان قوموں کے حالات جن پر حضرت ابو بکرؓ نے لشکرِ اُسامہ کی واپسی کے بعد فوج کشی کی کتب تاریخ میں مطالعہ فرمائیں تو ان پر روز روشن کی طرح یہ امر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قومیں صرف ارتداد کی مرتکب نہیں ہوئی تھیں بلکہ ان سب قوموں نے سلطنت اسلام کے خلاف بغاوت اختیار کی تھی اور اگر ان پر فوج کشی نہ کی جاتی تو یہ لوگ اس بات پر ٹلے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کا نام و نشان دنیا سے مٹادیں۔ روز بروز ان کی جمعیت بڑھتی جاتی تھی اور اگر ان اقوام کو کچھ مزید مہلت مل جاتی تو ان کی جمعیت اس قدر مضبوط ہو جاتی اور ان کا حوصلہ اس قدر بڑھ جاتا کہ تمام گرد و نواح کے مسلمانوں کو تہ تیغ کر کے آخر مدینہ پر حملہ آور ہوتے۔ پس ضروری تھا کہ مسلمان ان پر حملہ آور ہو کر ان کی جمعیت کو توڑتے اور اس آگ کو جو تمام اطراف میں پھیل کر مسلمانوں کی ہستی کو خطرہ میں ڈال رہی تھی بجھا دیتے۔ ہر ایک شخص جو تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے اس بات کو تسلیم کرے گا کہ اگر اس وقت حضرت ابو بکرؓ ان مرتد اقوام کے ساتھ قتال نہ کرتے تو آج نہ اسلام نظر آتا اور نہ مسلمانوں کا وجود پایا جاتا۔

میں یہاں ان تمام قبائل کی کارروائیاں الگ الگ نقل نہیں کر سکتا۔ صرف عینی کی شہادت پر اکتفا کرتا ہوں جو اُس نے تمام قبائل کے متعلق مجموعی طور پر دی ہے۔

عینی میں لکھا ہے:-

وانما قاتل الصديق مانعي الزكوة لأنهم امتنعوا بالسيف و نصبوا
الحرب للامة. (عینی جلد 11 صفحہ 236)

یعنی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے اس لئے قتال کیا کہ انہوں نے تلوار کے ذریعہ سے زکوٰۃ کو روکا اور مسلمانوں کے لئے جنگ برپا کی۔

اس شہادت سے ظاہر ہے کہ جنگ کی ابتدا مانعین زکوٰۃ کی طرف سے ہوئی۔ یعنی نہ صرف ان لوگوں نے زکوٰۃ کے ادا کرنے سے انکار کیا بلکہ مسلمانوں کے خلاف خود ہی

تلوار اٹھائی اور جنگ کی بنیاد ڈالی۔

جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جن قبائل نے ارتداد اختیار کیا ان کا ارتداد مذہبی اختلاف تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے سلطنت اسلامی سے بغاوت اختیار کی۔ تلوار کو ہاتھ میں لیا۔ مدینہ منورہ پر حملہ کیا اپنی اپنی قوم کے مسلمانوں کو قتل کیا۔ آگ میں ڈالا اور ان کا مثلہ کیا۔ جیسا کہ طبری کی مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے۔

ولم يقبل خالد (بعد هزيمتهم) من احد من اسد و غطفان ولا هوازن
ولا سليم ولا طيء الا ان ياتوه بالذنين حرقوا و مثلوا وعد و اعلى اهل
الاسلام في حال ردتهم. (تاريخ طبری جلد 4 صفحہ 1900)

وایضاً ابن خلدون جلد 2 صفحہ 71 و تاریخ اکمال جلد 2 صفحہ 149 بتغائر الالفاظ)

یعنی جب بنی اسد اور غطفان اور ہوازن اور بنی سلیم اور بنی طیٰی کو شکست ہوئی تو خالد رضی اللہ عنہ نے ان کو معافی دینے سے انکار کیا جب تک وہ ان لوگوں کو پیش نہ کریں جنہوں نے مرتد ہونے کے بعد مسلمانوں کو آگ میں ڈال کر جلایا اور ان کے ہاتھ پاؤں ناک وغیرہ کاٹے اور ان پر ظلم کئے۔

اسی طرح تاریخ سے ثابت ہے کہ مرتدین نے اپنے اپنے علاقوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عُمال کو نکال دیا اور بعض جگہ مرتدین نے جداگانہ بادشاہت بھی قائم کر لی۔ یا قائم کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً ابن خلدون نے لکھا ہے۔

وارتدت ربيعة ونصبوا المنذر بن النعمان بن المنذر و كان يسمي
المغرور فاقاموه ملكا كما كان قوم بالحيرة۔

(ابن خلدون جلد 2 صفحہ 76 و تاریخ طبری جلد 4 صفحہ 1960)

یعنی بنو ربیعہ نے (جو بحرین کا ایک قبیلہ تھا) ارتداد اختیار کیا اور مرتد ہونے کے بعد

المنز بن النعمان کو کھڑا کیا جو مغرور کے خطاب سے مشہور تھا اور اُس کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ پس ان حالات میں یہ کہنا کہ عہد خلافت اولیٰ میں مسلمانوں کا مرتدین سے قتال کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کیلئے قتل کی سزا مقرر کی گئی ہے ایک باطل دعویٰ ہے اور جو شخص ایسا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو تاریخ اسلام سے قطعاً واقف یا عمداً دنیا کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔

مسئلہ کذاب

اسی طرح قائلین قتل مرتد نے مسئلہ کذاب کے واقعہ کو پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اور اعتراض کیا ہے کہ اگر لاکراہ فی الدین کے یہی معنی درست ہیں کہ دین کے بارہ میں کسی چیز پر جبر نہیں کرنا چاہیے تو مسئلہ کذاب سے کیوں جنگ کی گئی اور اس کو کیوں آزاد نہ چھوڑا گیا؟

اقول اگر اُس کا صرف رسالت کا ہی دعویٰ ہوتا اور ملکی معاملات میں وہ کوئی دخل نہ دیتا تب تو بے شک حامیان قتل مرتد کا اعتراض قابل غور ہوتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ ان بزرگان کو اگر تاریخ اسلام سے کچھ بھی آگاہی ہو تو اُن کو معلوم کرنا چاہیے کہ مسئلہ کذاب کی اصل غرض حکومت سے تھی۔ نبوت کا دعویٰ تو صرف ایک ذریعہ تھا جو اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بنو حنیفہ کے وفد کے ساتھ مل کر مدینہ میں آیا اور یہ شرط پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد مجھے خلیفہ بنا دیں تو میں آپ کی اتباع کر لوں گا۔ آپ نے ایک کھجور کی چھڑی اٹھا کر فرمایا کہ تجھے اس چھڑی کے برابر بھی نہیں دیا جائے گا۔ یہ کہہ کر آپ اُس کے پاس سے چلے آئے۔ واپس جا کر اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ نصف ملک ہمارا ہے اور نصف ملک قریش کے لئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

مندرجہ ذیل مضمون کا خط لکھا:-

من مسیلمة رسول الله الى محمد رسول الله. سلام عليك فاني
قد اشركت في الامر معك وان لنا نصف الارض ولقریش نصف
الارض ولكن قریشا قوم يعتدون. (ملاحظہ ہو تاریخ طبری جلد 4 صفحہ 1849)
یعنی میں آپ کے ساتھ اس امر میں شریک کیا گیا ہوں۔ نصف ملک ہمارا ہے اور
نصف قریش کا۔

آپ نے جواب میں لکھوایا:-

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (الاعراف: 129)

کہ ملک تو اللہ کا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث کر دیتا ہے اور
اچھا انجام متقیوں کے ہی ہاتھ رہتا ہے۔

بعد دعوی نبوت حجر اور الیمامہ پر حاکم بن گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر
کردہ والی ثمامہ بن اثال کو نکال دیا (نخمس جلد 2 صفحہ 177) سجاح باغیہ کے ساتھ جو
مسلمانوں سے لڑنے کا ارادہ رکھتی تھی اتحاد کر لیا اور اسے کہا اکل بقومی وقومك العرب
یعنی اپنی اور تیری قوم کی مدد سے تمام عرب کو فتح کر لوں گا (تاریخ طبری جلد 4 صفحہ 1918)
اس کو بعد از دعوی نبوت دو مدنی صحابی ملے۔ حبیب بن زید اور عبد اللہ بن وہب الاسلمی۔
اس نے دونوں کو پکڑ کر اپنی نبوت منوانی چاہی۔ عبد اللہ تو مرتد ہو گیا مگر حبیب نے نہ مانا تو
اُسے عضو عضو کاٹ کر آگ میں جلا دیا (تاریخ نخمس جلد 2 صفحہ 241)

کیا ان حالات میں حامیان قتل مرتد کہہ سکتے ہیں کہ مسیلمہ سے محض ارتداد کی وجہ سے
قتل کیا گیا اور یہ کہ اس کے واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔
مسیلمہ کے ساتھ اس قدر جمعیت اکٹھی ہو گئی تھی کہ جب یمامہ میں خالد بن ولید

کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی تو صرف بنو حنیفہ کے چالیس ہزار سپاہی اس کے ساتھ موجود تھے اور ایسی خونریز لڑائی ہوئی کہ مسلمانوں نے ایسی سخت لڑائی کبھی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ مگر حامیانِ قتل مرتدِ مسیلمہ کو صرف ایک بے ضرر انسان ظاہر کرتے ہیں۔ اور اعتراض کرتے ہیں کہ لا اکراہ فی الدین کے منشاء کے ماتحت اُس کو بالکل آزاد چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

اسی طرح حامیانِ قتل مرتد نے طلیحہ مدعی نبوت کی مثال کو پیش کیا ہے اور اُس سے یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔

یا تو یہ مولوی صاحبان خود تاریخ سے قطعاً ناواقف ہیں یا دوسروں کو ناواقف سمجھ کر دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے ایک بات بھی درست نہ ہو تو پھر یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کیوں مسیلمہ اور طلیحہ کی مثالوں کو اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔ کیونکہ یہ لوگ محض مرتد ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے اسلام کے خلاف تلوار اٹھائی اور مسلمانوں کی جماعت کو نابود کر کے خود ملک عرب پر قبضہ کرنا چاہا۔ مسیلمہ کے حالات میں مختصراً اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اب طلیحہ کے حالات سنئے!

طلیحہ بن خویلد اسدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہی مرتد ہو گیا تھا۔ سیرامقام میں قیام پذیر ہوا اور وہاں اس نے اپنے اردگرد ایک لشکر جمع کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ قبائل غطفان و ہوازن و طے اس کے ساتھ ہو گئے۔ جن لوگوں نے مدینہ پر پیش دستی کر کے چھاپہ مارا تھا ان کے دو حصے ہو چکے تھے۔ ایک وہ جو ابرق میں مقیم تھے اور دوسرے وہ جو ذی القصد میں تھے۔ طلیحہ نے اپنے بھائی کو مؤخر الذکر لوگوں پر افسر مقرر کر کے بھیجا۔ عیس و ذبیان کو جب حضرت ابو بکرؓ نے مدینہ کے پاس شکست دی تو وہ بھی طلیحہ سے آکر ملے اور اسی طرح بنو فزازہ نے مسلمانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں بعض کا مثلہ کیا بعض کو آگ میں جلادیا۔ جیسا کہ

طبری کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

”ولم يقبل (خالد بعد هزيمتهم) من احد من اسد و غطفان ولا
هوازن ولا سليم ولا طى الا ان ياتوه بالذيين حرقوا ومثلوا وعدوا
على اهل الاسلام فى حال ردّتهم“

(تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۹۰۰، ایضاً ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۱۷۰ و تاریخ اکمال جلد ۲ صفحہ ۱۴۹ بتغایر الالفاظ)
مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے کہ بنی اسد اور غطفان اور هوازن اور سلیم اور بنی
طی کے لوگوں نے مسلمانوں کو آگ میں ڈال کر جلایا اور ان کا مثلہ کیا۔ اور یہ سب قبائل وہ
ہیں جو مرتد ہو کر طلیحہ کے ساتھ مل گئے تھے۔

اسی طرح عکاشہ بن محسن اور ثابت بن اقرم انصاری گردنواح کی گشت اور ادھر
ادھر کی تگ و دو کو نکلے تو ان کی غفلت میں طلیحہ اور اس کے بھائی نے انہیں قتل کر دیا اور
مسلمانوں نے ان کی لاشوں کو روندنا ہوا پایا۔ مندرجہ بالا واقعات کی تصدیق کے لئے ملاحظہ
ہوں طبری جلد 4۔ تاریخ اکمال جلد 2 اور نمیس جلد 2۔

اب ناظرین خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ کیا طلیحہ کا جرم صرف یہی تھا کہ اس نے ارتداد
اختیار کیا یا وہ دوسرے جرموں کا بھی مرتکب ہو چکا تھا؟ وہ نہ صرف خود باغی تھا بلکہ وہ
دوسرے باغیوں کا بلجاء اور مأوی بنا ہوا تھا۔ اور اس کے لوگوں نے اور خود اس نے
مسلمانوں کو قتل کیا۔ کیا ان حالات میں یہ ضروری نہ تھا کہ اس سے قتال کیا جاوے؟ اور پھر
طرفہ یہ کہ لڑائی کرنے سے پہلے حضرت خالدؓ نے اپنا ایلچی طلیحہ کے پاس بھیجا۔ خونریزی
سے اس کو روکنا چاہا اور بہت سمجھایا مگر اس نے خالدؓ کے پند و نصائح کو کسی طرح نہیں سنا۔
جب مسلمان عاجز آ گئے اور کسی نصیحت نے بھی اثر نہ دکھایا تو ہار کے لڑائی کی ٹھہری۔

ابتدائے اسلام میں جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب
دعویٰ نبوت کیا وہ صرف مسیلمہ اور طلیحہ ہی نہیں تھے بلکہ ان کے سوا اور بھی کئی اشخاص نے

نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور سب کی غرض دعویٰ نبوت سے صرف یہی تھی کہ حکومت حاصل ہو اور ملک عرب کے کسی نہ کسی حصہ پر ان کو قبضہ حاصل ہو جائے۔ چنانچہ مدعیان نبوت میں سے ایک اسود عنسی تھا اس نے مرتد ہوتے ہی علم بغاوت کھڑا کیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو عالیین صدقات تھے ان کو صدقات واپس کرنے کا حکم دیا۔ عمّال ابھی ترّد میں تھے کہ قبائل مذحج و بخران کو لے کر یمن کے مسلمان حاکم شہر بن باذان پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا اور اس کی جو رو سے جبراً نکاح کر کے سارے ملک یمن کا حاکم بن بیٹھا۔ اسود کی بغاوت کی خبر سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وِبر بن یُحْنَس کے ہاتھ حضرت معاذ بن جبلؓ اور اس کے ساتھی مسلمانوں کو خط بھیجا کہ اسود عنسی کا مقابلہ کرو۔ چنانچہ شہر بن باذان کی بیوی کی مدد سے اسود عنسی کو اس کی خوابگاہ میں قتل کیا گیا۔ اور اس کے قتل کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک دن اور ایک رات بعد مدینہ میں پہنچی۔

اسی طرح نبوت کا دعویٰ کرنے والوں میں سجاح بنت حارث بن سوید ایک نصرانیہ عورت بھی تھی۔ وہ بھی دعویٰ نبوت کرتے ہی ایک بڑی فوج ساتھ لے کر مدینہ پر چڑھ آئی۔ راستہ میں اس کو خبر ملی کہ مسیلمہ نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے اس لئے بعد مشورہ یہ رائے ٹھہری کہ مدینہ پر حملہ کرنے سے پہلے مسیلمہ کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے یمامہ کی طرف رخ کیا۔ یہاں اس نے مسیلمہ سے اتحاد کر لیا۔ اور یہ تجویز ٹھہری کہ مسیلمہ اور سجاح کی فوجوں کے ذریعہ کل عرب فتح کیا جائے۔ اس کے بعد خالدؓ نے سجاح کو شکست دی اور سجاح بھاگ کر جزیرہ میں بنی تغلب کے پاس جا چھپی۔

اسی طرح اہل عمان میں سے ایک شخص لقیط بن مالک ازدی نے مرتد ہو کر دعویٰ نبوت کیا۔ اور نبوت کا دعویٰ کرتے ہی جمعیت اکٹھی کر کے علاقہ عمان پر حاکم و متصرف بن بیٹھا اور وہاں کے اصلی عمال جیفر اور عباد کو نکال دیا۔

(تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۹۷۔ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۷۸۔ و تاریخ الکامل جلد ۲ صفحہ ۱۵۶)

ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ ان مدعیان نبوت کو نبوت سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان کا منشاء صرف حکومت کا حاصل کرنا تھا۔ اس لئے یہ سب سلطنت کے باغی تھے اور ان کی اس بغاوت کی وجہ سے ان کے ساتھ قتال کیا گیا۔ پس ان کی مثال سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔ مدعیان نبوت کے ساتھ بھی قتال کی وہی وجہ تھی جو دوسرے مرتدین کے ساتھ قتال کرنے کی وجہ تھی یعنی ان سب نے اسلامی سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مسلمانوں کو قتل کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ عمال کو اپنے علاقوں سے نکال کر خود حاکم اور متصرف بن بیٹھے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے جمعیت اکٹھی کی اور بعض نے مدینہ پر چڑھائی بھی کر دی اور مدینہ کا محاصرہ کیا۔ پس یہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ضروری تھا کہ ان باغیوں سے قتال کیا جاتا۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مرتدین ان جرائم کے مرتکب نہ بھی ہوتے جو ان سے ارتداد کے بعد سرزد ہوئے اور جن کی وجہ سے حفاظت اسلام کیلئے ان سے قتال کرنا واجب ہو گیا اور ان کا جرم صرف اسی قدر ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے تو ان کا یہ اکیلا انکار اس بات کیلئے کافی تھا کہ ان سے قتال کیا جاتا اور اس کی وجہ انہی الفاظ میں موجود ہے جو حضرت ابو بکرؓ نے صحابہؓ کے مشورہ کے وقت فرمائے کہ خدا کی قسم! جب تک یہ تلوار میرے ہاتھ میں ہے میں منکرین زکوٰۃ کے ساتھ ایک عقاب کی کمی کے واسطے بھی جہاد کروں گا۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک بکری کا بچہ بھی بطور زکوٰۃ کے دیتے تھے اگر اب نہ دیں گے تو میں اس کے نہ دینے پر ان سے جہاد کروں گا۔

اس قول کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف روحانی معنوں میں خلیفہ نہ تھے بلکہ وہ بادشاہت میں بھی آپ کے جانشین تھے۔

ملک عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سلطنت اسلامی قائم ہو چکی تھی اور آپ کے جانشین کا یہ فرض اولین تھا کہ وہ اس سلطنت کا انتظام کریں۔ اور جو اموال سرکاری خزانہ میں اس سلطنت کی رعایا کی طرف سے داخل ہوتے تھے ان کی وصولی کا انتظام کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں زکوٰۃ کی وصولی کا انتظام اسلامی حکومت کے ماتحت تھا۔ اسلامی حکومت کی طرف سے اس کے وصول کرنے کے لئے عامل مقرر تھے جو باقاعدہ اموال کی تشخیص کر کے زکوٰۃ اسی رنگ میں وصول کرتے جس طرح دوسری حکومتیں اپنے اپنے محاصل وصول کرتی ہیں۔ یہ امر مومنین کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا تھا کہ جو چاہیں دیں یا جس کو چاہیں دیں یا اگر اس میں غفلت کریں تو ان سے کوئی باز پرس کرنے والا نہ ہو بلکہ یہ سارا انتظام حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ حکومت کے آدمی زکوٰۃ کی تشخیص کرتے اور وہی اس مال کو انتخاب کرتے جو انہوں نے زکوٰۃ کے طور پر لینا ہوتا تھا۔ مصلین زکوٰۃ کو ہدایت تھی کہ وہ لوگوں کا بہترین مال زکوٰۃ کے لئے نہ لیں بلکہ درمیانی درجہ کا مال لیں۔ مثلاً اگر کسی کے ذمہ ایک اونٹ نکلتا تو محصل کو ہدایت تھی کہ وہ ایسا نہ کرے کہ اس شخص کے اونٹوں میں سے بہترین اونٹ چن کر لے بلکہ اس کو یہ ہدایت تھی کہ درمیانی درجہ کا اونٹ انتخاب کرے۔ اس ہدایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس امر میں مال کے مالکوں کا کوئی اختیار نہ تھا بلکہ تمام اختیار اس محصل کے ہاتھ میں تھا جو حکومت کی ہدایت کے ماتحت کام کرتا تھا۔ پس اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ زکوٰۃ کا مال رعایا سے اسی طرح وصول کیا جاتا تھا جس طرح کہ دوسری گورنمنٹیں اپنی اپنی رعایا سے سرکاری مالیہ وصول کرتی ہیں یعنی زکوٰۃ مسلمانوں پر ایک قسم کا ٹیکس تھا جو وہ حکومت اسلامی کو ادا کرتے تھے جس طرح کہ دوسری قومیں اپنے اپنے بادشاہوں کو ٹیکس ادا کرتی ہیں۔

اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یہی زکوٰۃ ہی وہ مال تھا جس کے ذریعہ سلطنت اسلامی اس وقت کے اکثر اخراجات کو پورا کرتی۔ فوجی ضروریات اسی مال میں سے پوری کی

جائیں۔ اسلحہ جنگ۔ سپاہیوں کیلئے سواری اور دیگر سامان جنگ اسی زکوٰۃ کے مال سے مہیا کیا جاتا۔ نیز سلطنت کا فرض ہوتا ہے کہ اپنی رعایا کی بہبودی کا ہر ایک رنگ میں خیال رکھے۔ جو لوگ بے روزگار ہیں یا کمانے کی طاقت نہیں رکھتے ان کی خبر گیری کرے۔ جو لوگ کوئی فن جانتے ہیں مگر ان کے پاس سامان نہیں کہ وہ اس فن سے فائدہ اٹھا سکیں۔ سلطنت کا فرض ہے کہ ان لوگوں کی مدد کرے اور اس طرح اپنے ملک میں حرفت و صنعت و تجارت کو ترقی دے۔ نیز سلطنت کا فرض ہے کہ جہاں سڑکوں اور سڑاؤں کی ضرورت ہے وہاں مسافروں کی سہولت کے لئے سڑکیں تیار کرائے اور مسافروں کے آرام کے لئے سرائیں بنوائے۔ دریاؤں اور ندیوں پر پل تیار کرائے۔ اور یہ سارے اخراجات اس قسم کے ہیں کہ جن کے پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا ٹیکس مسلمانوں پر لگایا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات حکومت کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر ان کی رعایا میں سے کوئی فرد بعض مجبوریوں کی وجہ سے قرض کے بوجھ نیچے دب گیا ہے یا اس پر کوئی ایسا تادان پڑ گیا ہے جو اس کی طاقت سے بڑھ کر ہے تو ایسے شخص کی امداد کرے۔ اور یہ غرض بھی زکوٰۃ کے مال سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اسلامی سلطنت چونکہ محض ایک دنیوی سلطنت نہیں اس لئے اس کے فرائض میں اشاعت اسلام بھی داخل ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ دین اسلام میں داخل ہونے والوں کی مدد کرے اور ان کی تالیف قلب کے لئے مال خرچ کرے۔ اور یہ ضرورت بھی زکوٰۃ کے مال سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔

جو ضروریات میں نے اوپر بیان کی ہیں اور جو ہر ایک اسلامی سلطنت کو پیش آتی ہیں یہ وہی مصارف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے اموال کے لئے اپنی کتاب قرآن شریف میں مقرر فرمائے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَىٰ قُلُوبُهُمْ

وَفِي الرِّقَابِ وَالْغُرَمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ قَرِيصَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (التوبة: 60)

صدقات تو صرف فقراء اور مساکین کے لئے ہیں اور ان کے لئے جو ان صدقات کے جمع کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ نیز ان کے لئے جن کے دلوں کو اپنے ساتھ جوڑنا مطلوب ہو اور اسی طرح قیدیوں اور قرض داروں کے لئے اور ان کے لئے جو اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں اور مسافروں کے لئے یہ فرض اللہ کا مقرر کردہ ہے اور اللہ بہت جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں صدقات سے مراد زکوٰۃ ہے اور اس کے مصرف وہی بیان کئے گئے ہیں جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں۔ اور یہ تمام مصارف ایسے ہیں جو ہر ایک اسلامی سلطنت کا فرض ہے کہ وہ ان کا انتظام کرے۔ اور یہ تمام ضروریات ایسی ہیں جو ایک اسلامی سلطنت کو پیش آتی ہیں۔ پس ہر ایک اسلامی سلطنت کا حق ہے کہ رعایا سے زکوٰۃ کا مال مندرجہ بالا مصارف کے لئے وصول کرے۔

فریضہ زکوٰۃ اور فریضہ صلوٰۃ میں یہ فرق ہے کہ مؤخر الذکر کا تعلق صرف افراد سے ہے اور اول الذکر کا تعلق محض افراد سے نہیں بلکہ حکومت کو بھی اس میں دخل ہے۔ اور اس کی ادائیگی کا انتظام کرنا حکومت کے ذمہ ہے۔ بلکہ اس آیت کریمہ میں حکومت کے لئے یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ وہ اس کی وصولی کے لئے الگ محکمہ مقرر کرے اور اس محکمہ کے تمام اخراجات اور کارکنوں کی تنخواہیں اور سفر خرچ وغیرہ زکوٰۃ کی مد سے ادا کئے جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ کی نسبت فرماتے ہیں:-

”تَوَخَّذْ مِنْ أَعْيَاءِ هُمْ وَتُرِّدْ إِلَىٰ فَقْرَاءِ هُمْ.“

یعنی یہ ایک ٹیکس ہے جو دولت مندوں سے وصول کر کے فقراء پر خرچ کیا جاتا ہے۔ یہاں تَوَخَّذْ اور تُرِّدْ کے الفاظ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ حکومت کا فرض ہے کہ

زکوٰۃ کا مال صاحبِ نصاب لوگوں سے لے کر فقراء کیلئے اور ان کے مصارف کے لئے جن کی تفصیل قرآن شریف میں بیان کی گئی ہے خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً کہہ کر نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ آپ کے جانشینوں اور اسلامی حکومتوں کے امراء کو حکم دیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کا مال وصول کریں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وصولی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور تمام علاقوں میں اپنی طرف سے عامل مقرر کئے۔ جن کا یہ فرض تھا کہ وہ زکوٰۃ کے مال کو وصول کریں اور آپ کے زمانہ میں زکوٰۃ ٹھیک اسی طرح وصول کی جاتی تھی جس طرح آج کل تمام حکومتیں اپنی اپنی رعایا سے مختلف قسم کے ٹیکس اور محاصل وصول کرتی ہیں۔ اور چونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ کے جانشین تھے اس لئے ان کا بھی یہ فرض تھا کہ وہ ٹھیک اسی طرح زکوٰۃ کا مال مسلمانوں سے وصول کریں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وصول فرمایا کرتے تھے۔ اسی لئے حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زکوٰۃ میں ایک عقال بھی دیا کرتا تھا اور اب دینے سے انکار کرے گا تو میں تلوار کے زور سے اس سے وصول کروں گا۔ پس اس کی وصولی اسی طرح تھی جس طرح کہ حکومتیں اپنی اپنی رعایا سے اپنے محاصل وصول کرتی ہیں۔ اور اگر کوئی رعایا میں سے ایسے محاصل کو ادا کرنے سے انکار کرے تو سلطنت اپنی تلوار کے زور سے ان محاصل کو وصول کرتی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے وقت میں جن مسلمانوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ان کی ایسی ہی مثال ہے جیسا کہ کوئی شخص رعایا میں سے سرکاری مالیہ ادا کرنے سے انکار کرے۔ اور حضرت ابو بکرؓ کا فرض تھا کہ وہ تلوار کے زور سے ایسے لوگوں سے زکوٰۃ وصول فرماتے۔ وہ لوگ ایسے ہی باغی تھے جیسا کہ وہ لوگ سلطنت کے باغی سمجھے جاتے ہیں جو اپنی حکومت کو سرکاری ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ پس اگر حضرت ابو بکرؓ نے ایسے مسلمانوں سے قتال کیا جن کا سوائے اس کے اور کوئی جرم نہ تھا کہ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو اس سے ہمارے مخالفوں کو کوئی فائدہ نہیں

پہنچتا۔ کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کا قتال ایسے لوگوں کے خلاف تھا جو سلطنت سے باغی تھے۔

یہ درست ہے کہ بعض صحابہؓ نے خصوصاً حضرت عمرؓ نے مشورہ کے وقت حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کس طرح ایسے لوگوں سے جہاد کر سکتے ہیں جو لا الہ الا اللہ کہنے والے ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں سے کبھی جہاد نہیں کیا۔ مگر حضرت عمرؓ کا یہ سوال ایسا ہی تھا جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک دوسرے موقع پر خود حضرت عمرؓ سے سوال کیا۔ جب حضرت عمرؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یمامہ کی لڑائی میں بہت سے قاری شہید ہو گئے ہیں۔ اور اگر اسی طرح کی اور لڑائیاں پیش آئیں تو خوف ہے کہ قرآن کے حُفاظ کے شہید ہو جانے سے قرآن شریف کے بعض حصے معدوم نہ ہو جاویں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس وقت قرآن شریف کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا جاوے اور اس کو ایک جگہ لکھ کر محفوظ کر لیا جاوے۔ اس وقت حضرت ابو بکرؓ نے بھی حضرت عمرؓ سے ایسا ہی سوال کیا جیسا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے مانعین زکوٰۃ کے سوال کے موقع پر کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں کس طرح ایسا کام کر سکتا ہوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ پس یہ دونوں سوال ایک ہی رنگ کے ہیں اور ان کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے دشمنوں سے واسطہ پڑا جو مسلمانوں کو امن سے زندگی بسر کرنے نہیں دیتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو دکھ دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ تلوار کے ساتھ اسلام کا نام و نشان مٹادیں۔ آپؐ نے ایسے دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ملک میں امن و امان قائم کر کے ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور شرائع اسلام کو نافذ کیا۔ اور دوسری شرائع کے درمیان آپؐ نے زکوٰۃ کا فریضہ بھی تمام اہل نصاب پر قائم کیا اور اس کی وصولی کا انتظام کیا۔ آپؐ کے وقت میں کوئی ایسی مسلمان کہلانے والی قوم نہ اٹھی جو فریضہ زکوٰۃ کے ادا کرنے سے انکار کرے۔ اس لئے آپؐ کو کسی ایسی قوم سے قتال کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ یہ ضرورت

پہلی دفعہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پیش آئی۔ جو مال کا حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر مقرر کیا اور جس کی وصولی کا انتظام آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور جس کو وہ حکومت اسلامی کے بیت المال میں داخل فرما کر حکومت کی ضروریات کے لئے خرچ فرماتے تھے۔ آپ کی وفات پر آپ کے جانشین کو ان محاصل کے دینے سے انکار کیا گیا۔ اس لئے اس کا فرض تھا کہ وہ اپنی حکومت کے زور سے سلطنت اسلامی کی رعایا سے ان محاصل کو وصول کرتا۔ اور اگر اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے وہ بھی کبھی اس امر کی اجازت نہ دیتے کہ لوگ آپ کے عمال کو زکوٰۃ کا مال ادا نہ کریں۔

علاوہ ازیں حکومت کا ایک کام احتساب بھی ہے یعنی جو لوگ اسلام میں داخل ہو کر شرایع اسلام کی پابندی سے کنارہ کشی اختیار کریں حکومت اسلامی کا فرض ہے کہ ان کے خلاف تخریری تدابیر عمل میں لائے اور ان کو احکام شریعت کی خلاف ورزی سے روکے۔ پس احتسابی پہلو سے بھی حضرت ابو بکرؓ کا فرض تھا کہ جو لوگ اپنے تئیں مسلمان کہلاتے تھے اور زکوٰۃ دینے سے جو اسلام کے ارکان میں داخل ہے انکار کرتے تھے ان کو مجبور کرتے کہ وہ اسلام کے اس فریضہ کو ادا کریں۔

اس جگہ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ امیر کاتب نے بھی احمدی جماعت کے افراد کو احتساباً قتل کیا ہے کیونکہ احمدی جماعت نے ارکان اسلام میں سے کسی رکن کا انکار نہیں کیا اور نہ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی کی اور نہ ان کو مسلمان سمجھ کر سزا دی گئی۔ بلکہ ان کو اسلام سے خارج قرار دے کر قتل مرتد کے فرضی حکم کے ماتحت سنگسار کیا۔ اس لئے یہ عذر یہاں درست نہیں ہو سکتا کہ ان کے خلاف احتساباً ایسی کارروائی کی گئی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تاریخ سے اوّل تو کسی ایسی قوم کا پتہ نہیں چلتا جنہوں نے صرف منع زکوٰۃ پر اکتفا کیا ہو بلکہ جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے جن جن قوموں کے خلاف حضرت ابو بکرؓ نے فوج کشی کا حکم دیا وہ سب کے سب کھلم کھلا سلطنت اسلامی سے

باغی ہو گئے تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عُمال کو اپنے اپنے علاقہ سے نکال دیا۔ جو لوگ ان میں سے اسلام پر قائم رہے ان کو قتل کیا۔ بعض نے مدینہ پر چڑھائی کی اور سب اپنے اپنے علاقہ پر متصرف ہو کر اور فوجیں جمع کر کے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس لئے اسلام اور حکومتِ اسلام کی حفاظت کے لئے ان کا مقابلہ کرنا ایسا ہی ضروری ہو گیا تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مشرکین سے جنگ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اور اگر کوئی قبیلہ ایسے بھی تھے جن کا جرم صرف منع زکوٰۃ تک محدود تھا اور وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے تو ان کے ساتھ بھی قتال ضروری تھا۔ کیونکہ ان کی مثال ایسی ہی تھی جیسے ایک حکومت کی رعایا اپنی حکومت کو سرکاری مالیہ ادا کرنے سے انکار کر دے۔ اس لئے ضروری تھا کہ تلوار کے زور سے ان سے زکوٰۃ وصول کی جاوے۔ علاوہ ازیں احتساباً بھی حکومت اسلامیہ کا فرض تھا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے مگر زکوٰۃ کے ادا کرنے سے انکار کرتے تھے ان کے خلاف تحدیری کارروائی کرے اور ان کو شرائعِ اسلام کی پابندی پر مجبور کرے۔

اب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد کے متعلق صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہے جس کا جواب دے کر میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد کو ختم کرتا ہوں۔ قتل مرتد کے دعویداروں نے اپنے دعویٰ کی تائید میں یہ بات بھی پیش کی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک مرتدہ امّ قرفہ کو قتل کیا۔

مگر حامیانِ قتلِ مرتد یہ سن کر مایوس ہوں گے کہ یہاں بھی خالی ارتداد کا سوال نہ تھا۔ اور اس کے قتل کی یہ وجہ نہ تھی کہ وہ مرتد ہو گئی تھی بلکہ اس کے قتل کی یہ وجہ تھی کہ وہ ایک محاربہ عورت تھی جو لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اکساتی تھی اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکاتی تھی۔ چنانچہ مبسوط جلد 10 صفحہ 110 پر لکھا ہے:-

”وأمّ قرفة كان لها ثلاثون ابناً و كانت تحرضهم على قتال

المسلمين و في قتلها كسر شوكتهم.“

یعنی ام قرفہ کے تیس بیٹے تھے اور وہ ان کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ابھارتی تھی۔ اور اس کے قتل میں یہ فائدہ تھا کہ اس طرح اس کے بیٹوں کی شوکت ٹوٹ جاتی تھی۔ پس ام قرفہ کا قتل بھی اس کے ارتداد کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس لئے تھا کہ وہ محاربتھی اس لئے اس کا قتل تعلیم قرآن کے عین مطابق تھا۔

حضرت ابو بکرؓ کے جنگوں کی طرح حضرت علیؓ کے وقت کے بعض جنگوں سے بھی قتل مرتد کے دعویداروں نے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے چنانچہ یہ کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے خارجیوں کو قتل کیا جو مرتد تھے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے۔ لیکن حامیان قتل مرتد کے لئے یہ افسوس کا مقام ہے کہ یہاں بھی ان کی غرض پوری نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ تاریخی واقعہ ہے کہ خارجیوں سے جو لڑائی ہوئی وہ بھی بغاوت اور فتنہ کو فرو کرنے کے لئے تھی نہ کہ محض چند مسائل کے اختلاف کی وجہ سے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل واقعات سے ظاہر ہے:-

(۱) حضرت علیؓ نے ان سے گفتگو کرتے وقت فرمایا۔

”فقال لهم لكم علينا ثلاثة ان لا نمنعكم من المساجد ولا من رزقكم من الفئ ولا نبدءكم بقتال ما لم تحدثوا فسادا فخرجوا شيئاً بعد شئ الى ان اجتمعوا بالمدائن فراسلهم في الرجوع فاصروا على الا متناع حتى يشهد نفسه بالكفر لرضاه بالتحكيم ويتوب ثم راسلهم ايضا فأرادوا قتل رسولهم ثم اجتمعوا على ان من لا يعتقد معتقدهم يكفر ويباح دمه وماله واهله وانتقلوا الى الفعل فاستعرضوا الناس فقتلوا من اجتاز بهم من المسلمين ومرّ عليهم عبد الله بن حباب الارت وكان واليا لعلّي على بعض تلك البلاد و

معہ سریتہ وہی حامل فقتلوہ وبقروا بطن سریتہ عن ولد فبلغ علیاً
فخرج الیہم فی الجیش الذی کان ہیّہ للخروج فواقع بہم
بالنہروان۔“

(فتح الباری جلد 12 صفحہ 251)

یعنی حضرت علیؑ نے ان سے کہا تھا کہ ہم تین باتیں اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ اول یہ کہ ہم تم کو مسجدوں سے نہیں روکیں گے۔ غنیمت کے مال سے تم کو حصہ دیں گے اور تمہارے ساتھ جنگ کی ابتدا نہ کریں گے جب تک کہ تم خود فساد نہ کھڑا کرو۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ وہاں سے نکل گئے اور انہوں نے مدائن میں اجتماع کیا۔ وہاں حضرت علیؑ نے اُن کو پیغام بھیجا کہ وہ واپس آ جاویں مگر انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ ہم واپس نہیں آئیں گے جب تک کہ تم اپنے متعلق یہ گواہی نہ دو کہ میں تحکیم پر راضی ہو جانے کی وجہ سے کافر ہو گیا اور پھر توبہ نہ کرو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوبارہ پیغام بھیجا۔ اس دفعہ انہوں نے چاہا کہ آپ کے ایلچی کو قتل کر دیں پھر انہوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جو شخص ان کے عقیدے کو قبول نہیں کرتا وہ کافر ہے اور اس کا خون بہانا اور اس کا مال لوٹ لینا اور اس کے گھر والوں کو قتل کر دینا مباح ہے۔ اور انہوں نے یہ فیصلہ ہی نہ کیا بلکہ اس پر عملدرآمد بھی شروع کر دیا۔ وہ لوگوں کو روک لیتے اور جو لوگ ان کے پاس سے گزرتے ان کو قتل کر دیتے۔ ان کے پاس سے اتفاقاً عبداللہ بن خطابؓ کا گزر ہوا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ان ممالک میں سے بعض پر حاکم مقرر تھے اور ان کے ساتھ ان کی لونڈی تھی جو حاملہ تھی۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن خطابؓ کو قتل کر دیا اور ان کی لونڈی کا پیٹ چیر کر اس کا بچہ نکال دیا۔ جب یہ خبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو وہ لشکر لے کر ان کی طرف نکلے اور نہروان کے مقام پر اُن پر حملہ کیا۔

مندرجہ بالا واقعات سے جو سب تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں صاف ظاہر ہے

کہ حضرت علیؑ نے خوارج کے ساتھ ان کے عقائد کی وجہ سے لڑائی نہیں کی بلکہ ان کی بغاوت اور فساد کی وجہ سے ان سے لڑائی کی۔

(۲) تاریخ الکامل اور دوسری کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عبداللہ بن خباب کے قتل کی خبر پہنچی اور نیز یہ کہ وہ لوگوں کو روک لیتے ہیں۔ تو حضرت علیؑ نے اس امر کی تحقیق کے لئے الحرث بن مرۃ العبیدی کو بھیجا۔ اور جب وہ ان کے پاس اس امر کے دریافت کرنے کے لئے آیا تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ایلیچی کو قتل کر دیا۔ چنانچہ تاریخ الکامل جلد ۳ صفحہ ۱۴۸ پر لکھا ہے۔

”فاض جمعوه (ای عبداللہ بن خباب) فذبحوه فسال دمہ فی الماء واقبلوا الی المرأة فقالت انا امرأة الا تتقون. فبقروا بطنها وقتلوا ثلاث نسوة من طی و قتل ام سنان الصیادیة. فلما بلغ علیا قتلهم عبداللہ بن خباب واعترضهم الناس بعث الیهم الحرث بن مرۃ العبیدی لیأتیهم وینظر ما بلغه عنهم ویکتب به الیه ولا یکتب منهم فلما دنا منهم یسألهم قتلوه.“

یعنی خارجیوں نے عبداللہ بن خباب کو لٹایا اور اس کو ذبح کیا۔ اور اس کا خون بہہ کر پانی میں مل گیا۔ پھر وہ اس عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا کہ میں تو ایک عورت ہوں کیا تم خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے؟ انہوں نے اس کا پیٹ چیر دیا۔ اور بنی طمی کی تین عورتیں قتل کر دیں اور ام سنان الصیادیہ کو قتل کر دیا۔ جب حضرت علیؑ کو یہ خبر پہنچی کہ انہوں نے عبداللہ بن خباب کو قتل کر دیا ہے اور یہ کہ وہ لوگوں کو راستہ میں روک لیتے ہیں اور ان کو قتل کر دیتے ہیں تو انہوں نے الحرث بن مرۃ العبیدی کو بھیجا۔ کہ وہ ان کے پاس جائیں اور دیکھیں جو خبریں ان کو پہنچتی ہیں وہ کہاں تک درست ہیں اور ان کو صحیح صحیح حالات لکھ کر بھیجیں۔ جب الحرث بن مرۃ العبیدی ان سے پوچھنے کے لئے ان کے

قریب ہوئے تو انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ فوج لے کر اس مقام پر پہنچے تو انہوں نے جاتے ہی حملہ نہیں کر دیا بلکہ حملہ کرنے سے پہلے ان کو کہلا بھیجا کہ تم ان لوگوں کو ہمارے حوالہ کر دو جنہوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا ہے تاہم ان کو قتل کر دیں۔ ہم دوسروں سے فی الحال درگزر کرتے ہیں اور ان کی مہلت دیتے ہیں تا شاید ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو جائے اور ان کی حالت سدھر جائے۔ مگر انہوں نے جواب دیا کلنا قتلہم و کلنا مستحلّ لدماء کم و دمائہم یعنی ہم سب نے ان کو قتل کیا اور ہم سب تمہارے خونوں کا اور ان کے خونوں کا بہانا جائز سمجھتے ہیں۔

مندرجہ بالا حوالجات سے ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے خوارج سے لڑائی نہیں کی بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ملک میں فتنہ و فساد برپا کر دیا اور مسلمان مردوں اور عورتوں کو قتل کر دیا۔ اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والی اور اس کی لوٹڈی کو قتل کر دیا اور نیز آپ کے ایلچی کو قتل کیا۔ اور جب حضرت علیؑ نے ان سے مطالبہ کیا کہ جن آدمیوں کو تم نے قتل کیا ہے ان کے قاتل میرے حوالہ کر دو۔ تو انہوں نے جواب دیا ہم سب ان کے قاتل ہیں اور ہم نہ صرف ان کا خون بہانا جائز سمجھتے ہیں بلکہ تمہارا خون بہانا بھی جائز سمجھتے ہیں۔

علاوہ ازیں خوارج کی مثال حامیان قتل مرتد کے لئے اس وجہ سے بھی مفید نہیں کہ اکثر علماء کا اتفاق ہے کہ خارجی لوگ مرتد نہیں بلکہ فرقة من فرق المسلمین کا حکم رکھتے ہیں۔ فتح الباری جلد 12 صفحہ 247 میں لکھا ہے:-

”قال الخطابی اجمع علماء الاسلام علی ان الخوارج مع ضلالہم فرقة من فرق المسلمین واجازوا منا کحتہم واکل ذبائحہم وانہم لایکفرون ما داموا متمسکین باصل الاسلام۔“

یعنی خطابی کہتا ہے کہ علماء اسلام نے اتفاق کیا ہے کہ خارج باوجود اپنی گمراہی کے مسلمان فرقوں میں سے ایک فرقہ ہیں اور ان کے ساتھ مناکحت جائز ہے اور جب تک وہ اصل اسلام پر قائم ہیں وہ کافر نہیں کہلائے جاسکتے۔
پھر اسی کتاب کے صفحہ 268 پر لکھا ہے:-

”قال ابن بطل ذهب جمهور العلماء الى ان الخوارج غير خارجين
من جملة المسلمين.“

یعنی ابن بطل نے کہا ہے کہ جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ خوارج مسلمانوں کی جماعت سے خارج نہیں۔

تفسیر کبیر جلد 3 کے صفحہ 614 پر لکھا ہے:-

”ان اسم المرتدّ انما يتناول من كان تاركا للشرائع الاسلامية
والقوم الذين نازعوا عليا ما كانوا كذلك في الظاهر وما كان احد
يقول انه انما يحاربهم لاجل انهم خرجوا من الاسلام وعلى لم
يسمهم البتة بالمرتدين.“

یعنی مرتد کا نام اس شخص پر اطلاق پاتا ہے جو شرائع اسلامی کو ترک کر دے۔ اور جس قوم نے حضرت علیؑ کی مخالفت کی وہ ظاہر میں شرائع اسلامی کے تارک نہ تھے۔ اور کوئی شخص یہ نہیں کہتا تھا کہ حضرت علیؑ اس لئے ان سے جنگ کرتے ہیں کہ وہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں اور حضرت علیؑ نے ہرگز ان کا نام مرتد نہیں رکھا۔

منهاج السنة مصنف شیخ ابن تیمیہ جلد 3 کے صفحہ 61، 62 پر لکھا ہے:-

”قال الاشعري وغيره اجمعت الخوارج على تكفير علي بن ابي
طالب.... ومع هذا فقد صرح علي بن ابيهم مؤمنون ليسوا كفارا ولا
منافقين..... ومما يدل على ان الصحابة لم يكفروا الخوارج

انہم كانوا يصلون خلفهم وكان عبد الله بن عمرو وغيره من الصحابة كانوا يصلون خلف نجدة الحرورى وكانوا أيضا يحدثونهم ويفتونهم ويخاطبونهم كما يخاطب المسلم المسلم.... وما زالت سيرة المسلمين على هذا ما جعلوهم مرتدّين كالذين قاتلهم الصديق رضى الله عنه.... ومع هذا فالصحابه والتابعون لهم باحسان لم يكفروا هم ولا جعلوهم مرتدّين ولا اعتدوا عليهم بقول ولا فعل بل اتقوا الله فيهم وساروا فيهم سيرة العادلة“.

یعنی اشعری وغیرہ نے کہا کہ حضرت علیؑ کی تکفیر پر تمام خوارج کا اجتماع ہے..... مگر باوجود اس کے حضرت علیؑ نے بالصراحت بیان کیا ہے کہ وہ مومن ہیں کافر نہیں اور نہ منافق ہیں.... اور اس بات کی ایک دلیل کہ صحابہؓ خوارج کو کافر نہیں کہتے تھے یہ ہے کہ وہ خوارج کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے صحابہ نجدۃ الحروری کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور نیز ان کو احادیث سناتے تھے اور ان کو فتویٰ دیتے تھے اور ان سے اسی طرح خطاب کرتے تھے جس طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے مخاطب ہوتا ہے.... اور مسلمان ان سے ہمیشہ ایسا ہی معاملہ کرتے رہے ہیں انہوں نے ان مرتدین کی طرح ان کو نہیں سمجھا جن سے حضرت صدیقؓ نے قتال کیا.... صحابہؓ اور تابعین نے ان کو کافر قرار نہیں دیا اور نہ ان کو مرتد ٹھہرایا اور نہ ان پر زبان سے یا ہاتھ سے کسی طرح کی زیادتی کی بلکہ ان کے بارے میں تقویٰ سے کام لیتے رہے اور ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کیا۔

اس تمام بحث سے یہ امر پتہ چلتا ہے کہ قتل مرتد کے دعویداروں کا خوارج کے واقعہ سے اپنے دعویٰ کی تائید میں استدلال کرنا ایسا ہی باطل ہے جیسا کہ ان

کے دوسرے تمام استدلال باطل ہیں۔ خوارج کو نہ حضرت علیؑ نے مرتد قرار دیا اور نہ دوسرے صحابہؓ نے۔ اور حضرت علیؑ نے ان کے اعتقادات کی وجہ سے ان کیساتھ لڑائی نہیں کی بلکہ ان کی خونریزی کی وجہ سے۔

دوسرا واقعہ جو قتل مرتد کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے بعض زنداقہ کو جو ان کو خدا کہتے تھے آگ میں ڈال کر جلایا اور اس کی تائید میں مندرجہ ذیل روایت پیش کی جاتی ہے۔ ”عن عكرمة قال اتى عليّ زنداقه فاحرقهم“ یعنی حضرت علیؑ زنداقہ کے پاس گئے اور ان کو آگ میں ڈال کر جلا دیا۔ اس روایت کی بناء عکرمہ کے بیان پر ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور اس میں حضرت علیؑ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کے خلاف کہ لا تعذبوا بعداب اللہ یعنی جس چیز کے ساتھ اللہ تعالیٰ عذاب دیتا ہے اس کے ساتھ تم کسی کو عذاب نہ دو۔ بعض آدمیوں کو اس لئے آگ میں ڈال کر جلا دیا کہ وہ ان کو خدا مانتے تھے۔ چنانچہ اسی روایت میں عکرمہ بیان کرتا ہے کہ جب یہ خبر حضرت ابن عباسؓ کو پہنچی تو انہوں نے کہا کہ اگر میں ہوتا تو ان لوگوں کو ہرگز نہ جلاتا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کسی کو آگ کے ساتھ عذاب دیا جاوے۔ پس اگر اس روایت کو درست مانا جاوے تو ماننا پڑتا ہے کہ حضرت علیؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نعوذ باللہ خلاف ورزی کی اور یہ امر ہم کبھی بھی حضرت علیؑ جیسے انسان کے لئے ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ حضرت علیؑ بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ اس وقت حضرت ابن عباسؓ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے جبکہ حضرت علیؑ کو اللہ تعالیٰ نے شرف قبول اسلام بخشا اور آپ نے خود حضرت علیؑ کی پرورش اور تربیت فرمائی۔ اور جو قرب حضرت علیؑ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاصل رہا وہ کبھی حضرت ابن عباسؓ کو حاصل نہیں ہوا۔ پس ہم اس بات کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے کہ حضرت علیؑ حضرت ابن عباسؓ سے اپنے علم

میں کم تھے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صرف دس سال کے تھے۔ حضرت علیؓ وہ ہیں جن کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”انما مدینة العلم وعلیٰ بابہا“ پس حضرت علیؓ کی نسبت یہ خیال کرنا کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لا تعدبوا بعذاب اللہ کا علم نہ تھا اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی صریح خلاف ورزی میں کئی آدمیوں کو آگ میں جلا دیا ایک خیال باطل ہے۔

یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ کو بدنام کرنے کے لئے مختلف قسم کے الزام ان پر لگائے گئے اور یہ بھی انہی الزامات میں سے ایک الزام ہے اور ہر ایک مومن کا فرض ہے کہ حضرت علیؓ پر نیک ظن کر کے ایسے الزامات سے ان کو پاک ٹھہرائے اور جو شخص اس روایت کا بانی ہے اس کے حالات اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ یہ روایت ایک اتہام ہے جو حضرت علیؓ پر لگایا گیا۔ میزان الاعتدال میں اس کی نسبت لکھا ہے کہ عکرمہ کے بارے میں حافظہ کی وجہ سے نہیں بلکہ خوارج کی رائے اختیار کرنے کی وجہ سے کلام ہے۔ سعید بن جبیر اگرچہ اسے اپنے سے اعلم بتاتے ہیں مگر ساتھ ہی ابن مسیب اس کو کذاب بھی کہتے ہیں۔ عبد اللہ بن الحارث کہتا ہے کہ میں علی بن عبد اللہ بن عباس کے پاس گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ عکرمہ باب الحش کے پاس باندھا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ میاں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ کہنے لگے کہ یہ خبیث میرے باپ پر افترا کرتا ہے۔ حماد بن زید جب مرنے لگے تو فرمایا کہ عذاب الہی سے ڈر کر کہتا ہوں کہ عکرمہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشابہات اس لئے اتاری ہیں کہ ان کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرے۔ محمد بن سیرین اس کو کذاب کہتا ہے۔ عکرمہ جب بصرہ میں آیا تو اس کے پاس یونس اور ایوب اور سلیمان التیمی ملنے کے لئے آئے۔ اندر سے گانے کی آواز آرہی تھی۔ سن کر کہا کہ ملعون کیا ہی خوب گاتا ہے۔ پھر یونس اور سلیمان اس کے پاس کبھی نہیں آئے۔ ابن المدینی کہتے ہیں کہ عکرمہ ایک مسجد کے

دروازہ پر کھڑا ہو کر کہتا تھا کہ اس میں سب کافر ہیں۔ اباحت کی رائے رکھتا تھا۔ یحییٰ بن بکر کہتا ہے کہ مغرب میں خارجی عکرمہ کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ابن المدینی کہتا ہے کہ عکرمہ کی رائے نجدہ حروری سے ملتی تھی۔ مصعب الزبیری کہتے ہیں کہ عکرمہ خوارج کی رائے رکھتا ہے۔ متولی مدینہ نے اس کو طلب کیا مگر وہ داؤد بن حصین کے گھر چھپا رہا۔ مرنے تک نہ نکلا اور انہوں نے کہا کہ عکرمہ نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ حضرت ابن عباس خوارج کی رائے رکھتے تھے۔ سلیمان بن معبد کہتے ہیں کہ عکرمہ اور کثیر ایک ہی دن مرے مگر لوگوں نے کثیر کا جنازہ پڑھا۔ عکرمہ کا جنازہ نہ پڑھا۔

ناظرین غور فرمادیں کہ اس حدیث کے راوی عکرمہ کی نسبت کس کثرت سے یہ شہادت دی گئی ہے کہ وہ خوارج کی رائے رکھتا تھا بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ مغرب میں خوارج اُسی کی وجہ سے پیدا ہوئے اور یہ کہ حضرت ابن عباسؓ پر بھی افترا کرنے سے باز نہیں رہتا تھا اور ان کی نسبت بھی یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ خوارج کی رائے رکھتے تھے۔ پس ایسے شخص کی روایت حضرت علیؓ کے خلاف کس طرح صحیح تسلیم کر سکتے ہیں؟ روایت کو غور سے پڑھو اس سے صاف راوی کا یہ منشاء معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ پر اس امر کا الزام لگائے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بعض لوگوں کو آگ میں جلایا۔ کیونکہ وہ اپنی روایت میں بیان کرتا ہے کہ جب یہ خبر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے سنی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو ان لوگوں کو آگ میں نہ جلاتا۔ کیونکہ ایسا فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہے۔ آپؐ نے فرمایا ”لا تعدّبوا بعداب اللہ“۔ پس ہم عکرمہ جیسے راوی کی بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے مقدس انسان پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ آپؐ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی خلاف ورزی کی اور ایک ایسا کام کیا جو شریعت کی حد سے خارج ہے اور یہ ایسا فعل ہے کہ خواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے خلاف ارشاد نہ بھی ہوتا۔ تب بھی خود علی رضی اللہ عنہ ایسی پاکیزہ فطرت

کے انسان تھے کہ ان کی اپنی فطرت طبعی طور پر ایسے فعل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی جو ان کے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند تھا۔

ان زنادقہ کی مثال ایک اور پہلو سے بھی قتل مرتد کے حامیوں کے لئے مفید نہیں۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان لوگوں کو دراصل حضرت علیؓ کو خدا بنانے سے کوئی غرض نہ تھی بلکہ اس کا اصل منشاء مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالنا تھا۔ اس پارٹی کا سرغنہ عبد اللہ بن سبأ الحمیری یہودی تھا۔ عبد اللہ بن سبأ اور اس کے ساتھیوں کا مختصر حال میں تاریخ کی کتابوں سے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ تاناظرین کو معلوم ہو کہ یہ کیسے خطرناک لوگ تھے۔

ابن حزم کی مشہور تصنیف الفصل فی الملل و الاہواء و النحل کی جلد 2 صفحہ 115 پر لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جو حملہ کیا گیا اور ان کو شہید کیا گیا اس حملہ کا بانی مبنائی یہی ملعون ابن سبأ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہنے والے اسی کے اتباع تھے۔ اس کی نسبت کتاب مذکور کا فاضل مصنف لکھتا ہے فأنه لعنه الله أظھر الاسلام لكيد أهله یعنی اس ملعون نے اپنے تئیں مسلمان ظاہر کیا اور اس کی نیت یہ تھی کہ مسلمانوں میں فتنہ و فساد پیدا کرے۔ الملل والنحل شارستانی بر حاشیہ الفصل لابن حزم کی جلد 2 صفحہ 11 پر لکھا ہے کہ ابن سبأ نے حضرت علیؓ کو کہا انت انت یعنی أنت الإله یعنی تو ہی خدا ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے اس کو مدائن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ تاریخ طبری جلد 6 صفحہ 3191 پر لکھا ہے کہ واقعہ جمل کے وقت حضرت عائشہؓ نے صلح کے لئے کعب کو قرآن شریف دے کر حضرت علیؓ کے لشکر کی طرف بھیجا۔ حضرت علیؓ کی فوج کے آگے آگے سبائی لوگ تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت عائشہ اور حضرت علیؓ کے مابین صلح ہو اس لئے جب کعب قرآن شریف لے کر آئے اور صلح کے لئے بلایا تو سپاہیوں نے ان کو قتل کر دیا اور حضرت عائشہؓ کے ہودہ پر تیر برسوں شروع کر دئے تا مسلمانوں میں لڑائی شروع ہو جائے اور فتنہ و فساد کی آگ بجھنے نہ پائے۔

مندرجہ بالا حوالہ جات سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عبداللہ ابن سبأ اور اس کے اتباع کیسی خطرناک قوم تھی اور یہی وہ لوگ تھے جو حضرت علیؓ کو خدا کہتے تھے اور اس کی پارٹی کے لوگوں کو مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا مگر وہ لوگ پھر بھی اپنی شرارت سے باز نہ آئے۔

اور جن لوگوں کا ذکر عکرمہ کی روایت میں ہے کہ وہ اسی پارٹی کے آدمی تھے پس اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پارٹی کے بعض افراد کو کسی رنگ میں قتل کیا تو وہ ان کے ارتداد کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس لئے تھا کہ یہ ایک مفسدوں کی جماعت تھی جن کو نہ حضرت علیؓ سے محبت تھی نہ اسلام سے بلکہ جو دراصل مسلمانوں کی سماج کے دشمن تھے اور ان کے عصا کو توڑنا چاہتے تھے۔

پس ان کی مثال سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر کوئی شخص اسلام ترک کر کے ہندو یا مسیحی ہو جاوے تو اس کو قتل کر دیا جاوے۔ ابن سبأ اور اس کے ساتھیوں کی مثال محض مرتدین پر ہرگز چسپاں نہیں ہو سکتی۔!

اسی طرح خلفائے راشدین کے عہد میں کوئی بھی ایسی مثال نہیں مل سکے گی جس کی نسبت قتل مرتد کے حامی یہ ثابت کر سکیں کہ فلاں صورت میں محض ارتداد اور خالص ارتداد کے لئے کسی مرتد کو محض مذہبی بناء پر قتل کیا۔ تمام تاریخی مرتدین کی نسبت تاریخ بیان کر رہی ہے کہ ان سے قتال خالص ارتداد کی وجہ سے نہیں کیا گیا۔ اور اگر بالفرض کوئی ایسی روایت بھی ہو جس کے متعلق کوئی تاریخی ثبوت نہ مل سکے تو ایسے شاذ و نادر واقعات کو کثرت کے تابع کرنا پڑے گا اور یہی نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ یہ صورت بھی عام صورت کے مطابق ہے۔ ہر ایک واقعہ ہمیں پوری تفصیل کے ساتھ نہیں پہنچا مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ زمانہ جنگ و جدال

حضرت علیؓ کا ایک اور قول بھی ہمارے دعویٰ کی تائید کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا تَجَهَّزُوا لِقِتَالِ الْمَارِقِينَ الْمُخْتَلِينَ جس کے معنی نہایہ لابن اثیر جلد 3 صفحہ 190 میں یہ لکھے ہیں کہ ایسے لوگوں کے قتال کی تیاری کرو جو احکام دین کی حدود اور اطاعت امام سے نکل گئے ہیں اور جنہوں نے امام کے خلاف بغاوت اور سرکشی کی ہے۔ نیز دیکھو لسان العرب لفظ غلام۔

اور سیاسی بے چینی کا زمانہ تھا اور جیسا کہ تاریخ ثابت کر رہی ہے کہ اس زمانہ میں ارتداد کے معنی صرف ارتداد نہ تھے مگر اس زمانہ کے مرتد سب حربی مرتد ہوتے تھے جو اسلام کے سیاسی دشمن بن جاتے تھے اور اسلام کو ان سے اسی طرح کا خطرہ ہوتا جس طرح دوسرے دشمنوں سے۔ اب میں خدا تعالیٰ کے فضل و رحم سے صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین کے عہد کے حالات سے بھی فارغ ہو گیا۔ اور ناظرین نے دیکھ لیا کہ خلفائے راشدین نے مرتدین سے اُن کے ارتداد کی وجہ سے قتال نہیں کیا اور نہ کسی مرتد کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل کیا بلکہ اُن کا قتال بغاوت کو روکنے اور فتنہ و فساد کو دُور کرنے اور اسلام اور اہل اسلام کی حفاظت کے لئے تھا۔

اس حصہ مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور روایت پر بھی نظر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو قتل مرتد کے حامیوں نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن کی طرف بھیجا اور ہر ایک کے لئے الگ الگ علاقہ مقرر فرما دیا۔ اور اُن کو چلتے وقت یہ نصیحت فرمائی ”یسرا ولا تعسرا و بشرا ولا تنفرا“ یعنی تم دونوں کا فرض ہے کہ تم لوگوں کو آسانی دو اور تنگی نہ دو۔ اور لوگوں کو بشارت دو اور دین کی طرف محبت سے راغب کرو اور لوگوں کے دل میں دین سے نفرت پیدا نہ کرو۔ دونوں اپنے اپنے علاقہ میں پھرتے تھے اور جب اُن میں سے ایک اپنے دورہ میں دوسرے کے قریب جاتا تو اُس سے ملاقات کرتا۔ ایک دن جب حضرت معاذؓ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے ملنے کے لئے آئے تو وہاں ایک شخص دیکھا جس کو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے باندھ کر اپنے پاس بٹھایا ہوا تھا۔ حضرت معاذؓ نے دریافت کیا یہ شخص کون ہے۔ جواب دیا گیا کہ یہودی تھا۔ پہلے مسلمان ہوا تھا پھر مرتد ہو گیا۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ میں اپنی سواری سے نہیں اتروں گا جب تک تم اس کو قتل نہ کرو اور فرمایا کہ یہی خدا تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے (قضاء اللہ و رسوله)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اُسی قسم کا قتل ہے جس طرح حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مرتدین کو قتل کیا گیا اور اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ اس شخص کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ کسی شخص کو صرف دو صورتوں میں قتل کرنا جائز ہے تیسری کوئی صورت نہیں۔ اول قصاص میں۔ دوم فسادی الارض میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ

النَّاسَ جَمِيعًا (المائدة: 33)

جو کسی شخص کو بغیر اس کے کہ اس نے قتل کیا ہو یا ملک میں فساد پھیلایا ہو قتل کر دے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا۔

فسادی الارض کی ایک صورت آیت مذکورہ بالا سے اگلی آیت میں بیان فرمائی گئی ہے جو یہ ہے:-

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (المائدة: 34)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور فساد کی غرض سے ملک میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں ان کی مناسب سزا یہی ہے کہ ان میں سے ایک ایک کو قتل کیا جائے یا صلیب پر لٹکا کر مارا جائے یا ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مخالفت کی وجہ سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں ملک سے نکال دیا جائے۔

پس حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق قتل کروایا جاتا ہے ظاہر کرتا ہے کہ اُس کے قتل کی وجہ فسادی الارض یا محاربتھی محض ارتداد

اُس کی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ میں قرآن شریف کی آیات سے ثابت کر چکا ہوں کہ اسلام میں محض ارتداد کے لئے کوئی دنیوی سزا مقرر نہیں کی گئی اور کسی کو محض ارتداد کے لئے قتل کرنا قرآن شریف کی صریح تعلیم کے خلاف ہے۔

دوم۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ اس شخص کا قتل کرنا نہ صرف قرآن شریف بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بھی مطابق ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص کو محض ارتداد کے لئے قتل نہیں کیا گیا کیونکہ جیسا میں ثابت کر چکا ہوں اس امر کے متعلق جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق حسب اصول فقہاء و محدثین کی نظر جاتی ہے تو اُس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اُسی مرتد کے قتل کا حکم ہے جو محارب ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی کے مطابق تھا کیونکہ آپ نے کبھی کسی مرتد کو محض ارتداد کے لئے قتل نہیں کروایا بلکہ اُنہی کو قتل کروایا جو محارب تھے۔ اور اُن میں سے بھی بعض کو بعض معزز صحابہؓ کی سفارش پر معاف فرما دیا جو صریح ثبوت اس امر کا ہے کہ ارتداد کے لئے قتل شرعی حد نہیں ہے اور نیز ثابت ہے کہ بعض مرتدین کو آپ نے باوجود قدرت کے قتل نہیں کروایا۔ پس سنت نبوی سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ محض ارتداد کے لئے قتل کی سزا شریعت نے مقرر نہیں کی اور یہ کہ جن مرتدین کو قتل کیا گیا اُن کو ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ محاربہ کی وجہ سے قتل کیا گیا اور یہی قرآن شریف کی تعلیم ہے۔ پس حضرت معاذؓ کا یہ فرمانا کہ اس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق قتل کیا جاتا ہے یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کو حربی ہونے کی وجہ سے قتل کیا گیا۔

سوم۔ یمن کے اُس وقت کے حالات بھی اسی امر کی تائید کرتے ہیں کہ اس کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا کیونکہ ہر ایک تاریخ دان اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ جو ارتداد بقیہ ملک عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر واقع ہوا وہ ملک یمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہی دنوں میں پیدا ہو گیا تھا جبکہ حضرت معاذؓ یمن

میں متعین تھے اور یہ فتنہ اسود عنسی کی وجہ سے ہوا جس کی مختصر کیفیت میں اُوپر بیان کر چکا ہوں۔ پس یہ سیاسی رنگ کا ارتداد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے وقت میں ملک یمن میں واقع ہو چکا تھا اور اسود عنسی کے قتل کے بعد بھی اس کی انگاریاں بالکل نہیں سمجھی تھیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ معاً وہی آگ پھر شعلہ زن ہوئی۔ پس یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ حضرت معاذؓ کی موجودگی میں یمن میں اسی رنگ کا فتنہ نہایت خطرناک طور پر نمودار ہو گیا تھا۔ پس ایسے زمانہ میں جبکہ مرتدین یمن میں اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کے لئے کھڑے ہو گئے تھے اگر حضرت معاذؓ نے ایک مرتد کو قتل کرنے کا حکم دیا تو اس سے اسی نتیجہ کی تائید ہوتی ہے کہ وہ مرتد حربی تھا۔ اور ایسے حالات کے ماتحت اس واقعہ سے کوئی شخص قطعاً اور یقینی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔

چہارم۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اسی راوی کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسے الفاظ نقل کروائے ہیں جو اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ حضرت معاذؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے محض ارتداد کی وجہ سے اُس شخص کو قتل نہیں کیا کیونکہ اسی حدیث میں لکھا ہے کہ رخصت کرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو اصولی رنگ میں یہ نصیحت فرمائی تھی ”یَسِّرَا وَلَا تَعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تَنْفِرَا“ یعنی دین کے معاملہ میں تم لوگوں کو آسانی اور سہولت دو۔ اُن پر تنگی نہ ڈالو اور لوگوں کو بشارت اور خوشخبری دو اور ایسا طریق اختیار کرو جس سے لوگ اسلام کی طرف رغبت کریں اور لوگوں کو اسلام سے متنفر نہ کرو۔

اس وصیت مقدسہ میں صاف یہ تعلیم دی گئی کہ دین کے معاملہ میں جبر سے کام نہ لینا۔ کیونکہ جبر کا استعمال اس وصیت کے بالکل مخالف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابیوں کو رخصت کرتے وقت فرمائی۔ اور حامیان قتل مرتد اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ قتل مرتد ایک جبر کا طریق ہے اس طریق کا استعمال اُس وصیت کے خلاف تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو رخصت کرتے وقت فرمائی اور ہم ایک آن کے لئے بھی یہ

ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ان جلیل القدر صحابیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو پس پشت ڈال دیا۔ اگر ایک شخص کو اس لئے قتل کیا جائے کہ اُس نے اسلام کو کیوں ترک کیا تو اس سے نہ صرف ایسے شخص کے دل میں نفرت پیدا ہوگی جس نے اسلام کو ترک کیا بلکہ اس سے دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی نفرت پیدا ہوگی اور کوئی شخص بھی ایسے مذہب کو پسند نہیں کرے گا جس کے ترک کرنے کی سزا قتل ہو۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت ایک طرف تو اس عقیدہ کی تردید کر رہی ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے اور اگر اس وصیت کے کچھ معنی ہیں تو پھر اسلام میں ارتداد کی سزا قتل نہیں ہو سکتی۔ اور دوسری طرف یہی وصیت یہ بھی ثابت کر رہی ہے کہ وہ صحابی اس وصیت کی موجودگی میں کسی شخص کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ایسا کرنا اُس وصیت کی صریح خلاف ورزی ہے۔ پس اس حدیث میں اس وصیت کا موجود ہونا یہ ثابت کر رہا ہے کہ اُس شخص کو محض ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا بلکہ اُس فتنہ کی وجہ سے قتل کیا گیا جو اُس زمانہ میں ملک یمن میں پیدا ہو گیا تھا۔

پنجم۔ اگر مولوی صاحبان کو ان سب باتوں سے انکار ہو اور ان کو اسی بات پر اصرار ہو کہ اُس شخص کو حضرت معاذؓ نے محض ارتداد کے لئے قتل کیا تو ایسی صورت میں اُن سے کہوں گا کہ اچھا میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ حضرت معاذؓ نے ایسا ہی کیا مگر مجھے بتاؤ کہ ایسی صورت میں تمہارے دو اہل حدیث و فقہ کیا فتویٰ دیتے ہیں۔ کیا شریعت اسلام میں یہ ایک مسلم اور متفقہ مسئلہ ہے کہ ایک صحابی کا فعل حجت شرعیہ سمجھی جاتی ہے۔ کیا تم مجھے دکھا سکتے ہو کہ اہل اسلام میں متفقہ اور متحدہ طور پر یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک صحابی کا ہر ایک فعل ایک حجت شرعی ہے۔ کیا آپ لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ اہل حدیث کے نزدیک صحابی کا قول و فعل حجت شرعیہ نہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ صحابی کے قول و فعل کو ہر گز حجت نہیں سمجھتے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اہل فقہ حنفیہ صرف ایسے امور میں فعل صحابی کی

پیروی کرتے ہیں جنہیں قیاس کا دخل نہ ہو اور اگر وہ امر اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے تو پھر صحابی کی تقلید ضروری نہیں سمجھتے۔ اور یہ دونوں صحابی وہ ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت کرتے وقت ہدایت دی تھی کہ اگر کوئی بات تم قرآن و سنت میں نہ پاؤ تو اجتہاد کر لینا۔ اس ہدایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس موقع پر اجتہاد سے کام لیا ہے اور اجتہادی امور میں مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی کسی صحابی کے قول یا فعل کو حجت نہیں سمجھتا۔ نیز یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو یہ نہیں فرمایا کہ جو بات قرآن میں نہ ہو اُس کے متعلق اجتہاد کر لینا بلکہ فرمایا کہ جو بات تم قرآن میں نہ پاؤ اُس کے بارے میں تم اجتہاد سے کام لینا یہ الفاظ بھی پُر حکمت ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک بات معاذؓ اور ابو موسیٰؓ کو قرآن شریف میں نہ ملتی تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اُس کے متعلق قرآن شریف میں کوئی ہدایت موجود ہی نہ تھی۔ پس اس صورت میں اگر بالفرض مان بھی لیا جائے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے محض ارتداد کی وجہ سے ایک مرتد کو قتل کر دیا تو اُن کے اس فعل کی وجہ سے آپ کے ہی دواوین فقہ و حدیث ہم کو پابند نہیں کرتے کہ ہم یہ مان لیں کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔

خصوصاً جب ایسا حکم قرآن شریف کی صریح تعلیم کے خلاف ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے اور نیز اُس وصیت کے خلاف ہے جو آنحضرت

۱۔ حامیان قتل مرتد نے ایک روایت یہ بھی پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو فرمایا کہ ایک مرتد مرد و عورت کو قتل کر دینا۔ اس کے متعلق حاشیہ ہدایہ مولوی محمد سنبلی جلد 2 صفحہ 353 میں لکھا ہے ’سندہ لیس بقوی فی رجالہ کلام‘، یعنی اس روایت کی سند قوی نہیں اس کے راوی محل اعتراض ہیں علاوہ ازیں یہ حدیث صحیح حدیثوں کے مخالف ہے جن میں عورت کو قتل کرنے کی صریح مخالفت موجود ہے۔ اور فقہائے حنفیہ کا عمل بھی اس روایت کے خلاف ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو رخصت کرتے وقت فرمائی۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہیں گے کہ انہوں نے اجتہاد سے کام لیا اور اجتہادی امور میں تمام فرقہ ہائے اسلام کے نزدیک تقلید صحابی واجب نہیں۔



قتل مُرد اور فقہ

قرآن شریف اور حدیث اور سُنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اسلام میں محض ارتداد کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ضرورت نہ تھی کہ کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جاوے۔ لیکن حامیان قتل مُرد کے اس دعویٰ کو توڑنے کے لئے کتب فقہ اُن کے ساتھ ہیں یہ نامناسب نہ ہوگا کہ کتب فقہ کی طرف بھی توجہ کی جائے تا معلوم ہو سکے کہ یہ کتابیں اُن کو کہاں تک پناہ دے سکتی ہیں۔ پس اس غرض سے جب میں کتب فقہ کی طرف رجوع کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوتی ہے کہ فقہاء میں سے فرقہ احناف اس اصول میں بالکل ہمارے ساتھ متفق ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے۔ بلکہ مُرد کے قتل کرنے کی اصل وجہ اُس کا حربی ہونا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے:-

(۱) سب سے پہلے میں فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کو لیتا ہوں۔ اُس میں مُردہ عورتوں کے متعلق بحث کرتے ہوئے صاحب ہدایہ لکھتا ہے:-

ولنا ان النبی علیہ السلام نہی عن قتل النساء ولا ن الاصل تاخیر
 الأجزیة الی دار الأخرۃ اذ تعجیلها یخل بمعنی الابتلاء وانما عدل
 عنه لدفع شر ناجز و هو الحراب ولا یتوجّه ذلّت من النساء لعدم
 صلاحیة البنیة بخلاف الرجال .

یعنی مُردہ عورت کے قتل کرنے کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اور دوسرے یہ کہ سزا دینے سے متعلق اصل یہ ہے کہ اس کو آخرت پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس دنیا میں سزا دینا ابتلاء کی حقیقت کو توڑنا ہے اور اگر اس قاعدہ سے عدول کیا جاتا

ہے تو وہ صرف پیدا ہونے والی شر کو روکنے کی غرض ہوتا ہے اور وہ شر حراب یعنی لڑائی ہے۔ اور چونکہ عورتوں میں اپنی پیدائش کی وجہ سے جنگ کی قابلیت نہیں ہوتی۔ اس لئے اُن کو قتل نہیں کیا جاتا۔

(۲) ہدایہ کے بعد میں فتح القدر کی شہادت کو پیش کرتا ہوں۔ دیکھو فتح القدر کا مصنف کیسی صفائی سے اس مضمون پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

يجب فى القتل بالردة ان يكون لدفع شرِّ حرابه لا جزاءً على فعل الكفر لان جزاءه اعظم من ذلك عند الله تعالى فيختص بمن يتأتى منه الحراب وهو الرجل ولهذا نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن قتل النساء وعلله بانها لم تكن تقاتل على ما صح من الحديث فيما تقدم. (فتح القدر جلد 4 صفحہ 389)

یعنی مرتد کو قتل کرنے میں یہ واجب ہے کہ وہ اُس کے حراب یعنی جنگ کی شر کو دور کرنے کے لئے ہو۔ نہ کہ اُس کو کفر اختیار کرنے کی سزا ہو۔ کیونکہ کفر کی سزا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ پس قتل اسی شخص کے ساتھ خاص ہے جس سے حراب سرزد ہو اور وہ مرد ہی ہو سکتے ہیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے اور اس کو بُرا قرار دیا ہے کیونکہ عورتیں جنگ نہیں کیا کرتی تھیں۔

(۳) پھر چلی میں لکھا ہے:-

قال ابن الهمام لا جزاء على فعل الكفر فان جزاءه اعظم عند الله من ذلك. (چلی بر حاشیہ فتح القدر صفحہ 388)

یعنی کفر اختیار کرنے کی وجہ سے کسی کو سزا نہیں دی جاتی ہے۔ کیونکہ کفر کی سزا قتل سے بڑھ کر ہے اور وہ خدا تعالیٰ خود ہی دے سکتا ہے۔

(۴) پھر عنائے میں صفحہ 390 پر لکھا ہے:-

لاقتل الا باحراب فكان القتل مستلزم للحراب لان نفس الكفر

ليس يهيج له ولهذا لا يقتل الأعمى والمعقد والشيخ الفانى .

یعنی حراب کے بغیر کوئی قتل نہیں۔ پس قتل حراب کے لئے مستلزم ہے کیونکہ تنہا کفر کی وجہ سے کسی کو قتل کرنا جائز نہیں اور یہی وجہ ہے کہ نابینا اور شیخ فانی اور معذور کو قتل نہیں کیا جاتا۔

(۵) اب دیکھئے کہ اُس حدیث کے اہل فقہ حنفیہ نے کیا معنی کئے ہیں جس کو آج

قتل مرتد کے دعویدار بڑے زور شور سے پیش کر رہے ہیں۔ یعنی یہ حدیث ”من بدل دینہ فاقتلوه“ فتح القدیر جلد 2 صفحہ 580 میں لکھا ہے:- ”كذا قوله ﷺ من بدل دینہ

فاقتلوه لانه كافر حربى بلغته الدعوة فيقتل للحال من غير التمهال“ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے جو شخص اپنے دین کو بدل دے اُس کو قتل کر دو۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ حربی کافر ہے اور اُس پر اتمام حجت ہو چکا ہے پس ایسے شخص کو فوراً قتل کر دینا چاہئے۔ اور مہلت نہیں دینی چاہئے۔ دیکھو اس حدیث میں بھی فقہاء حنفیہ کے نزدیک ایسا ہی مرتد مراد ہے جو حربی ہو اور اُس کے قتل کی وجہ اُس کا ارتداد نہیں بلکہ اُس کا حربی ہونا ہے۔

میرے خیال میں مندرجہ بالا حوالجات سے صاف ظاہر ہے کہ فقہ حنفیہ کے ائمہ اس اصول میں کلیتاً ہمارے ساتھ متفق ہیں کہ محض ارتداد کی سزا قتل نہیں اور کسی مرتد کو اس لئے قتل کرنا جائز نہیں کہ اُس نے ارتداد اختیار کیا ہے بلکہ قتل کی وجہ اُس کا محارب ہونا ہے۔ اور یہی ہمارا اصول ہے جس کو میں نے اس مضمون میں بفضلہ قرآن شریف اور سنت رسول اور سنت خلفاء راشدین کے ذریعہ ثابت کیا ہے۔

اس جگہ قتل مرتد کے دعویدار یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اصول صرف حنفیوں کے نزدیک

مسلم ہے۔ دوسرے فرقوں کے فقہاء اس کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اُن کے نزدیک محض ارتداد ہی موجب قتل ہے۔ اسی لئے اُن کا یہ فتویٰ ہے کہ اگر مرتد پیر فرتوت ہو جس میں قتال تو کجا چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ ہو اُس کو بھی قتل کر دو۔ اسی طرح اگر کوئی بڑھیا عورت ہے جو کسی تنفس کو گزند نہیں پہنچاتی اور بد قسمتی سے ارتداد اختیار کرتی ہے تو اُس بڑھیا کو بھی قتل کر دو۔ اگر کوئی نابینا لنگڑا لولا ہے یا بیمار اور ضعیف ہے مثلاً اسل کی مرض میں مبتلا ہے اور چند دن کا مہمان ہے اور شیطانی انغواء سے اسلام سے مرتد ہو کر کوئی اور دین اختیار کرتا ہے تو ایسے شخص کی گردن پر بھی تلوار چلا دو۔

غرض اُن کے نزدیک محارب ہونا کوئی شرط نہیں صرف ارتداد ہی ایسا جرم ہے جس کے لئے قتل کی حد شرعی مقرر ہے عورت ہو، مرد ہو، بوڑھا ہو، جوان ہو، بیمار ہو، تندرست ہو اگر ارتداد اختیار کرے گا تو اس کو فی الفور قتل کر دینا چاہئے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ عقیدہ بے شک اُس اصول کے خلاف ہے جو ائمہ احناف نے بیان کیا ہے اور دونوں عقیدوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک گروہ محض ارتداد ہی کو موجب قتل ٹھہراتا ہے۔ دوسرا گروہ محض ارتداد کو قتل کا موجب نہیں ٹھہراتا بلکہ حراب کو اصل موجب قتل قرار دیتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں عقیدے درست نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں گروہوں میں سے صرف ایک ہی گروہ حق پر ہو سکتا ہے اور ہمارے نزدیک فرقہ حنفیہ اپنے اس اصول میں جس کو میں اوپر کتب فقہ کے الفاظ میں نقل کر چکا ہوں حق پر ہے۔ کیونکہ ان کا یہ اصول قرآن شریف کی تعلیم کے عین مطابق ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کے بالکل موافق ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم دونوں فریق کو حق پر خیال کریں آخر ایک کو ہی حق پر خیال کیا جائے گا۔ پس ہمارے نزدیک وہی اصل درست اور صحیح ہے جو ائمہ فقہ حنفیہ نے بیان کیا ہے اور جس کو میں انہی کے الفاظ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

دوسرے گروہ کا اصول کہ محض ارتداد ہی اصل موجب قتل ہے نہایت ہی غلط اصول ہے جس کی نہ قرآن شریف تائید کرتا ہے اور نہ سنت رسول ﷺ۔ پس ہم ایسے اصول کو جو اسلام کے روشن نام پر ایک دھبہ ہے کسی صورت میں قبول نہیں کر سکتے۔ جب قرآن شریف کی صریح تعلیم ایسے اصول کے خلاف ہے تو ہم قرآن شریف کی تعلیم کو کس طرح ترک کر سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر فقہ حنفیہ کے ائمہ بھی اس کے خلاف کوئی اصول قائم کرتے یا اگر حنفیوں کا طرز عمل ان کے بیان کردہ اصول کے خلاف ہو تو ہم حق کے کھل جانے پر حنفیوں کو بھی چھوڑ سکتے ہیں کیونکہ ہمارا ایمان تو خدا اور اس کے رسول پر ہے نہ کسی اور پر۔

پھر حامیانِ قتل مرتد فرماتے ہیں کہ قتل مرتد پر تمام امت کا اتفاق ہے امت کا اجماع ہو چکا ہے کسی ایک شخص نے بھی اس کے خلاف نہیں کہا۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا یہ دعویٰ سراسر غلط ہے کیونکہ اس اصول میں کہ اسلام میں محض ارتداد کے لئے کوئی دنیوی سزا مقرر نہیں کی گئی۔ ائمہ فقہ حنفیہ کا ہمارے ساتھ اتفاق ہے اور انہوں نے اس اصل کو تسلیم کیا ہے کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں بلکہ قتل کی سزا محارب ہونے کی وجہ سے دی جاتی ہے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ایک شخص واحد نے بھی قتل مرتد سے اختلاف نہیں کیا۔ کیونکہ مسلمانوں میں بعض ایسے محقق گزرے ہیں جنہوں نے اس عقیدہ سے کھلے طور پر اختلاف کیا ہے اور ان کی رائے ہے کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے بلکہ ان کو توبہ کی مہلت دی جائے یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے اپنی طبعی موت سے گزر جائیں۔ حافظ ابن قیم کا قول خود مولوی شبیر احمد صاحب نے پیش کیا ہے اور وہ اس بات کے قائل نہیں کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے۔

اسی طرح میں تفسیر کے حوالجات سے اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ بعض ایسے علماء گزرے ہیں جو قتل مرتد کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح ابراہیم نخعی اور سفیان ثوری کا یہی مذہب ہے اور یہ لوگ کوئی چھوٹے پایہ کے انسان نہیں چنانچہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ

کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ حدیث میں امیر المؤمنین ہیں دیکھو صاحب تہذیب التہذیب ان کی نسبت کیا لکھتے ہیں:-

قال شعبة وابن عتبة و ابو عاصم بن معین و غیر و احد من العلماء سفیان امیر المؤمنین فی الحدیث و قال ابن المبارک کتبت عن الف و مائة شیخ ما کتبت عن افضل من سفیان و قال و کعب عن سعید سفیان أحفظ منی . و قال ابن مہدی کان و ہب یقدم سفیان فی الحفظ علی مالک و قال یحیی القطان لیس احد احب الی من شعبة و لا یعدله احد عندی و اذا خالفه سفیان اخذت بقول سفیان و قال ابو داؤد بلغنی عن ابن معین قال ما خالف احد سفیان فی شیء الا کان القول قول سفیان قال النسائی هو اجل من ان یقال فیہ ثقة و هو احد الائمة الذین ارجوا ان ینکون اللہ ممّن جعله للمتّقین اماما . قال ابن حبان کان من سادات الناس فقها و ورعا و اتقانا .

(تہذیب التہذیب جلد 4 صفحہ 114)

یعنی شعبہ اور ابن عتبہ اور ابو عاصم بن معین اور ان کے سوا اور کئی علماء نے کہا ہے کہ سفیان حدیث میں امیر المؤمنین ہے اور ابن مالک نے کہا کہ میں نے ایک ہزار ایک سو شیخ سے احادیث سن کر لکھی ہیں اور ان میں ایک بھی سفیان سے بہتر نہ تھا اور کعب روایت کرتے ہیں کہ سعید نے کہا کہ سفیان میری نسبت احادیث کو زیادہ یاد رکھنے والا ہے اور ابن مہدی نے کہا کہ وہب احادیث کے یاد رکھنے میں سفیان کو مالک پر مقدم کیا کرتا تھا اور تکی القطان کہتا ہے کہ کوئی شخص مجھے شعبہ سے زیادہ پیارا نہیں اور میرے نزدیک کوئی بھی اس کے برابر نہیں لیکن اگر سفیان کا قول شعبہ کے خلاف ہو تو میں شعبہ کے مقابل میں سفیان کے قول کو اختیار کروں گا۔ اور ابو داؤد کہتا ہے کہ مجھے ابن معین سے یہ روایت پہنچی ہے کہ اس نے کہا کہ جب بھی کسی کا قول سفیان کے قول کے خلاف ہو تو اصل قول وہی ہوتا

ہے جو سفیان کا قول ہوتا ہے۔ نسائی کہتے ہیں کہ سفیان اس تعریف سے بھی بالاتر ہے کہ ان کی نسبت کہا جائے کہ اس میں ثقاہت اور پختگی پائی جاتی ہے اور وہ ان اماموں میں سے ایک امام ہے جن کی نسبت میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو متقیوں کا سردار بنایا ہے اور ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ تفقہ اور پرہیزگاری اور رائے کی مضبوطی میں سادات الناس میں سے ہے۔

یہ شان ہے اس شخص کی جس نے بعض دوسرے ائمہ کے علاوہ قتل مرتد کے مسئلہ کا انکار کیا ہے مگر مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ قتل مرتد کے فتویٰ میں کبھی کسی فرد واحد نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ اور ایسے حدیث کے امام کا قطعی انکار ظاہر کرتا ہے کہ حدیث میں کوئی نص قطعی قتل مرتد کے لیے موجود نہیں۔ اگر کوئی نص موجود ہوتی تو حدیث کا ایسا جلیل القدر عالم قتل مرتد کے مسئلہ کا کبھی صاف انکار نہ کرتا۔ اسی طرح ابراہیم نخعی بھی ایک بڑے پایہ کے فقیہ ہیں اور اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم مانے گئے ہیں۔

اب میں اس سوال کا جواب دے کر کہ زمانہ سلف کے بعض علماء قتل مرتد کے متعلق کیوں ایسی غلطی لگی کہ انہوں نے بلا کسی شرط کے مرتد کے قتل کا فتویٰ دیا؟ اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ غلط خیال اسی طرح پیدا ہوا جس طرح یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام ہر ایک مشرک اور بت پرست کو قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جس طرح بعض لوگوں نے قرآن شریف کی ایک آدھ آیت سے غلطی سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہر ایک مشرک اور بت پرست کو قتل کرنے کا حکم ہے اور اس کے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے اس کو سب مشرکوں پر حاوی سمجھ لیا گیا اور قرآن شریف کی قریباً چار صد آیات کو منسوخ قرار دیا۔ اسی طرح بعض علماء نے ایسی روایات سے دھوکہ کھایا جن میں مرتدین کے قتل کا ذکر تھا اور ان روایات کو ہر ایک مرتد پر حاوی سمجھ لیا اور اس امر کی طرف توجہ نہ کی کہ ان روایات میں ایسے

مرتدین کا ذکر ہے جو محارب ہوں اور یہ نہ دیکھا کہ بعض روایات میں محارب کی شرط موجود ہے۔ اس شرط کو نظر انداز کر دیا اور ایسا ہی زمانہ کے حالات کو بھی نظر انداز کیا کہ کن حالات میں یہ حکم دیا۔ اس بات کی طرف نہ دیکھا کہ اس زمانہ میں ایک شخص کا ارتداد محض ارتداد تک ہی محدود نہ رہتا تھا بلکہ مرتد ہوتے ہی وہ دشمنوں سے مل کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتا اور ایسا شخص دوسرے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہوتا تھا کیونکہ یہ مسلمانوں کے حالات سے واقف ہوتا۔

اسی طرح انہوں نے پڑھا کہ فلاں مرتد کو قتل کیا گیا مگر اس پر غور نہ کیا کہ کیوں قتل کیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے عہد میں مرتدین کی گردنوں پر تلوار چلتی دیکھی مگر یہ نہ دیکھا کہ یہ تلوار کیوں چلائی گئی۔ غرض صرف حکم دیکھ لیا اور تمام دوسرے حالات کو نظر انداز کر دیا۔ نہ ان جرموں کو دیکھا جو ان مرتدین سے سرزد ہوئے نہ ان ملکی ضرورتوں اور سیاسی مجبوریوں پر غور کیا جن کی وجہ سے خلفاء راشدین ارتداد کرنے والوں کے خلاف تلوار کھینچنے پر مجبور ہوئے اور ان تمام واقعات سے غلطی سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہر ایک مرتد کی سزا قتل ہے۔ مگر یہ خوشی کا مقام ہے کہ اگر بعض علماء نے قتل کو ارتداد کی سزا قرار دیا تو بعض علماء نے اس بات کے قبول کرنے سے انکار کیا کہ ارتداد کی سزا قتل ہے اور صاف الفاظ میں لکھ دیا کہ ارتداد اور کفر کے لئے شریعت اسلام نے کوئی سزا مقرر نہیں کی بلکہ اس کو عالم آخرت کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اس عالم میں مرتد کو صرف حراب اور فساد فی الارض کی وجہ سے قتل کیا جاتا ہے نہ ارتداد کی وجہ سے۔

اب میں ناظرین کے انصاف پر فیصلہ چھوڑتا ہوں کہ وہ ایک طرف تمام قرآن شریف کی تعلیم اور اسلامی تعلیم کی روح اور آنحضرت ﷺ کے اعلیٰ اخلاق اور آپ کی تعلیم کو رکھیں۔ نیز اسلامی تاریخ کے واقعات پر نظر کریں اور دوسری طرف ان علماء کے فتوؤں کو دیکھیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے خواہ شیخ فانی ہو جو چلنے پھرنے کی بھی طاقت

نہ رکھتا ہو یا لنگڑا اور اپاہج ہو یا بیمار ہو جو بوجہ بیماری اپنی چارپائی سے اٹھنے کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو یا ایک بے ضرر بڑھیا عورت ہو ان سب کو بے دریغ قتل کرو۔ اب آپ ہی فیصلہ فرمادیں کہ آیا یہ فتویٰ اسلام کے نام کو روشن کرنے والا ہے یا اس کو بدنام کرنے والا ہے۔ دو رائیں ہمارے سامنے ہیں ایک یہ کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہے ارتداد کرنے والا کوئی ہو اس کو قتل کیا جائے۔ حراب کی کوئی شرط نہیں اور مرتد کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ دوبارہ اسلام کو قبول کرے ورنہ اس کو قتل کر دینا چاہیے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے بلکہ قتل کیلئے حراب اور فساد فی الارض کی شرط ہے۔ ارتداد یا کفر کی سزا دینا کسی حکومت کا کام نہیں یہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس لئے اس کو آخرت پر چھوڑنا چاہیے اور دین میں جبر جائز نہیں۔ اب میں اس امر کا فیصلہ کہ ان دو راؤں میں سے کون سی رائے اسلام کی تعلیم کے موافق ہے اور کون سی مخالف ناظرین پر چھوڑتا ہوں وہ فیصلہ کر لیں کہ ان دونوں راؤں میں سے کونسی وہ رائے جو اسلام کی تعلیم اور اس کی روح کے مطابق ہے اور کونسی وہ رائے ہے جو نہ صرف اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے بلکہ اسلام کو بدنام کرنے والی اور اس کے روشن چہرہ پر ایک بد نما داغ ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک شخص جو انصاف کے ساتھ بغیر کسی تعصب کے اپنی رائے کا اظہار کرے گا وہ یقیناً یہی فیصلہ کرے گا کہ وہی رائے اسلامی تعلیم کے مطابق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے موافق ہے جس کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ ارتداد اور کفر کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو محض ارتداد کو قتل کا موجب قرار دیتے ہیں اور جن کی یہ رائے ہے کہ ہر ایک مرتد کو قتل کر دینا چاہیے خواہ وہ بڑھیا عورت ہو یا لنگڑا اور اپاہج ہو یا بیمار ہو کیونکہ یہ تعلیم اسلام کی تعلیم اور آنحضرت ﷺ کے اسوۂ مبارکہ کے بالکل مخالف ہے۔

آخر میں میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے سینوں کو اسلام کی تعلیم کے سمجھنے کے لئے کھول دے اور ہمیں حقیقی اور سچے اسلام کی اتباع اور تبلیغ کی توفیق بخشے اور

ہمارے بھولے ہوئے بھائیوں کی آنکھوں کو کھولے تا وہ دیکھیں کہ وہ کیا ہی غلط راستہ ہے جس کو انہوں نے اختیار کیا ہوا ہے۔ ان کو توفیق بخشے کہ وہ اسلام کو بدنام کرنے والے خیالات اور اعمال سے تائب ہو کر حق کو قبول کریں۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم .

خاکسار شیر علی عنہ

از قادیان

9 جمادی الاولیٰ 1344 ہجری مطابق 26 نومبر 1925ء

علی صاحبہ التحیة والسلام

